''چہارسُو''

مبین مرزا کا سن دیکھتا ہوں اور پھر اس کی شاعری پڑھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ اس عمر میں قدرت کی طرف سے فکر کی یہ تگ وتاز اور خامیوں سے مبرّا کلام کی نعمت اسے کیسے ودیعت ہوئی ہے؟ درد اور کرب تو ہمارے معاشرے اور ہمارے عصر کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہا ہے، چناں چہ اس سے تو مفر نہیں، مگر مبین مرزا نے اس درد و کرب میں اپنی ذات کے حسن اور مادّی اور روحانی خوب صورتیوں کی طلب کی شدّت کو جس سلیقے سے آمیخت کیا ہے، وہ اس کے فنی مستقبل کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔

......احمد ندیم قاسمی

مبین مرزا کے زیرِ نظر مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی شعری تخلیقات میں وہی موضوعات نظر آتے ہیں جو اس عہد کی دین ہیں اور جنہیں ہر حساس اور باضمیر انسان اپنے بطون ذات کا حصہ سمجھتا ہے۔ ان میں رومانیت سے لے کر اپنے عہد کے مقامی اور عالمی مسائل بھی موجود ہیں اور انسان اور کائنات سے متعلق بعض بنیادی سوالات کا عکس بھی ان میں نمایاں ہے۔ اس آگہی میں زندگی کے تجربات، گرد و پیش کے مشاہدات اور مطالعات کی وسعت بھی شامل ہے۔

ہر تخلیقی انسان کی زندگی خواب اور حقیقت کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ الفاظ کے جتنے بھی تصویری پیکر بنتے ہیں وہ اسی تناظر میں اُبھرتے ہیں۔ مبین مرزا کی مجموعی شاعری ایک خاص تاثر مرتب کرتی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اپنے عہد کی عکاس ہیں۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مبین مرزا نے غزل اور نظم کے پیرایے میں زندگی کی کیسی لطیف اور نازک حقیقتوں کو تخلیقی گرفت میں لیا ہے۔ مبین مرزا شاعری کے رموز سے واقف ہیں اور انہوں نے اپنے اس شعری مجموعے میں اسے سلیقے اور ہنر مندی سے برتا ہے۔ مبین مرزا کی شاعری کی یہ کتاب تازہ کاری کی ایک عمدہ مثال ہے اور تخلیق کے کئی انوکھے زاویے رکھتی ہے۔

......پروفیسر سحر انصاری

○

بجھائے کس نے یہ شام و سحر کہہ بھی نہیں سکتا
اکارت کیوں ہوئے میرے ہنر کہہ بھی نہیں سکتا

بہت نازاں میں جس پر تھا وہی فصلِ بہار آخر
ہوئی کیسے پھر اک دن بے ثمر کہہ بھی نہیں سکتا

بلایا تھا مجھے کن رونقوں نے آسمانوں سے
گنوا آیا کہاں میں بال و پر کہہ بھی نہیں سکتا

کہ تُو محوِ خود آرائی ہے مجھ پر زنگ آتا ہے
میں اب یہ بات میرے شیشہ گر کہہ بھی نہیں سکتا

زوال آمادگی کو آج ہنس کر دیکھنے والو!
ابھی کل تک میں تھا کس اوج پر کہہ بھی نہیں سکتا

وہی اک مسئلہ جس کی خلش سے جاں بہ لب ہوں میں
اِدھر کہہ بھی نہیں سکتا، اُدھر کہہ بھی نہیں سکتا

خبر ہے مار ڈالے گی مجھے آخر یہ خاموشی
میں کہنا چاہتا بھی ہوں مگر کہہ بھی نہیں سکتا

☆

(ہمارے عصر کے ممتاز شاعر، افسانہ نگار جناب مبین مرزا کے تازہ شعری مجموعے ''تابانی'' سے منتخب)

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۵،شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۱۶ء

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِمسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِسالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: 5462495,5490181-51-(92+)

فیکس: 5550886-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز
عبدالصمد
کے نام

سفر جاری ہے ابھی

محمد انعام الحق (راولپنڈی)

نام : عبدالصمد
والد کا نام : محمد شبلی (مرحوم)
پیدائش : ۱۸؍جولائی ۱۹۵۲ء، بہار شریف (نالندہ)
تعلیم : ایم۔اے، پی ایچ ڈی (سیاسیات)
پیشہ : درس وتدریس، اورینٹل، پٹنہ سٹی، ۱۹۷۹ء، تا حال

عہدے:

۱۔ پرنسپل راج نرائن کالج، حاجی پور (۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۸ء)
۲۔ چیئرمین اردو مشاورتی کمیٹی، حکومت بہار (۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۹ء)
۳۔ ادیبوں اور آرٹسٹوں کی امداد کے لیے گورنر بہار کی صدارت میں بنی اعلیٰ سطحی کمیٹی کے ممبر (۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۴ء)
۴۔ ممبر بورڈ آف ریونیو کی صدارت میں اردو ترجمہ اور اردو ٹائپسٹوں کی بحالی کی ذمہ دار اعلیٰ سطحی کمیٹی کے ممبر (۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۴ء)

تصانیف:

افسانے

۱۔ بارہ رنگوں والا کمرہ ۱۹۸۰ء
۲۔ پسِ دیوار ۱۹۸۳ء
۳۔ سیاہ کاغذ کی دھجیاں ۱۹۹۰ء
۴۔ میوزیکل چیئر ۱۹۹۶ء
۵۔ آگ کے اندر راکھ ۲۰۰۰ء
۶۔ بقلم خود ۲۰۰۶ء

ناول

۱۔ دوگز زمین ۱۹۸۸ء
۲۔ مہاتما ۱۹۹۲ء
۳۔ خوابوں کا سویرا ۱۹۹۴ء
۴۔ مہاساگر ۱۹۹۶ء
۵۔ دھمک ۲۰۰۴ء
۶۔ بکھرے اوراق ۲۰۱۰ء
۷۔ شکست کی آواز ۲۰۱۳ء
۸۔ اجالوں کی سیاہی ۲۰۱۵ء
۹۔ The Journey of a Burnig Boat ۲۰۱۱ء

خاکے

۱۔ دل میں رہے مقیم ۲۰۱۴ء
☆ سیاسیات سے متعلق دو کتابیں
☆ ترجمہ کی گئی دو کتابیں

انعامات:

۱۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ۱۹۹۰ء
۲۔ ساہتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ برائے ۱۹۹۸ء
۳۔ بہار اردو اکیڈمی کا پہلا انعام ۱۹۹۰ء
۴۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کا انعام ۱۹۹۰ء
۵۔ بہار اردو اکیڈمی کا انعام ۱۹۸۵ء
۶۔ بہار اردو اکیڈمی کا انعام ۱۹۸۱ء

وابستگی:

۱۔ ساہتیہ اکیڈمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینئر اور مجلسِ عامہ کے ممبر (۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۷ء)
۲۔ ممبر گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی (۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۶ء)
۳۔ اڈیٹوریل بورڈ ممبر ممتاز انگریزی رسالہ ''اُترا'' (۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء)
۴۔ ممبر سنڈیکیٹ وسنیٹ مگدھ یونیورسٹی (بودھ گیا) ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۲ء
۵۔ ممبر سنڈیکیٹ وسنیٹ بہار یونیورسٹی (مظفر پور) ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء
۶۔ ممبر اقلیتوں کی فلاح سے متعلق اعلیٰ سطحی پندرہ نکاتی پروگرام کمیٹی
۷۔ ممبر ہندی پرگتی کمیٹی بہار ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۹ء

دیگر:

۱۔ الماتی، قزاقستان میں ایک عالمی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی ۱۹۹۵ء
۲۔ ممتاز انگریزی اشاعتی ادارے میک ملن کے ذریعہ ناول ''خوابوں کا سویرا'' کی انگریزی میں اشاعت
۳۔ ساہتیہ اکادمی میں انعام یافتہ ناول ''دوگز زمین'' کی اکادمی کے ذریعہ ہندوستان کی اکیس زبانوں میں اشاعت۔ ہندی، انگریزی، پنجابی، بنگلہ، تلگو، اڑیہ ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔
۴۔ ''دوگز زمین'' پر سیریل کے لیے دوردرشن کی منظوری
۵۔ دوردرشن ممبئی کے ذریعہ کلاسیکی افسانوں پر مشتمل سیریل کے لیے افسانہ ''جانی انجانی راہوں کا مسافر'' کا انتخاب۔
۶۔ دوردرشن پٹنہ کا پہلا سیریل ''منزل'' ایک ناولٹ پر مبنی۔

ذاتی زندگی:

بیوی (ڈاکٹر) رخسانہ خاتون، پروفیسر، شعبہ اردو، ویشالی مہیلا کالج، حاجی پور۔
بچے: فہد یاور اور نیف اشعر، دہلی
پتہ: ۲۱۲۔اے، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ، ۸۰۰۰۱۰ (بہار)

’’وسعتِ بیاں‘‘

فاری شا

(راولپنڈی)

مکرمی عبدالصمد صاحب، تسلیم۔

ڈاک خانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آپ کا پہلا خط جو ۳۔اگست کا لکھا ہوا تھا، آپ کے جانے کے بعد ۱۴۔اگست کو مجھے ملا۔ خیریت سے پہنچنے کی اطلاع پرسوں ملی۔ آپ نے لکھا ہے کہ ۳۰۔اگست تک آپ اپنا کام نپٹا دینگے اور میرے لیے نوٹ روانہ کر دینگے۔ میں منتظر رہوں گا۔

سیکرٹری کو میں نے ۱۳۔اگست کی میٹنگ کی جو روداد بھیجی تھی وہ انہیں مل گئی۔ رسید آ گئی ہے۔ اب وہ تفصیلی نوٹ کے منتظر ہیں جو آپ کے اور بلراج کومل کے لوٹ کر جانے کے بعد ہی اپنے نوٹ کے ساتھ مربوط کر کے انہیں بھیج دونگا۔

میں نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ کیا ممبران اپنے T.A,D.A کے متعلق انہیں براہِ راست لکھ دیں۔ تو انہوں نے ہدایت کی ہے کہ سادہ کاغذ پر واقعی خرچ کا بل گیان پیٹھ بھیج دیا جائے۔ اعزازیہ ممبران کے لیے -/450 اس کے علاوہ ہوگا۔ ظاہر ہے جب ہمارا مفصل نوٹ اُن کو مل جائے گا تو بل کی ادائیگی ہوگی۔ آپ کا یہاں قیام تو بہت مختصر رہا۔ دل کی باتیں کہاں ہو سکیں۔ موسم بھی میرزا نا تھا۔ ابھی تک وہی کیفیت چل رہی ہے۔ شاید اکتوبر میں جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا تھا کہ آپ کا پھیرا ہو۔

خیریت اور معمولات سے باخبر رکھیں۔ آپ کا ناول پڑھ ڈالا مجھے تو پسند آیا۔ اب کوئی دوسرا ناول لکھ رہے ہیں یا نہیں؟

آل احمد سرور

مکرمی عبدالصمد صاحب، آداب۔

آپ کا خط اور تیسرا ناول مل گیا۔ شکریہ۔

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ جدید افسانہ کے چکر سے باہر نکل آئے۔ ناول نگاری آپ کو راس آ گئی ہے کیونکہ سماجی حقیقت نگاری کا طریقۂ کار آپ کے اپنے تجربات کے اظہار کے ذریعہ آپ کی مخفی صلاحیتوں کو بطریقۂ احسن باہر لا رہا ہے۔ ہر وہ فارم اچھا فارم ہے جو مصنف کی Aecthenticety کا ضامن ہو۔ جدید افسانہ کا فارم لکھنے والوں کی Phoney شخصیت کا نقاب بن گیا تھا۔

تین ناول ضرور پڑھونگا اور بقول آپ کے ممکن ہوا تو ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔

پروفیسر وارث علوی

برادرِ عزیز صمد صاحب، سلام ودعا۔

آپ کو خط لکھنے کو تھا کہ آپ کا خط ملا، میں ان دنوں یونی ورسٹی سے فیلوشپ پر ہوں۔ آپ گھر کے پتے پر لکھا کریں۔ باہر درج ہے۔ ناول کے لیے نوٹ نہ لکھا سکا، اس لیے کہ ابوظہبی اور پاکستان چلا گیا تھا۔ اب لوٹا ہوں فوراً پڑھ لیا۔ آپ سے ایسے ناول کی توقع بہتوں کو نہ ہوگی۔ بہت مبارک ہو۔ کیا اچھا ناول لکھا ہے آپ نے جس مسئلے کو لیا ہے اور اُس کی معنویت کو کرداروں کی کشمکش اور حالات کے جبر کے ذریعے جس طرح ابھارا ہے اور خود کو کہیں افراط وتفریط کا شکار نہیں ہونے دیا، یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ’’دوگز زمین‘‘ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ اس میں آپ نے جو مینار قائم کیا ہے اس کے آپ نیچے نہ آئیے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کا بطور اقلیت جو اب صرف ہندوستانی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک زبردست جنوب ایشیائی مسئلہ بھی ہے علاقائیت کی لہر بھی ہے۔ آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے ان تقاضوں کو نبھایا ہے۔ پھر مسئلے کی جو سنگینی ہے اس میں سفاکی اور دردناکی کی جو زیریں لہر ہے اور سیاست کس طرح پورے برصغیر میں اور سب سے بڑی جمہوریت میں قدروں کے زوال کا نوحہ پڑھتی چلی گئی ہے جبکہ خود اس کو اس المیے کا احساس تک نہیں، اس سب کشمکش کی روح ناول میں کھچ آئی ہے۔ لیکن مرکزی کردار صرف قبر کی دو گز زمین کے لیے زندہ نہیں۔ زمین اُن کے لیے اُن کی شناخت کا استعارہ ہے اور یہی مرکزی تھیم بھی ہے۔

مختصر یہ اس پر ریڈیو Discussion ہوگا۔ دوسروں کو متوجہ کر رہا ہوں۔ ایک کاپی بلراج کومل کو ضرور بھجوا دیں۔ وہ ہندی میں بھی لکھیں گے۔ میں ابھی اپنی Profect کی کتاب میں لگا ہوا ہوں، چار چھ ماہ بعد فرصت ہوگی اطمینان سے لکھوں گا، لکھوں گا ضرور۔

گوپی چند نارنگ

برادرم عبدالصمد، السلام علیکم۔

تمہارا افسانہ ملا۔ بہت ہی عمدہ افسانہ ہے۔ اردو میں اس مضمون اور موضوع پر افسانہ پہلے کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ بہت خوب، بہت خوب۔ زبان بھی پہلے سے بہتر ہے۔

تم نے 500 روپے بھیج کر شرمندہ کیا۔ تم لوگوں کی طرف سے قلمی اور لفظی تعاون بہت ہے۔ بہر حال شکر گزار ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تمہارا نام ’’محبانِ شب خون‘‘ میں ضرور چھاپوں لیکن اگر تمہیں سخت انکار ہے تو ’’پٹنہ سے ایک دوست‘‘ لکھ دوں گا۔

’’اترا‘‘ اور ساہتیہ اکادمی کا حال بس ایسا ہی ہے۔ خیر کیا کیا جائے۔ مہر انشاء ان دنوں امریکہ میں پڑھا رہی ہیں اس لیے وہ اس معاملے کو بھول سی گئی ہیں۔ پرچہ چھپ جائے تو اُن کو بھیج دوں گا۔ K.M George نے Modern Indian Literature: An anthology مرتب کی تھی۔ اس کا اردو

ایڈیٹر میں تھا۔اس کی دو جلدیں آہستہ آہستہ آئیں اور میں نے خرید لیں۔ان دنوں میں دہلی میں تھا۔تیسری اور آخری جلد گذشتہ سال آئی ہے ان لوگوں نے اطلاع تک نہ دی۔Editor اور Contributor کو وہ 50%یا 40% کمیشن دیتے ہیں۔میں لکھوں گا تو وہ حسب معمول جواب نہ دیں گے۔اگر تم کبھی دلی جاؤ تو ان سے اپنے سامنے جارج کی انتھالوجی کی جلد سوم بل کے ساتھ مجھے بھجوا دو۔شاید 500 روپے کی ہے۔اگر وہ پیشگی رقم چاہیں تو دے دینا میں تمہیں فوراً بھیج دوں گا۔اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

بہت عزیز عبدالصمد صاحب۔

آپ فکشن خاصی طویل مدت سے لکھ رہے ہیں۔بہار میں میرے ساتھ کے لکھنے والوں میں اور مجھ سے محبت کرنے والوں میں مرحوم غیاث احمد گدّی تھے،آپ کو حیرت ہوگی کہ گدّی خاصہ طویل سفر کر کے لکھنؤ قریب سیتاپور جہاں کے گورنمنٹ کالج میں میں اس وقت پڑھاتا تھا خاص طور پر مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں انہیں دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا تھا۔پورا ایک دن میرے پاس رہے،بہت باتیں کیں،ہم دونوں کی Wave Length بہت ملتی تھی۔

میرے بھائی اب کسی ادیب کی تحریروں پر کچھ بھی بولتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے۔ڈر یہ سوچ کر لگتا ہے کہ سننے والا اُس وقت کس ذہنی حالت میں ہو اور وہ اپنے مقابل کی بات کو کس طرح سے قبول کرے اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بات کرنے والے کے ہی بارے میں اس کے خلاف کوئی تکلیف دہ غلط فہمی اس کے دل میں بیٹھ جائے اور بے وجہ ہی ایک ہمدرد اور دوست آپ کے ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے۔پھر آپ اتنی دور بیٹھے ہیں،بات خط کے ذریعے ہو رہی ہے،کوئی لفظ لکھا کس نسبت سے گیا اور سمجھا کس طریقے سے گیا تو پھر اس کی صفائی بھی دینا دشوار ہو جائے گی۔

بس عام سی دو ایک باتیں ضرور کرنا چاہوں گا۔

خوب پڑھئے اتنا زیادہ کہ ایک تحریر کے لکھنے اور دوسری تحریر کے لکھنے کے درمیان کبھی کبھی خاصہ لمبا وقفہ ہو جائے۔خود احتسابی کے لیے ایک تدبیر یہ بھی ہوتی ہے۔اس درمیان وقت مل جاتا ہے اپنے کو دیکھنے کا سمجھنے کا۔ہم سب اچھا بُرا لکھتے ہیں،جینوئن تخلیق مشکل سے ہی نکلتی ہے۔

ایک بار فیاض رخصت کے کمرے میں،لکھنوئی وہ اسٹیشن پر مشرف عالم ذوقی بیٹھے تھے اُن سے پہلی ملاقات ہوئی بڑے سچے جذبے کے ساتھ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ زود نویسی سے پرہیز کیجیے تو اچھا ہے۔بس تب سے وہ مجھ میں کیڑے نکالتے ہیں۔آپ سے کبھی ملاقات ہوگی تو آپ کو اعتماد میں لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ بھائی یہی کیا کم ہے کہ آپ پورے خلوصِ دل سے پرورشِ لوح و قلم میں ایک مدت سے لگے ہیں۔

آپ کو لکھے خط میں میرے خیالات اتنے مربوط نہ تھے کہ ان کی اشاعت کی جاتی،وہ تو ایک بڑبڑاہٹ تھی جو میں صرف عبدالصمد سے ہی کر سکتا تھا اس لیے جابر صاحب کو منع کر دیا ان کی خود بھی یہ رائے تھی کہ تحریر اشاعت کے خیال سے نہیں لکھی گئی تھی انہوں نے پہلے طے کر لیا تھا کہ نہ چھاپیں گے۔۱۸ اور ۱۹ اکتوبر کو علی احمد فاطمی صاحب الہ آباد آنے کو کہہ رہے ہیں مہدی جعفر بھی ہونگے۔ہو سکے تو آپ بھی آ جایئے۔آپ کا ایک طرف کا الہٰ آباد تک کا کرایہ میں اپنی جیب سے دے دونگا۔تقریب کوئی نہیں ہے یار لوگ مل بیٹھیں گے تو تقریب بھی ہو جائے گی۔

اقبال مجید

مکرمی و محترمی عبدالصمد صاحب،سلام مسنون۔

میں گذشتہ چار ماہ سے ضیق النفس کے مرض میں مبتلا ہوں چنانچہ پڑھنا لکھنا التوا میں ہے۔چند روز سے ذرا سا افاقہ محسوس کیا ہے تو یہ حروف لکھنے بیٹھا ہوں۔مجھے آپ کا مرسلہ افسانہ بہت پسند آیا۔آپ نے جس سلیقے اور بے ساختگی سے کہانی لکھی ہے اس نے مجھے متاثر کیا ہے۔میں اسے فنون کے آئندہ شمارے میں شامل کر رہا ہوں۔

خط کا جواب بھجوانے میں تاخیر کا واحد سبب میری علالت ہے مگر معذرت خواہ ہوں۔دعا اور محبت کے ساتھ

احمد ندیم قاسمی

عزیز بھائی عبدالصمد صاحب۔

آپ کا خط گھر کے ایڈریس پر پہنچ گیا تھا لیکن میری نظر سے کافی دیر کے بعد گذرا، میں وسط نومبر ۲۰۰۰ء سری نگر سے دہلی روانہ ہو گیا تھا اور پھر وہاں سے جموں آ گیا تھا،میری ڈاک جو سری نگر کے ایڈریس پر آ گئی تھی، دیر کے بعد میرے پاس آ گئی۔

حیات کے لیے افسانہ بھیجنے پر دلی شکریہ قبول کیجیے۔افسانہ آئندہ شمارے کے لیے رکھ دیا ہے۔رسائل میں آپ کے افسانے پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔آپ کے افسانے حقیقی سطح سے غیر متوقع طور پر بلند ہو کر ماورائی جیت کی طرف سفر کرتے ہیں۔یہ فنی شعور کی بالیدگی کی دلیل ہے۔میری دعا ہے اللہ آپ کو نئی نئی بلندیوں سے آشنا کرے۔

کتاب نما کا نمبر سارے کا سارا کمپوز ہو چکا تھا۔یہ ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔اس کے بعد کوئی خبر نہیں ہے۔نمبر چھپ جائے گا تو آپ کو فوری طور پر مطلع کروں گا۔شاہد اختر کی غزلوں کے لیے شکریہ۔ان کو اشاعت کے لیے رکھ دیا ہے،آپ بے فکر رہیے۔

برادرم پروفیسر وہاب اشرفی کو ٹیلی فون پر میری جانب سے السلام علیکم کہیے،اُن کے نام بھی خط لکھ رہا ہوں۔

''اکتشافی تنقید کی شعریات'' میں جو نکات لوگوں نے متنازعہ قرار دیئے ہیں یا وضاحت طلب ہیں،اُن کے تفصیلی مطالعے کر رہا ہوں۔حال ہی میں

شاعر میں اس سلسلے کا ایک مقالہ ''متن میں معنی کا عمل'' شائع ہو گیا ہے۔امید سے نظر سے گزرا ہوگا۔دعا کیجیے کہ وادی کے حالات میں بہتری آ جائے، اور معصومین کی خونریزیاں بند ہوں تا کہ آپ اور بھابی ہمارے پاس آ سکیں۔

حامدی کاشمیری

برادرم صمد صاحب۔

پٹنہ میں آپ سے ملاقات برائے نام رہی ورنہ خواہش تھی کہ آپ سے کچھ باتیں کروں۔سوچا بھی تھا کہ دوسرے دن ٹھہروں گا تو خاص طور پر آپ سے ملوں گا کیونکہ آپ کو میں نے جس پر وقار طریقے پر رہتے ہوئے دیکھا اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ایک بات اور تھی کہ میں آپ کا ناول مہاتما پڑھنا چاہتا تھا۔یہاں وہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔دوگز زمین پڑھ چکا ہوں۔یہ خط دفتر کے پتے پر بھیج رہا ہوں کہ گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔پتہ نہیں آپ کو خط ملتا بھی ہے کہ نہیں۔میری کتاب غالباً دسمبر میں آ جائے گی میں آپ کو ضرور بھجواؤں گا۔

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

الیاس احمد گدّی

برادرم عبدالصمد صاحب، سلام۔

ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ کے لیے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔بلاشبہ آپ کا ناول اس اعزاز کا مستحق تھا۔اگلا ناول اس معیار کا لکھیے کہ اردو زبان گیان پیٹھ کے ایوارڈ سے پھر سرفراز ہو۔

مجید صاحب کو سلام کہیے۔

''عصری آگہی'' سہ ماہی کا پہلا شمارہ فکشن نمبر کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔کچھ فنی کہانی ہوئی ہو تو اس کے لیے بھیجیے۔

قمر رئیس

محترم رفیق عبدالصمد صاحب۔

آپ کا نوازش نامہ کچھ ہی دن پہلے مجھے ملا۔میں کچھ عرصے سے شملہ میں ہوں۔اسی وجہ سے جواب دینے میں دیری ہوئی۔معافی کا خواستگار ہوں۔

جن مترجم صاحبان نے افسانوں وغیرہ کا ترجمہ کیا ہے اُنہیں ان کے کام کی اُجرت تو ملنی ہی چاہیے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ ضرور ملے گی۔سبھی زبانوں سے ملنے والی ہر تصنیف کو شامل کر پانا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔کچھ ایک کو روک دینا پڑا۔

ہاں۔مجھے ایک شکایت ضرور ہے۔اردو کے مترجم صاحبان نے نہایت لاپرواہی سے کام کیا ہے۔ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے ملے ترجمہ کو دوبارہ پڑھا تک نہیں گیا تھا۔اور ترجمے میں غلطیاں بھی بہت تھیں۔مترجم صاحبان تھوڑا دھیان سے کام کرتے تو ہمیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ترجمے پر دوبارہ کام کرنا بڑی محنت مانگتا ہے۔میں نے اپنے ایک خط میں آپ کا دھیان اس جانب دلایا بھی تھا۔

میں نے ساہتیہ اکادمی کو اس بارے میں آج ہی خط لکھ دیا ہے۔مہینے بھر بعد میں دہلی جاؤں گا۔تب ادائیگی کا کام جیسا مجھ سے بن پڑا کروادوں گا۔اطمینان رکھیں۔میں نہیں جانتا اس معاملے میں ساہتیہ اکادمی کی کیا روایت رہی ہے۔

اُمید ہے آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں گے۔

بھیشم ساہنی

پیارے بھائی عبدالصمد۔آداب۔

تمہارا خط مل گیا تھا۔تمہیں دوہری مبارک باد ہو۔ایک تو نئے برس کی اور دوسری تمہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے کی۔

کئی دنوں سے کام نہیں کر سکا۔اب سوموار سے باقاعدہ کام شروع کر رہا ہوں۔Blocks مکمل کرنے کے بعد میں شاید پٹنہ آؤں گا۔سیریل کے لیے کچھ مزید معلومات کی ضرورت ہے۔خوشبوا بھی زیر غور ہے۔

زیادہ خیریت۔گھر میں سب کو درجہ بدرجہ پوچھنا۔

سریندر پرکاش

برادر عزیز عبدالصمد، سلام بہت۔

آپ سے وعدہ کرتا رہتا ہوں لیکن ''دوگز زمین'' کے بعد آپ کی کسی کتاب پہ کچھ نہیں لکھ سکا۔میری بدقسمتی دوچار روز پہلے مخمور سعیدی سے ملاقات ہوئی تھی۔انہیں بھی ایوان اردو کے لیے آپ کے افسانوں کے مجموعے ''سیاہ کاغذ کی دھجیاں'' پر تبصرہ درکار ہے۔میں اس مہینے کے اندر اندر تبصرہ انہیں بھیج دوں گا۔

نارنگ صاحب کا اٹلی سے خط آیا تھا۔آپ کے لیے سلام لکھا ہے سنا ہے آپ ۲۴ یا ۲۵۔اگست کو دہلی آ رہے ہیں۔دہلی پہنچ کہ فون کیجیے ۲۴/ ۲۵ کی شام ہمارے ساتھ گزاریے اپنی سہولت کے مطابق۔فون پر وقت اور تاریخ طے کر لیں گے۔

بلراج کومل

بگ بینگ (Big Bang)

سب زمین و آسماں اک تودۂ بے جان تھے
پھاڑ کر اُس کو بنائے یہ زمین و آسماں
آب کو اُس نے کیا وجہِ حیاتِ کائنات
اِس کو سائنس نے کہا بگ بینگِ آغازِ جہاں

(القرآن، سورت انبیاء، آیت۔۳۰)

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

براہِ راست

محترم منور رانا سے منسوب اشاعت کی ایک کاپی ہندوستان کے ایک بلند قامت اہلِ قلم کی نظر سے پہلی بار گزری تو انہوں نے خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک زمانہ تھا کہ انڈو پاک کے ادیب آپس میں قریبی روابط رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تخلیقات پر رائے دینے کے ساتھ تبادلۂ کتب بھی کرتے تھے۔''

گذشتہ پچیس برس سے ہماری کوشش اور خواہش یہی رہی ہے کہ یہ سلسلہ نہ صرف دوبارہ سے بحال ہو بلکہ موجودہ وقت کے تقاضوں کے مطابق دونوں طرف کے ادیب، شاعر، دانشور باہمی روابط کی ایسی روایت قائم کریں کہ جس کی دوسری زبانوں کے ادیب پیروی کرنے پر مجبور ہوں۔

آج کی نشست میں پٹنہ ہندوستان میں مقیم جناب عبدالصمد کے فن اور شخصیت کو مربوط شکل میں آپ کے روبرو پیش کیا جارہا ہے۔عبدالصمد صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔آپ نے کم وبیش نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی جس لگن، محنت، محبت اور توجہ سے خدمت کی ہے اُس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ چہارسوکی ہر اشاعت میں مہمانِ خصوصی کے اعزاز و اعتراف میں توصیفی کلمات کا سلسلہ با قاعدگی سے جاری و ساری ہے۔ اس بار ہماری خواہش ہے کہ آپ جناب عبدالصمد کی تخلیقات اور ادبی خدمات کے مطالعے کی روشنی میں وہ تمام تعریفی اور توصیفی کلمات تحریر فرمایئے جس کا محترم صمد صاحب بجاطور پر استحقاق رکھتے ہیں۔

گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز اکثر بچپن کی کٹھی میٹھی یادوں سے ہوا کرتا ہے۔آپ اس روایت کو پروان چڑھائیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔

☆☆ مجموعی طور پر میرا بچپن پرسکون گزرا۔گھر کا ماحول مذہبی تھا مگر اس میں جبر کی گنجائش نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ گھر کے بڑوں کے اعمال ہی خاموش تربیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ہوش وحواس سنبھالنے سے قبل ہی زمینداری کا خاتمہ ہو چکا تھا،اس لئے شروع ہی سے تعلیم وتربیت اور صالح اقدار پر زور دیا گیا جس کے سبب بے راہ روی ذرا کم ہی راس آئی۔ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور پرائیوٹ امتحان دے کر نویں کلاس میں داخلہ ہوا۔اسکول تک تنہا اور بے ضرورت گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔اسکول آنے جانے کے لئے ایک مخصوص رکشہ تھا۔لنچ کے وقت گھر سے کھانا جاتا تھا۔

☆ تدریسی ایام کا احوال بھی اس میں رنگ بھر سکتا ہے؟

☆☆ میری خوش قسمتی ہے کہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک میرا واسطہ شفیق، مہربان اور حوصلہ بڑھانے والے استادوں سے پڑا، جس کا اثر میری زندگی پر مثبت انداز میں پڑا اور میرے لاشعور میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجھے بھی اسی پیشے کو اختیار کرنا ہے۔یہ بات اس لئے بھی ضروری ثابت ہوئی کہ آگے چل کر لکھنے پڑھنے کو ہی میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، کسی دوسرے پیشے میں یہ سہولت کہاں ممکن تھی۔

☆ صاحب ذوق، صاحب علم ہونے کے اسباب ضروری نہیں ، البتہ صاحب قلم ہونے کے لئے بہت سی وجوہات کا ہونا ضروری ہے؟

☆☆ بہت دلچسپ سوال ہے اور میں آپ سے کافی حد تک متفق ہوں۔کئی مثالیں ہیں کہ صاحب قلم آسمان ادب کی بلندی تک پہنچا، مگر وہ صاحب علم نہیں تھا۔میرا مطلب اس مروجہ دنیاوی تعلیم سے ہے جس میں ڈگری یافتہ ہی کو صاحب علم تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ آپ کو کب اندازہ ہوا کہ آپ کے اندر **Story-teller** موجود ہے؟

☆☆ : یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔گھر کا ماحول بہت ادبی نہیں تھا البتہ والدہ محترمہ ناولوں اور اس زمانے کے رسالوں کا مطالعہ کرتی تھیں۔ میں ان کے لئے لائبریری سے کتابیں لایا کرتا تھا۔میرے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کچھ بچوں کے رسالے بھی جاری کروادئے ''کھلونا''، ''کلیاں'' وغیرہ۔

☆ اس کے بعد پہلا قدم کیا اٹھایا؟

☆☆ پہلی کہانی اپریل ۱۹۶۱ء میں ''غنچہ'' بجنور میں شائع ہوئی، جس کا نام تھا ''جھوٹ کی سزا'' اس کے محرک مرحوم جنید شرفی تھے، جو اس زمانے میں ایک مشہور افسانہ نگار تھے اور میرے چچا پروفیسر نہال احمد کے دوستوں میں تھے۔اس وقت میری عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔

☆ عبدالصمد کے افسانے تخلیق نہیں، اپنے بل بوتے پر زندہ ہیں۔کوئی

تخلیق پارہ اپنی بنیاد سے لاتعلق ہو کر کس طرح اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی تحریر، صرف اور صرف اپنی تخلیق کے بل بوتے پر ہی زندہ رہتی ہے۔ جس تحریر میں جتنا دم ہوگا، اسے اتنی ہی دائمی زندگی نصیب ہوگی۔ کوئی تخلیق پارہ اپنی بنیاد سے لاتعلق ہو کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ بنیاد کو وسیع تناظر میں لینا چاہئے۔

☆ اگر آپ کے کردار افسانے کا پلاٹ خود تیار کرتے ہیں تو آپ کے ذمہ کیا کام باقی رہ جاتا ہے؟

☆☆ پلاٹ کی تعمیر میں لکھنے والے اور کردار دونوں کی ساجھے داری ہوتی ہے۔ نہ تو پلاٹ کو سو فیصد کرداروں پر چھوڑا جا سکتا ہے نہ لکھنے والے کی کردار کے حق میں بیجا مداخلت مناسب ہے۔

☆ آپ کے کئی افسانے مثلاً ''سیاہ کاغذ کی دھجیاں''، ''ہونی انہونی''، ''وہ ایک لمحہ''، ''گومڑ'' کے بارے میں ناانصافی یا ناکامی کا تاثر کیوں کیوں دیا جاتا ہے؟

☆☆ یہ میرے لئے انکشاف ہے۔ آپ نے جن افسانوں کے نام لئے وہ سب میرے ان افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہیں زیادہ تر اہل نظر نے سراہا ہے۔ یوں مجھے اچھا اور بہت اچھا لکھنے کا دعویٰ نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ میرے کم ہی افسانوں نے لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔

☆ آپ کے دوسرے افسانوی مجموعے ''پس دیوار'' کے سبھی افسانوں کو گومگو کا شکار بتلانے والے خود کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں؟

☆☆ میں دوسروں کے خیالات پر تنقید نہیں کرتا۔ یوں ''پس دیوار'' میں شامل بیشتر افسانے اکثر میرے سلسلے میں Reference کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

☆ کچھ احباب کا خیال ہے کہ جدیدیت سے قبل آپ گلی کوچے کے افسانہ نگار تھے؟

☆☆ گلی کوچے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ویسے جدیدیت نے مجھے سوچنے سمجھنے اور اپنا محاسبہ کرنے میں کافی مدد پہنچائی ہے۔ جدیدیت جب انتہا پسندی کا شکار ہوئی تب ہی اس میں زوال آیا۔ اس کے Contribution سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے غفلت سے جگانے کا کام تو ضرور کیا۔

☆ علامت اور تجرید سے الگ راستہ تلاش کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ جدیدیت کے عروج میں بھی میں نے محض فیشن کے طور پر ایسے افسانے نہیں لکھے جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا، دراصل اسی روش نے جدیدیت سے لوگوں کو متنفر کر دیا۔ میں نے علامت اور تجرید کا راستہ نہیں چھوڑا۔ میں آج بھی موضوع اور تکنیک کے پیش نظر ایسے افسانے لکھتا ہوں۔ ویسے کوئی تحریر بھی ہو، ایسی ضرور ہونی چاہئے کہ وہ دوسروں تک آپ کے احساسات اور خیالات کی بہ آسانی ترسیل کر سکے۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کا افسانہ فنی اختصار سے واقعی آزاد ہو رہا ہے؟

☆☆ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ''کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیان کے لئے'' اسی احساس نے مجھے ناول لکھنے کی طرف مائل کر دیا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ مختصر افسانہ کوزے میں دریا بھرنے کے مترادف ہے۔ طویل افسانے لکھنا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔

☆ کبھی کبھی Sky Scrappers کے خوف سے آپ کی کہانی صحرائے بے کنار کیوں نظر آتی ہے؟

☆☆ اس کی بابت میں کیا کہہ سکتا ہوں، اس کا فیصلہ تو آپ جیسے صاحب نظر ہی کر سکتے ہیں۔

☆ صنفی ڈسکورس (Gender discourse) کو اگر مابعد جدیدیت کا شناس نامہ گردانا جائے تو اس سے پہلے کا انسان بے شناخت ٹھہرتا ہے؟

☆☆ 'دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے'

☆ اردو کہانی کے بارے میں Survical Spondalitis یا مفلوج ہونے کی بات اندیشۂ دور دراز ہے یا ٹھوس حقیقت؟

☆☆ اندیشہ ہائے دور دراز ہی نہیں بلکہ یہ خیال بالکل غلط ہے، اچھے اور بہت اچھے افسانے آج بھی لکھے جا رہے ہیں، گو تعداد میں کم ہیں مگر اس کے لئے افسانہ جیسی جاندار اور دائمی صنف کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

☆ مابعد جدید Monolingual Society جس تیزی سے پھل پھول رہی ہے اس کے بعد اردو زبان اور مشرقی اقدار کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے؟

☆☆ ہرگز نہیں، بلکہ ان اقدار کی جڑیں اور مضبوط ہو رہی ہیں۔ اقدار کی بنیادیں بہت گہری ہوتی ہیں اور ان کی عمر بہت طویل، وقتی طور پر کچھ دھندلاہٹ ضرور آ جاتی ہے، مگر فوراً چھٹ بھی جاتی ہے۔

☆ سوچی سمجھی موضوعیت کیا ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اگر اس کے ڈانڈے ما قبل کے دور سے ملائیں تو سوال اور بھی گنجلک ہو جاتا ہے؟

☆☆ لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ کس کا ڈانڈا کس سے ملا دیں۔ یوں جب تک موضوع پوری طرح ہاتھ میں نہ آ جائے تخلیقی کام میں ہاتھ لگانا مشکل ہے۔

☆ آپ کے تازہ ناول ''شکست کی آواز'' کو تلذذ آمیز گردانے والے کس حد تک حق بجانب ٹھہرتے ہیں؟

☆☆ ہر پڑھنے والے کا حق ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی ناول یا افسانے کی تفہیم کرے۔ اس میں، میں یا کوئی لکھنے والا کیا کہہ سکتا ہے۔

☆ ''شکست کی آواز'' میں عبدالصمد اپنے آپ کو اندر سے مجتمع کرنے اور بکھرنے کی سعی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ عتیق اللہ صاحب کی رائے کس امر کی جانب اشارہ کر رہی ہے؟

☆☆ میں کیا بتلا سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ لکھنے اور چھپنے کے بعد ہر پڑھنے والے کو یہ پوری آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے طور پر تخلیق کی تفہیم کرے۔ عتیق اللہ ایک بیحد اہم تنقید نگار ہیں۔ ان کی رائے سر آنکھوں پر، میں اس میں کوئی مطلب نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

☆ آپ کے ناول "شب گزیدہ" میں مسلم معاشرے کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو ہراساں انسان کی دریافت کا ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ کون سا انسان اور کون سا معاشرہ پیش نظر ہے؟

☆☆ معاف کیجئے گا، اس نام کا میرا کوئی ناول نہیں ہے۔ "شب گزیدہ" ممتاز ناول نگار قاضی عبدالستار کی تخلیق ہے۔

☆ آپ کو بنیادی طور پر ناول نگار گرداننے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ اپنے ناولوں کے کردار اور پلاٹ میں رد و بدل کر کے افسانے بناتے ہیں، جس سے مکالمے گڑ بڑا جاتے ہیں اور کہیں Gaps پیدا ہو جاتے ہیں اور کہیں Blank Gaps بن جاتے ہیں۔

☆☆ یہ خیال کن لوگوں کا ہے اور کیوں ہے، میں نہیں جانتا، مگر میں ایمانداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ میں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے الگ الگ خانے بنا رکھے ہیں اور دونوں کو کبھی گڈمڈ نہیں کرتا۔

☆ "دو گز زمین" کے بعد آپ اس معیار کا کوئی قلمی کام کیوں نہ کر سکے، جس کی توقع علمی و ادبی حلقے آپ سے باندھ چکے تھے؟

☆☆ اس سوال کا جواب بھی میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے "دو گز زمین" کے بعد متعدد ناول لکھے ہیں، اس کا فیصلہ آپ اور دوسرے قارئین کر سکتے ہیں کہ میں نے کچھ کام کے ناول بھی لکھے ہیں۔ یوں ہمارے ہاں دستور ہے کہ کسی ایک ناول پر مصنف کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور یہ ٹھپہ مرتے دم تک نہیں مٹتا۔ عینی آپا کی مثال سامنے ہے۔ "آگ کا دریا" کو ان کی پہچان قرار دے دیا گیا تھا اور وہ اس سے خاصی نالاں تھیں۔

☆ "آگ کے اندر راکھ" میں نئے عبدالصمد سے ملاقات کا عندیہ دینے والے کس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ میں نہیں جانتا۔ گو یہ حقیقت ہے کہ میرا افسانہ "آگ کے اندر راکھ" اور اسی نام سے چھپے افسانوں کے مجموعے کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

☆ وہ کون سے نظریات تھے جن میں ہم آہنگی قائم کرتے ہوئے ناکامی کا سامنا رہا؟

☆☆ میرے خیال میں ایسی کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔

☆ جو لوگ آپ کے ہاں زبان و بیان کے سہو کا ذکر کرتے ہیں ان کی تشفی کس طرح کرنا چاہیں گے؟

☆☆ مجھے اپنی زبان دانی کا کبھی دعویٰ نہیں رہا۔ میں نے باقاعدہ اردو پڑھی بھی نہیں، میں تو پولیٹیکل سائنس کا طالب علم ہوں۔ میں اسی قدر اردو جانتا ہوں جس سے ماں باپ بھائی بہنوں عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھا جا سکے۔ جو لوگ میری زبان پر اعتراض کرتے ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ گو میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ صحیح زبان لکھ سکوں۔ میری کوشش سے کتنے لوگ مطمئن ہوتے ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔

☆ اردو ادب میں بڑے ناول کی کمی ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کمی کے پورا ہونے کے امکانات کیا ہیں؟

☆☆ آپ کا خیال صحیح ہے۔ بے شک عظیم اور بڑے ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں، مگر یہ بات اہم ہے کہ ناول لکھے جا رہے ہیں اور بڑی تعداد میں۔ ممکن ہے کہ ان میں کوئی بڑا ناول بھی نکل آئے۔ امکانات تو بہرکیف معدوم نہیں ہوئے ہیں اور ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ویسے بھی ناول تو بیس پچیس برسوں سے ہی لکھے جا رہے ہیں۔ اس لئے ابھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ ڈاکٹر آغا سہیل ایک طرف آپ کو ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار سے بہتر ناول نگار گردانتے ہیں، دوسری طرف کردار نگاری کے حوالے سے آپ کی گرفت بھی کرتے نظر آتے ہیں؟

☆☆ کہاں ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار، کہاں یہ خاکسار، یہ تو آغا صاحب کی محبت تھی جو ان کے قلم سے ایسی بات نکل گئی، آپ کے مطابق انہوں نے خاکسار کی جو گرفت کی ہے وہ سر آنکھوں پر۔

☆ پروفیسر وہاب اشرفی نے آپ کی نسبت صف اول کا افسانہ نگار بننے کی جو خوش امیدی قائم کی تھی وہ کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ اس کا جواب تو آپ اور دوسرے قارئین ہی بہتر دے سکتے ہیں۔ وہاب اشرفی صاحب میرے کرم فرما تھے اور کرم فرمائی میں بہت سی خوش امیدی قائم کر لی جاتی ہیں۔

☆ قاسم خورشید صاحب کس سماج کی نشاندہی کر رہے ہیں جو بے مقدر بھی ہے اور بنیادی موقوف سے محروم بھی؟

☆☆ اس کا جواب تو قاسم خورشید صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ وہ ایک ذہین افسانہ نگار بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ ان کی بات پر غور کرنا چاہئے۔

☆ ڈاکٹر اقبال واجد نے آپ کو توسیعی تخلیقی اشاروں کی آواز ہی نہیں گردانا بلکہ الگ کام کرنے کی سند بھی عطا کر دی؟

☆☆ یہ اقبال واجد کی محبت ہے اور بس۔

☆ جوں جوں سعادت حسن منٹو کی شہرت بام عروج کو چھو رہی ہے ووں ووں فیشن کے طور پر منٹو سے ذہنی قربت کا ذکر عام ہونے لگا ہے۔ اس زمرے میں آپ کا نام بھی شامل ہے؟

☆☆ میں منٹو کو ایک بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ منٹو، بیدی، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر ہمارے رول ماڈل ہیں۔ ان کی تحریریں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں اور آنے والے وقتوں میں ان کی معنی خیزی اور اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

جہاں تک سوال ہے ذہنی قربت کا تو یہ ایک بالکل الگ ایشو ہے، اور کوئی ضروری نہیں کہ قاری کسی افسانہ نگار یا ناول نگار کے نظریے سے بھی متفق ہو اور اس سے بلا وجہ ذہنی قربت بھی محسوس کرے۔

☆ آپ نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت کئی نظریات اور نظریہ ساز درمیاں تھے۔ آج ایک نظریہ ایک طاقت اور ایک لاٹھی کی موجودگی میں آپ کس کے حق اور کس کے خلاف لکھیں گے اور کیا لکھیں گے؟

☆☆ سوال میرا یا میرے جیسے لکھنے والوں کا نہیں ہے، اس کا تعلق ان تمام لوگوں سے ہے جنہوں نے قلم کی حرمت، فرد کی ذہنی آزادی، روا داری اور مظلوموں کی حمایت کا حلف اٹھا رکھا ہے۔ ہم ان مقاصد کے لئے کوئی قربانی بھی دینے کو تیار ہیں۔

☆ جب آپ عہد حاضر کے مسلمان کو اپنی تخلیق کا وسیلہ بناتے ہیں تو کس خطے اور علاقے کا مسلمان آپ کے پیش نظر ہوتا ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ اس وقت ساری دنیا کے مسلمان تقریباً ایک ہی طرح کے مسائل بلکہ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اور اگر کہیں اتفاق سے وہ پُرسکون ہیں تو یہ سکون بالکل وقتی ہے۔ میں جب ان موضوعات پر قلم اٹھاتا ہوں تو میرے پیش نظر سامنے کے لوگ اور ان کے مسائل ہوتے ہیں، مگر میں اپنے خیالات کی حد بندی نہیں کرتا، لہٰذا ان کا اطلاق ساری دنیا کے سبھی خطوں اور علاقوں کے مسلمانوں پر ہوتا ہے۔

☆ تقسیم ہند کے بعد جو لوگ پاکستان چلے گئے یا کھدیڑ دئے گئے ان کی نسبت آپ کے ہاں سخت تنقیدی رویے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میرے لئے یہ انکشاف ہے۔ میں نے ان لوگوں کے تئیں کبھی سخت تنقیدی رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا۔ کچھ لوگوں کو حقیقت اگر تلخ محسوس ہوتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے ان سے پوری ہمدردی ہے۔ انہوں نے جن حالات کا سامنا کیا اور کر رہے ہیں ان پر کسی بھی حساس آدمی کا دل دکھ سکتا ہے۔

☆ بنگلہ دیش میں پھنسے لاکھوں محصورین بھی اس تنقید کی زد میں اکثر آتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب اوپر میں موجود ہے۔

☆ آپ کے خیال میں آبادی کے کسی بڑے حصے کو اگر ہجرت کا سامنا ہو تو اسے کتنے وقت میں مقامی بود و باش سے ہم آہنگ ہونا چاہئے؟

☆☆ دیکھئے میں ہجرت کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، مگر ہندوستان سے جو لوگ ترک وطن کر کے گئے انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی زمین چھوڑی اپنے قبرستان چھوڑے، اپنی تہذیب اور اپنی عبادت گاہیں چھوڑیں۔ انہوں نے جب دوسری زمین کو اپنا نیا وطن بنا لیا تو انہیں وہاں کی تہذیب اور زبان کو بھی اپنانا چاہئے تھا، ان سے نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میل جول کا رویہ اپنانا چاہئے تھا۔ تبھی ان کی زبان اور تہذیب محفوظ رہ سکتی تھی۔ بیس پچیس برسوں کے عرصے میں بھی بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ خیر یہ بہت لمبی بحث ہے اور ضروری نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق بھی ہوں۔ مختصر یہ کہ نئے وطن کو اختیار کرتے ہوئے اس کے سارے لوازمات کو بھی اپنانا ضروری ہے۔

☆ پھر سوال اٹھتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی علاحدہ شناخت کیوں برقرار رکھی ہے؟

☆☆ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ اپنا وطن ہے۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آئے، ان کی زبان اور ان کی تہذیب یہیں کی ہے، یہ چیزیں ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ یوں بھی ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف زبانیں اور مختلف تہذیبیں یہاں کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ لہٰذا یہ سوال یہاں کے مسلمانوں کے سلسلے میں ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

☆ ہندوستان میں تعصب کی نئی لہر ''ہندوتوا'' کے پھلنے پھولنے کے اسباب کیا ہیں، اور اس سے سیکولر ہندوستان کو کن مسائل کا سامنا ہے؟

☆☆ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ہندوستان میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد بشمول ہندو برادران، ذہنی اور تہذیبی طور پر سیکولر ہے۔ ''ہندوتوا'' کے علمبردار سوا ارب لوگوں میں اگر دو تین کروڑ بھی ہیں تو اس سے فی الحال بہت بڑا فرق نہیں پڑنے والا۔ ظاہر ہے کہ ابھی حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جب کچھ لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔ مگر آپ یقین مانئے یہ وقتی لمحہ ہے اور ہم اپنے مستقبل سے ہرگز مایوس نہیں ہیں۔

☆ آج کا تخلیق کار بالخصوص تیسری دنیا کے تخلیق کار کو یہ ادراک کب ہوگا کہ دنیا کے تمام مسائل کی بنیاد ہوس نا کی پر تعمیر ہو رہی ہے۔ آپ نہیں سمجھتے، اس قبیح فعل کی صحیح صحیح نشاندہی ہونا چاہئے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ آج کا تخلیق کار یہ ادراک حاصل کر چکا ہے۔ آج جو ناول، افسانے لکھے جا رہے ہیں ان میں زیادہ تر موضوعات انہیں مسائل کے اردگرد گھومتے ہیں۔

☆ آئندہ دس بیس پچاس سال کی دنیا کا نقشہ کھینچا جائے تو صورت حال کیا دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص تیسری دنیا کی تہذیب، تمدن، رسوم و رواج اور زبان و ادب کی شکل کیا ہوگی؟

☆☆ عالمی منظرنامہ جس تیزی سے بدل رہا ہے، اس کے پیش نظر مستقبل کے سلسلے میں کسی قسم کی قیاس آرائی کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔ تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور طرز زندگی سبھی پر ان تبدیلیوں کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اور کچھ اثرات خوش آئند بھی ہیں، ایسی صورت میں جن تہذیب اور زبان و ادب کا تعلق اقدار سے ہے وہ اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہیں اگر اس ہنگامے کے دوران مضبوطی سے اپنے قدموں میں ثابت رہا جائے۔ ویسے اگلا نقشہ بہت گڈمڈ ہوگا اور اس کی واضح تصویر کشی نہیں کی جا سکتی۔

ہونی ان ہونی

عبدالصمد

اچانک دروازہ زور سے کھلا اور کئی افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

اس نے ابھی ابھی بغیر چینی اور دودھ کی چائے کی تیسری پیالی ختم کی تھی اور کچھ دیر آرام کی خاطر بغیر بستر کی چوکی پر لیٹا تھا۔

وہ سب کے سب جانے بوجھے خوفناک اور تیکھے تیوروں والے مقامی لوگ تھے اور ان سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ وہ یوں بھی دستک دے کر آنے کے قائل نہ تھے اور ہمیشہ دوسروں سے پہلے اپنی بات کہتے تھے۔

''یہ مکان خالی کردو، جلد سے جلد۔۔۔ باس کا حکم ہے۔'' ان میں سے ایک کرخت لہجے میں بولا۔

اس کے دونوں کانوں کے پاس سے جیسے دوسنسناتی ہوئی گولیاں گزر گئیں اور آنکھوں کے سامنے۔ آنکھوں کے سامنے تو وہی کھڑے تھے۔

''کیوں؟'' پتہ نہیں اس کے اندر اتنی ہمت کیسے بیدار ہوگئی کہ وہ اُن سے وجہ پوچھ بیٹھا۔ وہ سب ایک عجیب انداز سے مسکرائے، غالباً بے وقوفی سے بھرے ہوئے اس کے سوال پر، پھر بھی ٹھیرے ہوئے لہجے میں اسے جواب ملا ''باس کا حکم ہے اس لیے۔ تم نے سنا نہیں؟ یہ بات پہلے بھی۔۔۔''

''لیکن یہ تو میرا مکان ہے، میرے باپ دادا کا۔۔۔'' ہمت دھیرے دھیرے جوان ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم اور تمہارے باپ دادا، بہت دن یہاں رہ لیے، بہت ہوگیا۔ اب خالی کردو'' ٹھہراؤ برقرار تھا۔

''لیکن۔۔۔''

''کیوں وقت ضائع کرتے ہو استاد۔ یہ خالی نہیں کرے گا۔ تم تم بس اس سے یہ پوچھو کہ یہ کب خالی کر رہا ہے اور اگر اسے کچھ وقت چاہیے تو ہم باس تک اس کی بات پہنچادیں۔'' ان میں سے ایک بیزاری کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنے سردار سے مخاطب ہوا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ جی، مکان خالی کرنے میں تمہیں کتنے دن لگیں گے۔ تمہیں کچھ وقت چاہیے تو۔۔۔'' سردار نما شخص نے پھر اس سے کہا۔

''لیکن میں اس مکان کو چھوڑ کر جاؤں گا کہاں؟ میرا تو ٹھکانا نہیں، یہ تو میرے باپ دادا کی ڈیوڑھی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟'' اب وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اکیلا تھا اور وہ کئی تھے۔

''اوہ! تو تم یوں نہیں مانو گے۔ پھر ٹھیک ہے۔ ہم لوگ دو روز کے بعد پھر آئیں گے اور تمہیں تمہارے سامان سمیت باہر پھینک دیں گے۔ تمہیں یہی منظور ہے تو یہی سہی۔'' سردار نما شخص نے سکون کے ساتھ کہا اور سب جانے لگے۔

''ذرا ٹھہرو تو سہی۔۔۔'' اس نے روکنا چاہا۔

''ابھی نہیں۔۔۔ اب دو روز کے بعد ملاقات ہوگی۔ تب تک کے لیے بائی بائی۔'' وہ بڑے اطمینان سے چلے گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ یوں ہی نہیں گئے بلکہ اپنے ساتھ اس کی گردن بھی اتار کر اپنے ساتھ لے گئے اور یہاں جو کچھ چھوڑ گئے وہ بس۔۔۔

وہ مردے کی طرح چوکی پر گر پڑا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی طاقت بھی اس کی گردن کے ساتھ ہی چلی گئی تھی اور اب وہ ایسا تھا کہ وہ چاہتے تو دو روز کا انتظار کیے بغیر ہی اسے اٹھا کر باہر پھینک سکتے تھے۔

تھوڑی دیر میں خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی اور اس کے گھر پر تعزیت اور دلاسا دینے والوں کی ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

دھمکی کسی ایرے غیرے کی طرف سے نہیں، بلکہ علاقے کے مشہور دادا کی طرف سے دی گئی تھی، جس نے اپنا کیریئر ایک جھگڑالو غنڈے کے طور پر شروع کیا تھا اور جواب اپنے میدان کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ سمجھے جانے کے بعد پھر اس نے کسی دوسرے بادشاہ کو اس میدان میں جمنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اُس نے باقاعدہ ایک شاندار آفس قائم کر لیا تھا اور بہت سے ایسے کام انجام دیتا تھا جنہیں سماجی خدمت کہا جاتا تھا۔ ویسے وہ بوتھ پر قبضہ کرنے ناپسندیدہ لوگوں کو ووٹ نہ دینے، بے کار قبضے سے قیمتی زمینوں کو نکالنے اور اصول پسند بننے والوں کا دماغ ٹھیک کرنے وغیرہ کے فرائض بڑی تن دہی سے انجام دیتا تھا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اس تک پہنچنے اور اس کا محنتانہ ادا کرنے کی صلاحیت کم ہی لوگوں میں تھی۔

اس نے ایک بہت ہی معمولی، کم زور، اور بے حیثیت آدمی کو صرف ایک اشارا کیا تھا اور بس۔ لیکن اس اشارے میں کتنی قوت پوشیدہ تھی کس قدر طاقت تھی اس میں، اسے وہی لوگ محسوس کر سکتے تھے جنہوں نے اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور باحیثیت لوگوں کو بڑی آسانی کے ساتھ اُجڑتے دیکھا تھا۔

''پولیس کی مدد لی جائے۔'' کسی نے چپکے سے ایک رائے اچھالی اور پھر ریت میں اپنا منہ چھپانے کی کوشش کی۔

باقی سب نے گھور کر اُسے دیکھا۔ ایک نے رائے دینے والے سے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے کہ شامو کو ایسی ہی وارننگ ملی تھی اور اس نے پولیس کو خبر کی تھی، اس کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟''

سب کے سر جھکے ہوئے رہے۔ اگرچہ وہ واقعہ پُرانا تھا، لیکن لوگوں کو کل کی طرح یاد تھا۔ پھر بھی کہنے والے نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ بات کہہ ہی دی: ''شامو کو صرف اس کے مکان سے ہی نہیں نکال پھینکا گیا

بلکہ اسے اپنے گھر والوں سمیت دنیا ہی کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا۔ پولیس کو واردات چاہیے اور موقع واردات پر گواہی، سو جب یہ دونوں چیزیں نہیں ملیں گی تو پولیس بے چاری کیا کرے گی؟ اس کی بھی اپنی مجبوری ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔ اس کے حکم پر آدمی اپنا مکان چھوڑ دے۔'' رائے دینے والا بولا۔

''یہی تو سوچنا ہے کہ کیا کیا جائے۔۔۔ بات تو بالکل بے تکی اور بے انصافی کی ہے۔ واہ! یہ اچھا مذاق ہے کہ جو آدمی باپ دادا کے زمانے سے اپنی زمین میں رہتا آ رہا ہے، اس سے کوئی دوسرا آدمی آ کر کہے کہ تم مکان خالی کر دو اور وہ بھی بلا وجہ۔۔۔ واہ!''

''آہ اور واہ کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی تو یہ سوچنا ہے کہ۔۔۔ آخر وہ دو روز کے بعد پھر آنے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ جو دھمکی دے کر گئے ہیں، اس پر عمل بھی کریں گے، کیوں کہ وہ یہی کرتے آئے ہیں۔''

''اسی لیے تو وہ اتنے شیر ہو گئے ہیں۔''

''نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ کسی نے بھی اپنی خوشی سے ان کی بات نہیں مانی۔ یہ بات اور ہے کہ کسی نے ان کی بات ٹھکرائی بھی نہیں۔ اُن کی وارننگ سُن کر اُچھل کُود کر اور پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور کیا وہی جو انہوں نے کہا۔''

''اگر طاقت ہے تو پھر مقابلہ کرنا چاہیے۔''

وہ سب کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتیں، ان کی آوازیں اس کے کانوں میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ ان میں سب کے سب تعزیت اور اظہار ہمدردی کرنے والے تھے اور اس سے زیادہ وہ بے چارے کر بھی کیا سکتے تھے؟ جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور جو کالا سا یہ انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اس پس منظر میں یہی بہت تھا کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لا رہے تھے اور غنیمت تھا کہ۔۔۔

''دیکھو بھیا، نراش مت ہو، ہمت نہ ہارو۔ تم اپنے مکان کی حفاظت میں جو بھی قدم اٹھاؤ گے ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔'' جاتے جاتے انہوں نے آخری دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''انہوں نے خالی ہی کرانے کا فیصلہ کر لیا تو؟'' پھر کسی نے سوال کا ایک کبوتر فضا میں چھوڑا۔ لیکن شکر ہے کہ اس پر کوئی بحث میں نہیں اُلجھا اور سب چُپ چاپ چلے گئے۔

گھر کی عورتیں اور دوسرے قریبی رشتے دار جو اتنی دیر ضبط کیے بیٹھے تھے، ان کے جاتے ہی پھوٹ پڑے اور پھر جو آہ و بکا مچی تو وہ جیسے اپنا دکھ بھول گیا اور انہیں چُپ کرانے میں لگ گیا۔

''چپ رہو، خدا کے واسطے چپ رہو۔ ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ ابھی میں زندہ ہوں اور ہمارے پاس دو روز باقی ہیں، پورے دو دن، یعنی اڑتالیس گھنٹے۔۔۔''

اچانک ایک بیمار، غریب، بے کس اور بے سہارا آدمی کے منہ سے حوصلہ افزا الفاظ سُن کر وہ واقعی چُپ ہو گئے اور اُسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ الہٰ دین کے چراغ کا جن ہو اور ابھی ہاتھ بڑھا کر کسی ایسی چیز کو لا کے ان کے سامنے کھڑا کر دے گا جو۔۔۔

لیکن الفاظ صرف مرہم رکھ سکتے ہیں، زخم نہیں بھر سکتے۔ اس کی بیوی جو زندگی کے بیس نرم گرم سال اس کی رفاقت میں گزار چکی تھی، ان الفاظ کی حقیقت سے خوب واقف تھی۔ وہ اگر زندہ ہی تھا تو کس کام کا؟ اب تک زندہ رہا تو اس نے کون سا کارنامہ انجام دے دیا؟ دو دن، دو روز یعنی پورے۔۔۔ یہ بھی یوں ہی گزر جائیں گے جس طرح زندگی کے اتنے ماہ و سال گزر گئے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی کرشمہ نہیں ہوگا۔ ہاں، آج کی تاریخ میں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ ابھی ہمارے پاس دو روز ہیں۔۔۔ دو روز یعنی دو دن، یعنی اڑتالیس گھنٹے!

''تم اکیلے کیا کرو گے بھیا؟'' اس کی بہن نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دریافت کیا۔ اس کے چار بیٹے کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے اور کڑی محنت کے ساتھ مناسب غذا نہ ملنے کے باعث اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اسے ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا کہ کہیں کسی نے انہیں طمانچہ مار دیا تو وہ جانے کہاں جا گریں گے۔

''کچھ بھی کریں گے، لیکن اس مکان کو خالی نہیں کریں گے۔'' اس نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ اس کی بیوی واقعی چونک گئی۔ عزم سے بھرا ہوا یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے بیس سال کے لمبے عرصے میں سنا تھا۔ اس نے جملے کو اس کے چہرے پر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ اُسے تو وہاں صاف نظر آ رہا تھا کہ ہم یہ مکان ضرور خالی کر دیں گے۔

''کس کی ہمت ہے کہ مکان ہم سے خالی کرا لے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہمارے باپ دادا کا مکان ہے۔ ہم یہاں سینکڑوں برس سے رہتے آئے ہیں۔ کیا اتنا آسان ہے مکان خالی کرا لینا؟ آخر قانون بھی کوئی چیز ہے!'' اس کے چچا زاد بھائی نے بلند آواز میں گویا اعلان کیا۔ اس مکان میں اس کا بھی حصہ تھا اور جلد ہی بٹوارے کے لیے پنچایت بیٹھنے والی تھی۔ لیکن اس کا یہ اعلان مکان کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے گونجا پھر شکستہ کانوں میں جا کر دبک گیا۔

''ہمت۔۔۔؟ قانون۔۔۔؟'' وہ ایک عجیب انداز میں مسکرایا۔'' یہ چیزیں تو بہت زمانے سے اِدھر نہیں دیکھی گئیں۔ ہم نے تو ان کا نام بھی سنا ہے، ہمارے بچے تو ان کا نام بھی نہیں جانتے۔ ان کا ذکر کرنے سے اب کیا حاصل؟ ہمیں تو ان دو دنوں میں اس کا پتہ لگانا ہے کہ کیا ہم واقعی مکان خالی کریں گے یا پھر اسے بچانے کا کوئی امکان ہے ہمارے پاس؟'' اس نے اس انداز سے اپنی بات رکھی جیسے یہ مسئلہ صرف اس کا نہیں سب کا تھا، حالانکہ اس مکان میں صرف وہی رہتا تھا اور اگر مکان ہاتھ سے نکل جاتا تو نقصان اس کا اور صرف اس کا ہوتا۔

ایک پُر اسرار خاموشی چاروں طرف تیر گئی۔

''کون سا مکان۔۔۔؟'' اس کی بیوی نے خاموشی کی چادر کو ہلکے سے چاک کیا۔''کوشش تو صرف مقابلہ کر کے کی جاسکتی ہے۔مگر کیا ہم لوگ اس مصیبت کا سامنا کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے نہیں کرسکتے۔تو پھر امید لگا کر وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟'' اس کی بیوی نے سب کے چہرے کے تناؤ کو کافی حد تک کم کر دیا۔اور انہیں اپنی آنکھوں کی دھند کے سامنے باہر جانے کا آسان راستہ نظر آیا۔

''چلو اچھا ہی ہوا۔گھر اور باہر دونوں طرف سے امیدیں ختم ہو گئیں۔اب تو جو کچھ بھی سوچنا ہے ان کے علاوہ سوچنا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے بولا۔

کمرے میں صرف اس کی بیوی تھی جو نہ صرف اسے بہت اچھی طرح پہچانتی تھی بلکہ اسے دیوار پر لکھی تحریر پڑھنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔اس نے بہت ہی ہمدردی بھرے لہجے میں اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔''میں ایک بات کہوں۔مانو گے؟''

اس نے رضامندی بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا،اس کے باوجود اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔۔۔اس کے گھر کی طرح جہاں اب چائے کے لیے چینی اور دودھ بھی نہیں تھا اور جو آخری چائے بنی تھی اس میں ڈبے کی جھاڑن پتی کے طور پر استعمال کی گئی تھی۔

''ابھی ہمارے پاس پورے دو روز باقی ہیں،اس کے بعد کیا ہوگا،یہ تم بھی جانتے ہو۔پھر کیوں نہ ہم ان دو دنوں میں بھر پور انداز میں اپنا وقت گزاریں؟ کیوں نہ،ہم۔۔۔''

''یعنی پورے مکان میں جلتی بجھتی رنگین بتیاں لگائیں۔خوب چراغاں کریں۔سارے شہر کی دعوتیں کریں۔دو رات،دو دن خوب جشن منائیں!'' وہ بیوی کی بات پر چڑ گیا۔

''نہیں۔۔۔ابھی میں احمقوں کی جنّت میں نہیں گئی اور نہ میں نے ابھی اپنے ہوش و حواس کھوئے ہیں۔میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دو دنوں میں ہم بھر پور انداز میں اپنے مکان کو اپنا سمجھیں۔اس کی اینٹوں،اس کی مٹی،اس کے گارے،سیمنٹ کی خوشبوؤں کو اپنے اندر اتنا اتار لیں،اتنا اتار لیں۔۔۔'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ گم صم سا بیوی کو دیکھتا رہ گیا۔واقعی وہ ابھی تک اپنے ہی مکان میں لگ بھگ ایک کرایہ دار کے طور پر رہتے آئے تھے۔اس مکان کا کچھ بھی ان کا اپنا نہیں تھا اور جب وہ مکان ان کا بالکل اپنا بن کے سامنے آ کھڑا ہوا تو ان کے پاس صرف دو دن بچے تھے،صرف اڑتالیس گھنٹے!

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

ایک دوسرے علاقے کا دادا جو اسی کی زبان بولتا تھا،اسی کے صوبے کا تھا،اس کی داستان سن کر مسکرایا اور بولا''ہم لوگوں کا اصول ہے کہ دوسرے کی رَن بھومی میں جا کر اڑنگا نہیں مارتے۔آج میں اس کے علاقے میں جاؤں گا،کل وہ میرے علاقے میں آجائے گا۔پھر ہم لوگ رنگ داری کیا کریں گے؟ میں تمہیں کچھ پیسے دلوائے دیتا ہوں،اس سے تم۔۔۔''

''نہیں۔۔۔نہیں مجھے پیسہ نہیں چاہیے۔میں اس پیسے سے اپنے باپ دادا کی روحیں نہیں خرید سکوں گا جو میرے اپنے مکان میں مجھ پر سایہ کیے رہتی ہیں۔مجھے کچھ نہیں چاہیے۔نہ مجھے کوئی محل چاہیے،نہ جنّت،مجھے صرف اپنا مکان چاہیے۔'' وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔

دادا نے اس کے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا''آئے ہو ایک رنگ دار کے ہاں اور کر رہے ہو شاعری۔۔۔میں تمہیں ایک حل بتاتا ہوں۔تم یہ مکان خالی کر دو۔میں تمہیں ایک دوسرے مکان پر قبضہ دلا دوں گا۔یہ میرا وعدہ رہا۔''

وہاں سے پولیس کے پاس گیا۔

''ہم لوگ اس قسم کی شکایتوں پر دوڑتے رہے تو پھر ہو چکا شہر کا انتظام۔اور پھر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس دھمکی کا؟ دنیا تو بہت سی باتیں کہتی ہے،لوگ تو بہت گواہیاں دیتے ہیں لیکن ہمیں تو کوئی ٹھوس ثبوت چاہیے،ٹھوس ثبوت۔۔۔''

''وہ جب ہمیں بے دخل کر دیں گے،ہمیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیں گے تب ہی آپ کو ٹھوس ثبوت ملے گا نا؟''

''ہاں بے شک۔آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں تو کچھ قانونی نکتوں اور مجبوریوں سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ساتھ ہی آپ کی حفاظت بھی ہمارا فرض ہے۔ہم دیکھیں گے کہ ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔''

امیدوں کے جڑنے اور ٹوٹنے میں چوبیس گھنٹے سر اسر نکل گئے،تب بیوی نے بہت ہی معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا،جیسے کہہ رہی ہو''ابھی چوبیس گھنٹے ہمارے پاس ہیں نا!''

اس نے بھی نظروں ہی نظروں میں اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''بیس برس میں ایک مکھی تو نہ مار سکے۔ان چوبیس گھنٹوں میں کون سا تیر مار لوگے۔میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

یہ بات اس کی بیوی کی زبان سے ادا ہوئی نہ اس کی نظروں سے نشر ہوئی۔یہ بات تو اس کے دل میں اس کی بیوی کی طرف سے پیدا ہوئی اور وہ خود ہی تلملا کر رہ گیا۔

''دروازہ خوب اچھی طرح بند کر دو۔'' اُس نے دھیرے سے اپنی بیوی سے کہا۔

اس کی بیوی اُٹھی اور دروازہ اچھی طرح بند کر کے اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی''شکر ہے کہ ابھی تک ہم اپنی مرضی سے دروازہ بند تو کر سکتے ہیں۔''

''کھول بھی سکتے ہیں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ اس حاضر جوابی پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''دیکھنا تو، گھر میں چھوٹے بڑے ہتھیار کتنے ہیں؟'' اس نے بڑے رازدرانہ انداز میں پوچھا۔

''ہتھیار؟'' بیوی نے اُسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ویسے وہ ہنسنا چاہتی تھی۔ وہ اندر گئی اور پھر اس کے سامنے اس نے کچھ گھریلو سامان لاکر رکھ دیا۔

''یہ مچھردانی کے ڈنڈے ہیں۔ یہ داداجی کی لاٹھی۔ یہ ہاکی کا ٹوٹا ہوا بلاّ۔ یہ ڈنڈے باندھا ہوا پرانا جُوتا، یہ باباجی کی زنگ خوردہ تلوار، پتھروں اور اینٹوں کے کچھ ٹکڑے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''چھُریاں بھی تو ہیں۔ آپ شاید باورچی خانے نہیں گئیں؟''

اس کی بیوی نے دومختلف سائز کی چھریاں بھی لاکر رکھ دیں۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان چیزوں کو دیکھا اور ناگواری کے انداز میں بولا: ''میں نے ہتھیاروں کے بارے میں۔۔۔''

''اچھا وہ۔۔۔ لو ابھی لاتی ہوں۔'' اس کی بیوی نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور دو تین موٹی کتابیں اس کے ہاتھوں میں لاکر تھما دیں۔

''یہ کیا؟''

''تم جن ہتھیاروں کی بات کر رہے ہو وہ تو اب ان ہی میں ملیں گے۔'' بیوی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنے کے لیے آگے بڑھی۔

''چھوڑ دو ابھی نہیں۔'' اس نے اسے روک دیا۔ اس وقت تک ان چیزوں کا کوئی مصرف اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جو لوگ اسے دھمکی دے گئے تھے، ان کے پاس قابلِ رشک صحت کے علاوہ ایسے ایسے جدید ہتھیار تھے جن کے نام بھی عام آدمیوں کے لیے اجنبی تھے۔ ان ہتھیاروں کے بارے میں عجیب پُراسرار قسم کی کہانیاں مشہور تھیں۔ اس لیے کانوں میں ان کے نام پڑتے ہی جسم پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا مکان تھا جو ان لوگوں کی دھمکی کے مطابق اب صرف چند گھنٹے کے لیے اس کا رہ گیا تھا۔ اس کی بیوی نے ہتھیار مانگنے پر جو چیزیں سامنے لاکر رکھی تھیں وہ اس کے بوسیدہ مکان سے بہت مطابقت رکھتی تھیں۔ جو لوگ مکان خالی کرانا چاہتے تھے، ان کے لیے یہ بوسیدہ مکان نہیں بلکہ اس کے ملبے کے نیچے دبا ہوا قیمتی سونا اہمیت رکھتا تھا جو مکان کی شکل میں ان کے ہاتھ آجاتا اور پھر وہ اس کے چپّے چپّے کی منہ مانگی قیمت وصول کرتے۔ اس کے لیے تو بس یہ ایک سیدھا سادہ سر چھپانے کا آسرا تھا جو باپ دادا کے زمانے سے اس کے پاس چلا آرہا تھا اور چاہے اس کے پیٹ میں اناج کا ایک دانہ بھی موجود نہ ہو پھر بھی اس کے مکان کی بوسیدہ چہار دیواری اُسے طمانیت بخشتی تھی اور شاید یہ طاقت روئے زمین پر کھڑے کسی محل میں بھی نہیں تھی۔

اب اس کے پاس آخری ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آئیں گے، ضرور آئیں گے، کیوں کہ وہ اس معاملے میں مرد کی زبان رکھتے تھے اور شاید یہی ان کی قوت کا راز بھی تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے، کرگزرتے تھے۔ اس کی بیوی نے کوشش کی کہ سامان سمیٹ لے تاکہ کم سے کم وہ ٹوٹے تو نہیں، لیکن اُس نے بہت سختی سے اسے روک دیا۔

''کس اُمید پر۔۔۔؟'' بیوی نے تمسخر بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

چوں کہ اس نے دو دن پہلے ہی یقین کو مضبوطی سے تھام لیا تھا، اس کے دل میں اب کوئی ہلچل نہیں تھی۔

''دیکھتی جاؤ۔'' اس بے پروائی کے ساتھ مختصر جواب دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اور کام بھی کیا؟

شاید اس کی بیوی نے اتنے دنوں کی رفاقت میں پہلی بار دیکھا تھا کہ وہ گھر کے چھوٹے بڑے سارے سامان کو مناسب ترین جگہ پر بہت قرینے سے لگا رہا تھا اور اس پر اس قدر انہماک سوار تھا کہ وہ جیسے اپنے آپ کو بھی بھول چکا تھا۔ سامان تو تقریباً سب کا سب پرانا، ٹوٹا پھوٹا اور بوسیدہ تھا لیکن مناسب جگہوں پر رکھے جانے کے سبب اچھا لگ رہا تھا۔

''پاگل ہوگیا ہے بے چارہ!'' بیوی آہستہ سے بڑبڑائی۔

پتہ نہیں کیسے اس کے کانوں تک بات پہنچ گئی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور آہستہ سے بولا ''میں پاگل نہیں ہوا۔ میرے اندر اپنے مکان میں رہنے کی خواہش بیدار ہوئی ہے اور تم کہتی ہو کہ۔۔۔ ارے بھائی، ہم غریب ہیں تو کیا ہوا؟ ہمارا سامان پُرانا اور ٹوٹا پھوٹا ہے تو کیا فرق پڑا؟ ہم اسے پھینک تو نہیں دیں گے۔ آخر اسے مناسب جگہوں پر تو رکھیں گے نا؟''

''اور وہ آنے والے ہیں، اسے اٹھا اٹھا کر پھینکنے والے۔۔۔؟''

اس کی بیوی کی آواز غصے اور افسوس سے لرز گئی۔

اس کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا اور وہ بہت ہی مستحکم لہجے میں بولا ''کس کی مجال ہے۔۔۔''

اس کی بیوی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ نہیں، یہ وہ آدمی تو ہرگز نہیں تھا۔۔۔ وہ مریل، بیمار، بیکار اور کاہل سا آدمی جس کے ساتھ اس نے زندگی کے بیس بے معنی سال گزارے تھے۔ کیا یہ وہی تھا؟ اگر یہ وہی تھا تو یہ جملہ اس کا ہرگز نہیں تھا۔ اس جملے میں جو عزم تھا، جو طاقت تھی، جو استحکام تھا، جو قوتِ ارادی تھی، جو۔۔۔۔

معمول کے مطابق دستک کے بغیر دروازہ بڑے زور سے کھُلا اور وہ لوگ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اندر سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بیوی اپنی پرانی سلائی مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ بچے اپنی کتابیں اور کاپیاں کھولے پڑھائی میں مشغول تھے۔ کہیں کوئی اتھل پتھل نہیں

تھی۔سب کچھ بہت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

وہ انہیں دیکھ کر چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو تم مکان خالی نہیں کرو گے؟'' ان میں سے ایک غرّایا۔

''کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اُس کا سکون دیکھنے کے لائق تھا۔

''تم جانتے ہو، ہم تمہارا کیا حشر کر سکتے ہیں؟''

''نہیں جانتا۔لیکن ہم مکان خالی نہیں کریں گے۔یہ ہمارے باپ دادا۔۔۔''

''اچھا!'' ان میں سے ایک بڑے تمسخر سے اس کی بات کاٹ کر مسکرایا۔

''یہ یوں نہیں مانے گا۔اس کا علاج ابھی ہو جاتا ہے۔'' ان میں سے دو بڑے طیش کے عالم میں بڑھے۔لیکن سردار نما شخص نے انہیں فوراً روک دیا۔

''رُک جاؤ! اس نے ضرور کوئی تیاری کی ہے، ورنہ اس کی یہ ہمّت۔''

''تو پھر۔۔۔تو پھر کیا ہم اس سے ہار مان جائیں؟''

''کیوں اپنی اور اپنے بچوں کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟ تو ہمیں اچھی طرح پہچانتا ہے نا؟''

''خوب پہچانتا ہوں۔'' وہ بڑے پرسکون انداز میں بولا۔

وہ جیسے زِچ ہو کر رہ گئے۔

''برداشت کی بھی حد ہوتی ہے استاد۔یہ تو۔۔۔یہ تو۔۔۔''

''اسے سرکشی کی فوراً سزا ملنی چاہیے۔''

''نہیں۔۔۔ہم پھر آئیں گے اور اسے عبرتناک سزا دیں گے۔آج تک ہمارے مقابلے پر کوئی نہیں آیا۔اور یہ۔۔۔چہ پدّی۔۔۔''

ان کے پاؤں بار بار آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے،لیکن پتہ نہیں وہ کون سی غیبی طاقت تھی جو انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ان کے سامنے اس بوسیدہ مکان کا وہ اندرونی حصہ تھا جس میں کوئی بات نہیں تھی۔ایک کمزور سا آدمی،ایک ناتواں عورت اور چند معصوم بچے اپنے اپنے طور پر موجود تھے۔

''ضرور اس نے اندر اندر کوئی تیاری کی ہے۔'' ان میں سے ایک زیرِلب بڑبڑایا۔

''تو کیا ہوا؟ کیا ہم لوگ اتنے گئے گزرے ہیں کہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے؟'' یہ وہی تھا جس نے سب سے پہلے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟ لیکن ابھی تمہیں یہ خبر نہیں ہے کہ اُس نے۔۔۔یوں بھی باس کی اجازت کے بغیر ہم رَن بھُومی میں نہیں کُود سکتے نا۔'' سردار نما شخص نے دھیرے سے انہیں سمجھایا اور پھر بلند آواز میں اپنے ہی ساتھیوں سے مخاطب ہوا: ''چلو۔اس بے چارے کو اپنی زندگی کے چند لمحے اور گزارنے دو۔فی الحال اوپر والا اس پر مہربان ہے۔لیکن کب تک۔۔۔''

وہ جس طرح دندناتے ہوئے آئے تھے اسی طرح دندناتے چلے گئے۔

اس کے مکان کی بوسیدہ دیواروں کی شکستہ جھریوں کے اس پار لاتعداد بے سہارا اور مظلوم آنکھیں لگی ہوئی تھیں جو بس ہونی کی منتظر تھیں۔ان آنکھوں نے ہونی کے اتنے شعلے سہے تھے کہ ان میں اُمید کی چمک دمک اب ختم ہو چکی تھی اور ابھی ابھی جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا وہ اس حد تک ان کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ شروع کے چند لمحوں میں تو وہ صرف اپنے آپ کو اپنے ہونے کا یقین ہی دلاتے رہے۔

ان کے جاتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا اور مبارکباد دینے لگے۔

وہ چُپ چاپ کھڑا مسکراتا رہا۔انہیں رخصت کر کے اس نے دروازہ بند کیا اور بڑے اطمینان سے چوکی پر لیٹ گیا۔دو دنوں میں وہ بہت تھک گیا تھا۔

''لیکن وہ پھر آئیں گے۔۔۔'' اس کی بیوی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھا جائے گا'' اس نے بے پروائی کے ساتھ آہستہ سے کہا اور دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

''اچھوتے کردار''

میری نظر میں عبدالصمد ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے کردار خود اپنے عمل اور ردِعمل سے افسانے کا پلاٹ تیار کرتے ہیں۔وہ زمین سے اس قدر جُڑے ہوتے ہیں کہ قاری اُن میں اپنے آپ کو بھی چلتا پھرتا سوچتا عمل کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔وہ اپنے افسانوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اچھوتے نہ ہوتے ہوئے بھی کرافٹ کی خوبیوں کے باعث اچھوتے لگتے ہیں۔اُن میں ایک ایسا تجسس ہوتا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے۔اُن کی طوالت،طوالت نہیں لگتی بلکہ اُن کے اختتام کے بعد بھی کہانی قاری کے دل و دماغ میں دوڑتی رہتی ہے۔ان کے ایسے طویل افسانوں میں ''میوزیکل چیئر،نجات،دیر سے رُکی ہوئی گاڑی،آگ کے اندر راکھ،سنگِ مرمر کا رنگ،اور جلی ہوئی کشتی کا سفر'' ہے۔

نورالحسنین (اورنگ آباد، بھارت)

جبلتیں اورقدریں

پروفیسروہاب اشرفی

(●)

عبدالصمدایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ان کے ناولوں کے متعدد افسانوی مجموعے مثلاً ''بارہ رنگوں والا کمرہ''،''پس دیوار''،''سیاہ کاغذ کی دھجیاں''، ''میوزیکل چیئر''اور''آگ کے اندر راکھ'' شائع ہو چکے ہیں۔مزید نئے مجموعے اشاعت پذیر ہو سکتے ہیں۔ان کے سرسری مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذہنی ارتقا کی تفہیم آسان نہیں ہے۔خصوصاً اس ذہن کی جس کا تعلق تخلیقی جہات سے ہو۔ایسا اکثر ہوا کہ ابتدائی تخلیقی کاوشیں ایسا رنگ روپ رکھتی ہیں جن سے ذہن کی سادگی اور معصومیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔رفتہ رفتہ فنی رموز اور ان کے امکانات تجربے اور مشاہدے کی آنچ کونت نئے چولے پہنا دیتے ہیں اور ذہن علوم کی طرف مائل ہو کر پیچیدہ امکانات کی طرف راجع ہوتا ہے۔اگر ایسا ترفع نہ ہو تو پھر فنکار رست گام ہو جاتا ہے یا اپنے آپ کو دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تخلیقی قوت آہستہ آہستہ ایک کروٹ لگنے لگتی ہے،لیکن جہاں تجربات اور مشاہدات نئے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں تو ترفع فنکار کا مقدر بن جاتا ہے۔ جو ہمیشہ بڑی بات ہوتی ہے۔

عبدالصمد ایک ذہین ناول نگار ہیں اور ایک معتبر افسانہ نگار بھی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کی تخلیقی جہات کا رخ کیا ہے۔زندگی کے اسرار و رموز کس حد تک مختلف منزلوں میں واشگاف ہوتے رہے ہیں،کیا ان کی ڈگر ایک ہے، چاہے وہ جتنی بھی سالم کیوں نہ ہو۔لیکن میرا مطالعہ ایک الگ نتیجے پر پہنچانے کا سبب ہے جس کے لیے وزنی دلائل ہیں اور جن کی بنت میں ارتقائی کیف وکم کا حال روشن ہے۔

جدیدیت کے دور سے پہلے عبدالصمد گلی کوچوں کے افسانہ نگار تھے۔ان کے افسانوں میں غربت اور افلاس کی لکیریں واضح تھیں۔جو غبار تھا وہ پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کی راہ سے آیا تھا۔جسے وہ اپنی تخلیقی جوت سے کتھارسس کے عمل سے گزار رہے تھے،جہاں ابہام کا دخل نہ تھا،دھند کہیں نہیں تھی،ترسیل کا پاس تھا،اس انداز نے انہیں سپاٹ بنا دیا تھا اور معلوم سی وضاحتی لکیر نمایاں تھی۔فنی رموز اپنی جگہ بنانے کے عمل سے دور تھے۔قیاس تھا کہ غریبوں اور مفلسوں کا یہ افسانہ نگار بہت دور کے سفر سے دو چار نہیں ہو سکے گا۔تب ہی جدیدیت کی لہر تیز ہو گئی۔ترقی پسندی کی تخلیقی روش میں کیڑے لگ گئے تھے، وجودیت بار بار ہی تھی،کیکرے گارڈ،ہائیڈیگر،یسپرس،مارسل،کامیو،کافکا،سارتر اور کئی دوسرے عظیم فنکاروں سے اردو والے کلی آگاہی کے بغیر یا آگہی کے بعد نئے تخلیقی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔عبدالصمد کیوں پیچھے رہتے،انہوں نے وجودی افکار کی راہ اپنانی شروع کی۔میں نہیں جانتا کہ انہوں نے متذکرہ فنکاروں کو کتنا پڑھا تھا،لیکن جدیدیت وقت کا تقاضہ بن گئی تھی،بعض ترقی پسندوں نے بھی سپر ڈال دی اور ابہام اور اہمال کی منزلوں سے آشنا ہونے کے لیے اپنی تخلیقی قوت کو آزمانا شروع کر دیا۔پچھلی تخلیقی کاوشیں انہیں دہائی دیتی رہیں لیکن جدیدیت کا جھونکا شدید تھا وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔عبدالصمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا،وہ وجودی افکار کی تفہیم کے بغیر یا بعد نئی ڈگر سے رشتہ استوار کرنے لگے۔نتیجے میں''بارہ رنگوں والا کمرہ''جیسا مجموعہ پڑھنے والوں کے سامنے تھا۔ کامیو اور کافکا بننے کے لیے سریت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہیے۔اردو میں کسی کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ نہیں یہ زیادہ ذی علم لوگ بتا سکتے ہیں،مجھے تو اب تک ایسے لوگوں کی تلاش رہی تھی۔جہاں تہاں کچھ نشانات ملتے ہیں لیکن زیادہ لایعنیت کے زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں۔بعضوں نے خوابوں کے عمل جیسا تخلیقی انداز اختیار کیا۔مین رانے تجرید کی راہ اپنائی۔کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غور و فکر کے بعد ہی یہ راہ اختیار کی،وہ کامیاب ہوئے۔سریندر پرکاش نے خواب آگیں کیفیت اپنی تخلیقات میں اپنانی شروع کی اور سرریلسٹوں جیسا رویہ اختیار کیا۔وہ کسی حد تک اپنی سعی میں کامیاب ہوئے۔دوسرے افسانہ نگار سور اور ہڈی میں کے درمیان پھنس گئے۔اب ان کا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔

حالیہ لکھنے والوں میں نیر مسعود نے خوابی عمل کی راہ کو مستحسن جانا ہے، ان کے فن کی پذیرائی بھی ہو رہی ہے اور خوب ہو رہی ہے،آنے والا وقت کیا کہے گا میں کچھ نہیں کہہ سکتا،لیکن عبدالصمد کا''بارہ رنگوں والا کمرہ''معلق ہو گیا۔اس حد تک خود افسانہ نگار اس کی از سر نو گرفت کرنا چاہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا جب جدیدیت کی روش ماند پڑی اور افسانے کا وقار خطرے میں ہے اس کا احساس ہو گیا تو ایک بار پھر افسانہ ترسیل کی ناکامی کا نوحہ نہیں رہا بلکہ اس کے آفاق پرانی جہت اپناتے ہوئے نئے پانیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔یہ بہت اہم بات ہوئی، تب افسانہ نگار عبدالصمد سماجی اور سیاسی احوال کی طرف مائل ہو گئے۔وہ سیاسی بازیگری کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہیں۔ان کے تجربے اور مشاہدے کے علاوہ ان کا علم بھی اسی شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔وہ پولیٹکل سائنس کے اچھے طالب علم رہے ہیں اور اسی علم کے پروفیسر بھی ہیں۔لہٰذا ان کی عقبی زمین میں سیاست اور رموز سیاست ہیں۔ان کے ناول کو الگ بھی رکھئے تو ان کے افسانوں میں ان کے اپنے تجربات و مشاہدات کی آنچ محسوس ہو گی اور انہیں بھی احساس ہو گا کہ وہ جب سیاسی تاؤ بھاؤ کے افسانے قلمبند کرتے ہیں تو علم سیاست کی دیوی پوری کی پوری ان کی گرفت میں ہوتی ہے۔ان کے افسانوں کے مختلف مجموعوں کے کئی افسانے میرے خیالات کی توثیق کریں گے۔

لیکن اپنی تمام تر موضوعاتی ترجیحات کے باوجود عبدالصمد کے افسانوی ذہن نے ایک اور کروٹ لی،یہ کروٹ انقلابی کہی جا سکتی ہے،اس لیے

کہ افسانوی مجموعہ ''آ گ کے اندر راکھ'' میں ایک نئے عبدالصمد سے ملاقات ہوتی ہے۔اس مجموعے میں حیرت انگیز طور پر وہ نئی جبلتوں کے افسانہ نگار ہیں، ایسی جبلتیں جو مسلسل سماج کے متعینہ قدروں سے ٹکراتی ہیں اور اپنی ہمہ گیری پر اصرار کرتی نظر آتی ہیں۔''آ گ کے اندر راکھ'' کے سبھی افسانے انسانی جبلتوں پر محیط ہیں۔یہ راہ تو نفسیاتی رخ رکھتی ہے۔ہمارے بڑے اور نامور افسانہ نگاروں کی عظمت کا باعث اسی قماش کے افسانے یا چند افسانے ہیں۔دور کیوں جایئے منٹو کی مثال سامنے ہے، جو قدروں سے مسلسل ٹکراتا رہتا ہے اور جبلتوں کی پیچیدہ شکلیں پیدا کرتا ہے۔مغرب میں اس فن کا مشہور فنکار ڈی ایچ لارنس ہے جس کے افسانے، ناولوں میں جبلتوں اور قدروں کا تصادم دیدنی ہے، جس کے فنی اسرار ورموز میں گہرے نفسیاتی مطالعے کی خبر ملتی ہے۔عبدالصمد کس طرح یہاں تک پہنچے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ مغرب کے بعض برگزیدہ افسانہ نگاروں کا مطالعہ کر رہے ہیں، نفسیات کی کتابوں سے اپنا رشتہ استوار کر رہے ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنی نگاہیں وا رکھی ہیں، جنس کے رموز کی آ گہی کے سفر پر نکل چکے ہیں، لہٰذا ان کی گرہ میں ان کے تجربے اور مشاہدے کے اظہار کے لیے علمی فضا بھی مہیا ہوگئی ہے۔میں عبدالصمد کی افسانہ نگاری پر کچھ نہیں لکھنا چاہتا تھا۔دراصل مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے افسانے ان کے ناولوں کی کڑی ہیں جن میں ان کے اپنے علمی گیان دھیان کی تکرار ہے۔لیکن جب میں نے ان کا یہ مجموعہ دیکھا اور مطالعہ کیا تو مجھ پر ایک نیا عالم خیال روشن ہوگیا۔محسوس ہوا کہ وہ ذہنی اور فنی ارتقاع کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ان کے یہاں زندگی کے جنسی احوال کے رمز کی تفہیم ہے جسے وہ موثر فنی طریقے پر افسانہ بنانے میں کامیاب ہیں۔

میں متعلقہ مجموعے کی پہلی کہانی ''جلی ہوئی کشتی کا سفر'' سے اپنا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔یہ ایک لڑکی چندا کی کہانی ہے جو اپنے گھر سے عین جوانی میں فرار ہو جاتی ہے، ماں باپ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئی، شاید گاؤں والے بھی لیکن وہ شہر سے اپنے گھر کی معاونت کرتی رہتی ہے۔مسلسل پیسے بھیجتی ہے۔اس طرح کہ اس کے والدین خوشگوار زندگی بسر کرنے لگتے ہیں لیکن وہ کسی کی کبھی بھی خیریت نہیں پوچھتی، مرنے جینے کی خبر نہیں لیتی، لیکن مالی معاونت جاری رہتی ہے۔وہ ایک عرصے کے بعد گھر لوٹ رہی تھی تو وہ بہت سے احساسات کے گرداب میں پھنستی چلی جاتی ہے، اب اس کا گاؤں خاصا بدل چکا ہوتا ہے۔اس کا اپنا گھر جو ہر طرح نیا ہوگیا ہے اس کا گھر نہیں لگتا۔نہ وہ لوگ، نہ وہ طور طریقے۔یکہ بان ضعیف بھڑکن دادا اسے پہچانتا نہیں لیکن گھر کا پتہ بتانے پر جب وہ شناخت کے احوال سے پردہ اٹھا دیتی ہے تو بھڑکن دادا کا رویہ یکسر بدل جاتا ہے۔پورے افسانے میں اس کی جنسی زندگی یا جنسی کاروبار پر ایک جملہ نہیں لیکن افسانے کا اندازِ بیان اور متون کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ شرح کی ضرورت نہیں ہوتی۔واپسی پر بوڑھے یکہ بان کا رویہ پھر اسے گزند پہنچاتا ہے اور آخرش وہ اپنی منزل پر رواں دواں ہو جاتی ہے۔یہ بھی چندا کے حقائق کی ایک سلائڈ ہے۔

افسانے میں جتنی کڑیا ہیں سب کی سب ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں لیکن چندا کی جبلت ایک خاص انداز سے کام کرتی ہوتی ہے اور قدروں کا ٹکراؤ از خود واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔خوشحال چندا بس ایک کمتر خاتون بن جاتی ہے۔یکہ بان کے علاوہ کسی اور سے اس کا واسطہ نہیں لیکن اس کو کیا کہے کہ گہری نفسیاتی کیفیت اس کو دبوچے رکھتی ہے۔اسی حد تک کہ وہ اپنی زندگی کی بے معنویت سے آشنا ہو جاتی ہے۔ایسی باتیں افسانہ نگار نہیں لکھتا، نہ ہی وہ کوئی ایسی پوزیشن پیدا کرتا ہے جس سے اس کی ہتک عزتی ہو رہی ہو۔بس ایک مثال بوڑھے یکہ بان کی ہے جس کی حیثیت مرکزی ہو جاتی ہے اور جس کے رویہ سے چندا کو اپنی حالیہ حیثیت کا عرفان مزید ہو جاتا ہے۔پورے افسانے میں یہ مذکور نہیں کہ چندا پیسے کس طرح کماتی ہے، شہری زندگی میں اس کے شب و روز کیا ہیں، اس کا کیا کاروبار ہے، کہیں کوئی وضاحت نہیں لیکن جہاں وہ اپنے احساسات کے گرد گھومتی ہے تو سارے احوال از خود روشن ہو جاتے ہیں۔یہ بڑی فنی چابکدستی کی بات ہے۔بیدی نے ''ٹرمینس سے پرے'' میں کہیں کوئی جنسی فعل کا ذکر نہیں کیا لیکن راکھی باندھنے والی غیر بہن کے تصورات عیاں ہو جاتے ہیں اور حاجت نہیں رہتی کہ افسانہ نگار کی طرف سے کوئی جنسی وضاحت سامنے آئے۔ایسی فنکارانہ روش عبدالصمد کے یہاں بھی ''جلی ہوئی کشتی کا سفر'' میں محسوس کی جا سکتی ہے۔اس افسانے کے متن سے چند سطور دیکھئے:

(ا) ''بھڑکن دادا کی بے نیازی اور اکھڑپن اپنی جگہ پر ہے۔اس نے پچھلی بار اس پر جو خشمگیں نگاہ ڈالی تھی، وہ ابھی تک اس کے پورے جسم میں سرسرا رہی تھی''

(۲) ''۔۔۔لیکن ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔یوں بھی اس کی کون سی خواہش پوری ہوئی ہے، وہ تو بے پایاں سمندر میں بہتا ہوا ایسا تنکا ہے جسے سمندر نے ابھی تک ڈبویا نہیں اور یوں بہتے رہنے میں اس کی اپنی مرضی کو دخل نہیں۔''

ایسے اشاراتی جملے افسانہ نگار کی فنی گرفت پر دال ہیں۔قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر عبدالصمد تفصیل میں جاتے اور مذکورہ لڑکی کے روز وشب کی تشریح کرتے تو پھر افسانے کا کیا حشر ہوتا۔۔۔واقعہ تو یہ ہے کہ چندا کا ہر جملہ متعینہ قدروں سے الجھ رہا ہے اور اس کی نفسیاتی گرہ کشائی بھی کر رہا ہے اور اس کی جبلت کا آئینہ بھی ہے۔وہ قدروں کا پاس رکھنا چاہتی ہے لیکن حالات قابو میں کہاں ہیں۔

اس افسانے کا عنوان بھی اس کے مرکزی تصور کی طرف لے جاتا ہے۔جلی ہوئی کشتی کیا ہے؟ یا کون ہے، کیا یہ چندا ہے یا اس کا جسم ہے، سفر کیسی معنویت رکھتا ہے۔گویا یہاں افسانہ نگار نے عنوان سے لے کر اختتام تک ایک فنی رمزیہ جہت برقرار رکھی ہے۔لیکن معنی ہے کہ ابلا پڑتا ہے، یہی اس افسانے کو اہم بنا رہا ہے۔ایک خاص تاثر سے قاری دوچار ہوتا ہے اور چندا کا المیہ اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

اسی مجموعے میں ایک افسانہ ''لمس'' ہے۔جب یہ افسانہ رسالے میں اشاعت پذیر ہوا تو اس کی خاص پذیرائی ہوئی۔لیکن میں نے اس کا تجزیہ کہیں

نہیں پڑھا، حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کا فنی اور تکنیکی جائزہ لیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے محتویات پر بھی نگاہ ڈالی جاتی۔ یوں تو کہانی خاصی واضح اور عمومی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی میں اتریئے تو ایک پوری نفسیاتی دنیا سامنے ہوتی ہے۔ قصہ بس اتنا ہے کہ ایک خاتون کبھی اپنے ایک دور کے رشتہ دار سے ٹیوشن لیتی تھی۔ کاغذ قلم کے لین دین میں انگلیاں ٹکرا جاتیں تو ہیروئن کے جذبات میں ایک خاص کیف پیدا ہو جاتا۔ یہ معمولی سالمس اسے جذبات کی لہروں میں دھکیل دیتا ہے۔ ایسے عوامل سے وہ ذہنی طور پر اس سے قریب ہوتی گئی، لیکن اسی دوران ایک دوسرے شخص سے اس کی شادی ہو جاتی ہے، تب لمس کی کہانی ادھوری رہ جاتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں اور رہتی ہے اور شب و روز یوں ہی گزرتے رہتے ہیں۔ اس کا شوہر خاصا محبت کرنے والا شخص ہے۔ اتنا مکمل کہ وہ کبھی کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس کا پرانا ٹیوٹر پڑوس کے مکان میں آ جاتا ہے، جہاں اس کی نئی ملازمت ہے۔ وہ اسے دیکھتی ہے اور اس کی پرانی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے گھر میں اس کا آنا جانا معمول بن جاتا ہے۔ وہ اپنے پرانے ٹیوٹر اور شوہر کے درمیان معلق نہیں ہوتی اور اچھی سی زندگی گزارتی ہوتی ہے۔ لیکن گاہے گاہے دل میں کوئی ایک ٹیس ابھرتی ہے جو دائمی نہیں ہوتی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک بار شہر ہی کے آٹو رکشہ کے سفر میں اس کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ یہ نا گہانی حادثے کے طور ہوتا ہے۔ اس کے اعضا ایک دوسرے سے مس کرتے ہیں۔ اس لمس کی اپنی معنویت ہو جاتی ہے۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رہتی۔ بھیڑ کے دنوں میں وہ ایک دن بس پر سوار ہوتی ہے تو اس کا ٹیوٹر اس کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے، جس کی خبر اسے بعد میں ہوتی ہے۔ چونکہ مسافروں کی بھیڑ ہے اس لیے لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ ایسے میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کے حصے میں کوئی چیز گڑ رہی ہے۔ یہ لمس کچھ شدید ہو جاتا ہے، پھر وہ بس سے اتر جاتی ہے اور ایک ناخوشگوار احساس اس کے دل میں جنم لے چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے لڑتی ہوتی ہے لیکن اس سنگین مرحلے کو فراموش نہیں کر رہی ہوتی۔ ایسے ہی عالم میں جب وہ اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو وہ دروازہ کھولتی نہیں ہے۔ وہ کئی بار دستک دیتا رہتا ہے لیکن یہ پتھر کی سل بنی رہتی ہے۔ آخرش وہ واپس ہو جاتا ہے اور پھر وہ ایک دم سے صوفے پر گر پڑتی ہے اور پھپک پھپک کر رونے لگتی ہے۔

کہانی کا ایسا انجام دراصل جبلتوں اور قدروں کا تصادم ہے۔ جبلت نزدیکی چاہتی ہے اور شاید لمس بھی، لیکن قدر اس عمل کو روکتی رہتی ہے۔ جنسی ہیجان پورے افسانے میں جاری و ساری رہتا ہے۔ طرفین کا Libido اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جنسی کیفیت ہے جو اوسط درجے کے لکھنے والوں کو قعرِ غلاظت میں ڈال سکتی ہے۔ لیکن یہاں عبدالصمد تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں برہنگی نہیں لیکن ہیجان ہے کہ پوری افسانوی فضا پر مسلط ہے۔ قدر اور جبلت کا یہ تصادم افسانہ نگار کا امتحان لیتا رہتا ہے اور فنکاری اسے تھامے رہتی ہے۔ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی ہیجان کی نمود کے لیے یہ کیف پیدا کر رہا ہے یا لمس کے ذریعہ خود اپنی کتھارسس سے گزر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ پذیرائی کی کئی منزلوں کو چھونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ایڈولسینٹ جذبات سے لے کر پختگی کی منزل تک جبلت اپنے طور پر رستہ ہموار کرتی رہتی ہے۔ لیکن تہذیب اس کے ہر قدم پر پہرہ بٹھاتی رہتی ہے۔ دراصل یہی تہذیب قدر ہے جو اس افسانے میں منہدم نہیں ہوتی اور دونوں تصادم کے بعد اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فنی رموز کا بھی افسانہ ہے اور حقیقت سے پرے بھی نہیں ہے۔ لمس کا یہ تجربہ نہ تو نیا ہے اور نہ ہی کسی مبہم جنسی کیف کا اشاریہ بلکہ ایک واضح جنسی فعل ہے۔ اس جنسی فعل کو حدود کے دائرے میں رکھنے کے لیے افسانے میں ایسے بیان کا سہارا لیا گیا ہے جو خود مکتفی ہے اور اپنے آپ میں مکمل ہے۔ میں ذیل میں اس افسانے کے چند سطور پیش کر رہا ہوں:

''ابھی ان جذبوں، لمس اور بے زبان کی زبان کو کوئی مفہوم عطا بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں معنی و مفہوم کی ایک بھری پری دنیا میں اتار دی گئی۔''

''عالم کے بھرپور لمس اور جذبات سے گرم سانسوں کے درمیان پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی کسی کونے سے اس کا چہرہ جھانک پڑتا۔ بس ایک جھلک اور پلک جھپکتے ہی غائب۔''

''دوسرے ہی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ خاموشی کا میرا یہ رو کہ عالم کے ساتھ میری وفاداری پر حرف لائے گا۔ دنیا کی نگاہوں نہ سہی، میری نگاہوں میں تو یقیناً''

''اُن کا تبادلہ اسی شہر میں ہو گیا تھا۔ وہ بغل کے فلیٹ میں کرایہ دار کی حیثیت سے آئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی اس لیے فلیٹ ایک رین بسیرا ہی تھا۔''

''ہاں ان کے ساتھ اتنی خصوصیت ضرور تھی کہ میں ان کے موہوم اور بظاہر محسوس نہ ہونے والے لمس سے واقف تھی۔ یہ لمس میری زندگی میں جھانک کر بہت دور چلا گیا تھا اور کبھی کبھی اس کی ایسی کمی محسوس ہوتی کہ اس وقت کوئی دوسری چیز اس کی بھرپائی کر نہیں پاتی تھی۔''

''میں نے ان کی پسند کا کھانا بنایا تھا، تہڑی، پنیر کا قورمہ، پودینے کی چٹنی اور رائتہ۔۔۔ کھانا دیکھ کر ایک جانا پہچانا سا رنگ ان کے چہرے پر آیا اور میری طرف نگاہیں اٹھ گئیں جن میں کوئی معنی خیزی تو نہیں تھی لیکن کچھ خاص بات تھی جو مجھے میرے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔''

''ان کے اترنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں لذت کے جھاگ سے باہر نکل آئی ہوں۔ میرے پورے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ نہیں تھے لیکن ان کا بھرپور لمس میرے احساس پر چھایا ہوا تھا''

''آج وہی شخص اس اطمینان سے میری پشت پر کھڑا ہے اسے بھیڑ اور دھکم پیل کی ذرا پروا نہیں اس کے چہرے پر گھبراہٹ، بوکھلاہٹ اور پشیمانی کے دور دور تک اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ وہ چاہتا تو مجھ سے الگ تھلگ بھی کھڑا رہ

سکتا تھا۔لیکن میری کمر پراس کا دباؤ اس کے اندر کے سارے راز افشا کر رہا ہے۔ وہ، وہ نہیں ہے جو تھا، میں نے اس کی جو تصویر بنائی تھی وہ غلط ثابت ہوئی آج اور ابھی وہ جو نظر آ رہا ہے، وہ صحیح ہے۔''

''دو تین روز کے بعد دروازے پر گھنٹی اچانک بج اٹھی۔ میں نے کھڑکی کی ہول سے جھانکا وہی تھے۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ گھنٹی پھر بجی۔ میں نے پھر دروازہ نہیں کھولا۔

گھنٹی بجتی چلی گئی۔

میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ تھک ہار کر گھنٹی بند ہو گئی۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں ایک دم صوفے پر گر پڑی اور پھپک پھپک کر رونے لگی۔۔۔روتی رہی۔۔۔''

ان اقتباسات سے افسانے کے پورے زیر و بم کا احاطہ ہو جاتا ہے۔اس لیے مزید تجزیے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خاتون کی یہ خفت، پشیمانی اور نفرت محض عارضی ہے اس لیے کہ آخری مرحلے میں اس کا والہانہ انداز (چاہے وہ رونے کا ہی عمل کیوں نہ ہو) اس کی قربت کی اساسی کیفیت کو واضح کر رہا ہے۔

عبدالصمد کا ایک افسانہ ''بن موسم برسات'' بھی توجہ چاہتا ہے۔ یہ تقریباً ۳۶ صفحات پر مشتمل افسانہ ہے یعنی طویل افسانہ ہے۔لیکن میں غایت اختصار کے ساتھ اس پر روشنی ڈالوں گا۔ آج کی زندگی میں یہ قصہ عام ہے کہ غریب اور مفلس لڑکیوں کو روزی روٹی یا کسی اور حیلے سے پھنسا کر اغوا کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔ اور وہ اسی سلسلے کے کاروبار سے وابستہ ہو کر زندگی گزارتی ہوتی ہیں۔ یہ سماج کا المیہ ہے۔اس میں لڑکی کی اپنی مرضی یا غرض کا دخل نہیں ہوتا۔ اگر صرف کہانی ''بن موسم برسات'' میں اتنا ہی کچھ ہوتا تو میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرتا۔لیکن اس کہانی کو تقویت دینے والی وہ ادھیڑ عمر کی خاتون ہے جسے روزی روٹی کی خاطر یا اس حیلے سے ایک ٹاؤٹ چنو ایک دوشیزہ کو لانے کی ترغیب دیتا ہے۔ خاتون ایک معصوم مگر خوبصورت لڑکی کے ساتھ ایک دوسرے شہر میں آ جاتی ہے۔ چنو وہاں موجود ہوتا ہے۔ وہ لڑکی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور اسے خود کو اپنا چچا باور کرواتا ہے۔ پھر وہ سب ایک ہوٹل میں لائے جاتے ہیں۔ چنو اپنے کاروباری سلسلے سے ہوٹل کے نواح میں خریداروں سے گفت و شنید کرتا ہوتا ہے اور پھر وہ اس ادھیڑ عورت کو کوئی مژدہ سناتا ہے کہ لڑکی تو خوش قسمتی سے پسند کر لی گئی۔ ساتھ ساتھ وہ بھی انتخاب میں آ گئی۔ اب اس خاتون کا اپنے بارے میں ہیجان بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور وہ اپنے جسم و جان کو ٹٹولنا شروع کر دیتی ہے۔ مٹتے ہوئے نقوش کی بازیافت کرتی ہے اور اپنے جسم و جان کی تر و تازگی کا غلط ہی سہی لیکن احساس کرتی ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنے انگ انگ کا حساب لینے لگتی ہے۔لیکن پولس کی بے وقت آمد اور ان دونوں کو چنو کے ذریعہ کہیں اور پہنچانے کی کوشش بارآور ہوتی ہے اور دونوں ہی لق و دق مکان میں آ جاتے ہیں جہاں خرید و فروخت کی مزید باتوں کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ تب خاتون کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے انتخاب کی خبر غلط تھی، چنو کی غلط بیانی تھی، معاملہ صرف لڑکی یعنی دوشیزہ کا تھا۔ وہ کسی شمار قطار میں نہیں تھی۔ تب اس ادھیڑ عمر عورت کو جال میں پھنسنے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور دونوں ہی وہاں سے بھاگ نکلتی ہیں۔

یہ تو افسانے کا کھر درا ڈھانچہ ہوا۔ اس تفصیلی افسانے میں بہت سے واقعات ایک دوسرے سے مربوط کر دئے گئے ہیں اور جگہ جگہ پر لڑکی کے حسن اور اس کی جسمانی کیفیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود لڑکی ایسے تمام عوامل سے بے خبر ہوتی ہے۔ اس کی جوانی اس پر مسلط نہیں۔ نہ ہی وہ کسی شدید جذبے سے گزرتی ہے۔ بس وہ ایک بے جان سی مشین ہو کر گزرتے ہوئے واقعات سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ افسانے میں جان وہاں آ گئی ہے جہاں ادھیڑ عمر اپنا جسمانی احتساب کرنے لگتی ہے۔ حالانکہ اس کے سامنے جوان دوشیزہ اپنی تر و تازگی کے ساتھ موجود ہے۔لیکن اسے کیا کہا جائے کہ عورت کے بہت سے ہیجان میں اس کے اپنے جسم کی بناوٹ کا عرفان بھی ہوتا ہے اور یہ عرفان شاید کبھی مندمل نہیں ہوتا ہے، معدوم نہیں ہوتا۔ گاہے گاہے احساسات میں تندی اور تیزی آتی رہتی ہے۔ گویا وہ ادھیڑ عمر کا جنسی ہیجان افسانے کے قوام کو شدید بنا دیتا ہے اور سماجی المیے کی یہ کہانی ادھیڑ عمر کی عورت کی شباب آفریں کیفیات کا اعلانیہ اور پھر نوحہ بن جاتی ہے۔ دراصل اس کہانی میں نہ تو نسلی اور اجتماعی لاشعور کے عناصر کو بروئے کار لایا گیا ہے اور نہ ہی لڑکی کے اپنے جنسی رویے کی کسی شناخت کو ہوا دی گئی ہے۔ بقیہ باتیں تو وہ ہیں جو سماجی ناہمواریوں سے عبارت ہیں۔ پھر بھی یہ کہانی ایک خاص انداز سے فرائڈین بن جاتی ہے۔ اور وجہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یہاں حالات اور جنس میں ایک طرح کے اتحاد کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ قصہ عمومی نوعیت کی عصمت فروشی کے سلسلے سے آگے بڑھ جاتا ہے اور گزرتی ہوئی عمر کی خواتین کے احساسات جسمانی کی وضاحت بھی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں افسانہ نگار عمومی نوعیت کی کڈنیپنگ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے یہاں بائنری افتراق کی نوعیت ابھرتی ہے۔ اسی لیے یہ متعلقہ قصہ ضمنی مرکزی بن جاتا ہے۔ میں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا۔ اس اقتباس کو درج کرنے کے بعد ضروری نہیں کہ میں اس پر گفتگو کروں:

''ایسے میں بالکل غیر متوقع طور پر اچانک جیسے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ وہ بستر پر بے سدھ پڑی لڑکی کو نظر بھر کے دیکھتی ہے۔ اٹھارہ انیس سال کی الڑھ دوشیزہ کس بے ترتیبی سے کہاں کھوئی ہوئی ہے، اسے اپنی کوئی سدھ بدھ نہیں۔ اس کے گداز، تر و تازہ مٹی کے کورے برتن جیسے بدن میں مقید سینے کے زیر و بم سے سانس کی لرزشیں یوں ابھر اور ڈوب رہی ہیں کہ جیسے کسی شانت سمندر میں ایک سہما سہما تلاطم سا آ رہا ہو۔ جسم کے اعضا یوں بکھر گئے ہیں جیسے کسی ماہر بت تراش نے انہیں بنا کر اس لیے رکھ چھوڑا ہو کہ کبھی فرصت کے اوقات میں انہیں مناسب ڈھنگ سے جوڑے گا۔ چہرے پر جوانی سرخیوں کی اس قدر شدت ہے کہ ان میں مستقبل کے فکر کی پرچھائیاں کھو سی گئی ہیں۔ وہ اس قدر مطمئن اور

اعتماد بھرے انداز میں سوئی ہے جیسے صبح اس کی ہوگی۔۔۔صرف اس کی۔

عورت اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔

یہ کیا۔۔۔؟

کیا یہ وہی ہے۔۔۔؟

کچھ دیر پہلے بھی آئینے پر اس کی نظر پڑی تھی، اپنے تازہ پر اس نے اجنبی نگاہیں ڈالی تھیں۔اوران سے سرسری گزر گئی تھی۔لیکن اس وقت تو۔۔۔

اس وقت تو آئینہ کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔

کوئی اور چہرہ۔۔۔کوئی اور ہی جسم۔

اس چہرے پر شادابی ہے، اس جسم میں رعنائی ہے۔

نوکیلا پن۔۔۔لوچ پن۔۔۔اپنا پن۔۔۔

اجنبی دنیا کی خوشبوئیں نا تمام سمتوں سے آ رہی ہیں۔اسے پسند کیا گیا ہے۔

غیر ملکوں سے آنے والے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے، ٹھوک بجا کے دام لگانے والے۔۔۔

انہوں نے اسے پسند کیا ہے۔"

"آئینے کے سامنے سرتا پا برہنہ کھڑا ہونے کا اس کا تجربہ بالکل انوکھا ہے۔قد آدم آئینہ اس نے آج سے پہلے دیکھا ہی کہاں تھا۔

برسہا برس سے آئینے کا ایک چھوٹا سا بھدا ٹکڑا طاق پر دھرا رہتا جس میں شکل دیکھنے کی خواہش بھی نہ ہوتی، صرف بہ وقت ضرورت رونی صورت کو کسی طرح ہنستا بنانے کے لیے۔

ہفتوں آئینہ دیکھے بغیر گزر جاتے کہ ہنستی صورت کی کوئی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی۔

لیکن آج۔۔۔

آج تو آئینے نے اپنے معنی ہی بدل ڈالے ہیں۔آج ہی انکشاف ہوا کہ آئینے میں شکل نہیں، جسم بھی دیکھے جاتے ہیں۔بلکہ شاید۔۔۔جسم ہی دیکھے جاتے ہیں۔

خوبصورت جسم۔۔۔

جیسے اس کا جسم۔۔۔

اس نے پہلی بار اپنے جسم کے حصوں کو اس قدر دلچسپی سے دیکھا ہے۔اس کے اندر ایک عجیب قسم کی خوشی پیدا ہوئی ہے۔

لہراتے ہوئے بال۔۔۔

صراحی دار گردن۔۔۔

جاذب نظر چہرہ۔۔۔

سینے کی گداز گولائیاں۔۔۔

بل کھاتی ہوئی کمر۔۔۔

سر سے پیر تک بھرپور بدن۔۔۔

وہ ساری چیزیں جو اس لڑکی کے پاس ہیں اس کے پاس بھی ہیں بلکہ ابھی ابھی اس کے پائی آئی ہیں۔اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے وجود کی کتاب ابھی ابھی کھلی ہے اور جاہل ہونے کے باوجود وہ اسے فر فر پڑھ رہی ہے۔اس کا جی نہیں چاہتا کہ یہ کتاب کبھی ختم ہو۔"

یہ ہے اس ادھیڑ عمر کا المیہ جو کبھی شوہر رکھتی تھی، روکھا پھیکا سا، اسے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی۔چنو کے جھوٹ اور مغالطے سے اس کی حسیات کا تحرک لازمی عنصر کی طرح سامنے آتا ہے اور ایک عورت کی ازلی جبلت کا راز فاش کرتا ہے۔

"آگ کے اندر راکھ" ایک قیمتی افسانہ ہے۔جس کے تانے بانے عمومی نہیں، موضوع بھی نیا ہے اور برتاؤ میں فن کاری کا احساس کیا جا سکتا ہے۔وہ ایک دوشیزہ ہے لیکن ایک مالدار بے حس۔۔۔، خوبصورت اور دلکش اعضا کے مرد کی دیکھ ریکھ پر متعین ہے جس کے لیے اسے اچھی خاصی رقم ملتی رہی ہے۔بھرے پرے مرد کی بے حسی، مردنی کی کیفیت، اعضا کے تعطل اس دوشیزہ کے احساسات نہیں چھین سکتے کہ وہ کنواری ہے۔لیکن اسے مرد متعلقہ کی دیکھ ریکھ صرف بالائی سطح تک محدود نہیں بلکہ اس کے جسم کی تمام تر غلاظت کی صفائی اس کے ذمہ ہے۔بول و براز سے آگے عضویات کی صفائی بھی اس کے ذمہ ہے۔اس کی حسیات ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور جب مرد مذکور کے پلنگ سے گر جانے کے بعد اس کے ساتھ اسے سونا بھی پڑتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک مرد کے ساتھ شب گزار رہی ہے۔حالانکہ وہ بے حس ہے پھر بھی اس کے جسم کا لمس اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے، اور جب ایک شب اس کا ایک ہاتھ اس کے سینے پر پڑ جاتا ہے تو جبلی صورت بیدار ہو کر ہاتھ کے آگے بڑھ جانے کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ ہاتھ ہٹاتی ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک مردہ جسم کے لمس سے آشنا ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی جس کا گہرا زخم اس کی شخصیت پر لگتا ہے۔جس زخم سے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔

منٹو کے افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں مردہ جسم سے وصال ایشر سنگھ کو نامرد بنا دیتی ہے۔یہاں بے حس مرد کے ساتھ دوشیزہ کا رویہ اتنا ہی پُر تاثیر ہو کر سامنے آتا ہے۔کہہ سکتے ہیں مرد اور عورت کی ازلی جبلت کا افسانہ قدروں سے تکرار رہا ہے اور اپنی عظمت کے نقوش پڑھنے والوں کے ذہن پر مرتسم کر رہا ہے۔متعلقہ افسانے کے بارہ حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں، جو الگ نہیں کئے جا سکے، آخری حصے کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں اب وہ نہیں رہی جو تھی۔میرے جسم میں لاتعداد سوئیاں چبھو دی جائیں تب بھی کچھ فرق نہیں پڑنے والا۔۔۔میرے جسم کے اندر تیز کرنٹ دوڑا دی جائے تب بھی وہ چیز نہیں ہو سکتی جو میری اپنی تھی۔

اس احساس نے کہ ایک مردہ کے لمس سے میں حظ اٹھاتی رہی، قیامت تک کے لیے مجھے مار دیا ہے۔اس مردے کے ساتھ میری تمام چیزیں جل چکیں اوراب جو کچھ بھی باقی ہے، وہ بھی شمشان گھاٹ جانے کو تیار۔

اگر میں زندہ ہوں تو مردہ سے بھی بدتر۔۔۔

مردہ ہوں تو زندوں سے میرا کیا کام۔۔۔

میرے اندر جو زبردست جنگ چل رہی تھی اور ہر بار میں یہ سمجھتی رہی کہ جنگ میں نے جیت لی ہے تو یہ میرا بھرم تھا، دراصل تمام جنگیں میں ہارتی رہی تھی، سارے محاذ پر میں ہار گئی۔۔۔اب کیسے جیوں، کہاں سے جیوں۔۔۔؟

ایک شکست خوردہ کو وہ سنگھاسن پر بٹھانا چاہتے ہیں، اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ۔۔۔''

ایسے اختتامیہ جملے دوشیزہ کے خوابوں اور خیالوں کو جس طرح پیش کر رہے ہیں وہ افسانوی فن کی عظمت پر دال ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ عبدالصمد اپنے افسانوی فن میں ایسے طاق ہیں کہ بڑی سے بڑی باتیں چند سطروں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ جبلت اور قدر کا مسئلہ اس افسانے کی اساس ہے۔

فرائیڈینLibido کا ایک دلچسپ افسانہ ''نجات'' بھی ہے۔ اکثر ٹیلی ویژن پر غربا کے یہاں بھائی بہن کے جنسی تعلق کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ایک بار میں نے ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام دیکھا تھا جس میں مختلف طبقے کی لڑکیاں جمع کی گئی تھیں اور جن کا کنفیشن یہ تھا کہ ان کے جنسی تعلقات اپنے بھائی سے رہے ہیں۔ وجہ پوچھی گئی تو جواب تھا ایک کمرے ایک چوکی پر سونے کے باعث نیند میں بعض مرحلے فطری طور پر گزر گئے۔ پھر یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ افسانہ ''نجات'' میں اگر صرف اس طرح کےSterio Type قصے کا بیان ہوتا تو چاہے وہ کتنا بھی سنجیدہ ہوتا، اس میں فنی بالیدگی نہیں ہوتی۔لیکن حالات بالکل فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''نجات'' میں ایک گھر کا قصہ قلم بند ہوا ہے۔اس طرح کہ ایک بیحد غریب شخص کی چار بہنیں ہیں اور تین بھائی۔ سب کی عمر ایک دو سال آگے پیچھے ہے، لیکن کمرہ ایک ہی ہے جس میں ان ساتوں افراد کو رہنا ہے۔ شب بھی اسی طرح اسی کمرے میں گزارنا ہے۔ ان سات بچوں میں ان کے ماں باپ بھی ہیں۔ ایک چوکی ہے جس پر باپ اپنی راتیں گزارتا ہے لیکن باپ بیوی کے ساتھ وقفے وقفے سے ازدواجی مرحلے سے گزرتا ہوتا ہے۔ لڑکیاں بظاہر سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کی نظریں کچھ اسی طرف لگی رہتی ہیں اور ماں باپ کی حرکتوں سے ان کے ہیجان پیدا ہوتا رہتا ہے۔ چار میں کم از کم دو لڑکیاں ایسی ہیں جن کی نظریں ماں باپ کے خفیہ معاملات پر رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں اس مرحلے سے آگے بھائیوں کا قصہ ہے جو غلط قسم کے کپڑوں میں ملبوس سوئے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی برہنگی سے جو پہلو سامنے آتا ہے ان سے بھی یہ لڑکیاں متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں جو سب سے بڑی ہے وہ ان کی ستر پوشی بھی وقتاً فوقتاً کرتی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ لڑکیوں کا ہیجان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ محلے کے لڑکے بھی اب دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ گویا ایسے ہی مرحلے میں یہ کہانی انجام کو پہنچتی ہے۔ دراصل یہاں دو بہنوں کے جنسی ہیجان کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے جو نہ صرف موثر ہے بلکہ حالات کے جبر سے جو صورت پیدا ہوتی ہے اس کی عین عکاسی ہے۔ جنسی مرحلے میں جبلت کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور یہ جبلت اس وقت اور تیز ہو جاتی ہے جب بعض داخلی اور سری احوال منظر بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ تب تحرک کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے اور اس تحرک میں قدر مسمار ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے جسم کے بعض تقاضے لبالب ہوتے ہیں اور اپنا ظرف توڑنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت واقع سے نجات آسان نہیں۔ چنانچہ یہ صورت واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ بس ایک بیان کنواری لڑکی کا:

''میں چاہتی ہوں جو چیز میرے اندر لبالب بھری گئی ہے اس کا کسی طور اظہار تو ہو، لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ یہ احساس مجھے ایک عجیب ڈھنگ سے جکڑتا جارہا ہے۔ پہلے میں اس سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش بھی کرتی تھی، اب اسی میں ایک راحت سی محسوس کرنے لگی ہوں بلکہ کبھی کبھی تو یہ میرے لیے جائے اماں بھی بن جاتی ہے۔ یہ جکڑن مجھے اتنی زور سے بھینچ لے، کس کے کہ میری ہڈیاں بھی چیخ اٹھیں۔۔۔میرا حال جو ہو سو ہو، میں اپنے آپ میں سمٹی تو رہوں گی۔۔۔ میں بکھرتی جارہی ہوں۔ اپنے آپ پر میرا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔کوئی انجانا ہاتھ بہت بے رحمی سے مجھے دور دور تک بکھیر جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو چن کر ایک جگہ جمع بھی نہیں کر سکتی۔ یہ صورت حال میرے لیے خاصی پریشان کن ہے۔

اگر کوئی مجھے مٹھی بھر کے اٹھالے تو نہ صرف میں خوش خوش اس میں سمٹ جاؤں بلکہ شاید میری الجھن اور تکلیف بھی دور ہو جائے۔ میرے کم سن جسم میں جو جوان بدن بند ہو گیا ہے، اس نے مجھے اندر اندر دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے اور دونوں حصے الگ الگ سمتوں میں بھاگے جارہے ہیں، یہ سلسلہ رکنے والا دکھائی نہیں دیتا۔۔۔شاید یہ چلتا ہی رہے گا، جب تک واقعی کوئی مضبوط مٹھی دونوں حصوں کو ایک ساتھ جکڑ نہیں لیتی۔''

یہاں چھوٹی زیادہ چونچال ہے، بڑی قدرے گھمبیر ہے لیکن دونوں کے جذبات ایک جیسے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ باپ اور ماں کے جنسی روابط نے پورے گھر میں ایک ایسی صورت اپنالی ہے جو ناگزیر بھی ہے اور عین حالات کے تقاضے کے تحت ہے۔ چنانچہ جو نتائج سامنے آئے ہیں ان میں کہیں نجات نہیں۔ لڑکیاں ہمیشہ ایسے جبر کے تابع رہیں گی جن سے نجات کے لیے بس ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ متعینہ قدروں کو مسمار کریں اور یہی ہوتا بھی ہے۔ گویا یہاں افسانہ نگار حالات کے جبر اور جنسی ہم آہنگی میں ایک خاص ربط قائم کر رہا ہے۔ جس میں Libido کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے اور فرائیڈین تصورات کو مہمیز لگتی ہے شاید لاکاں بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہے جس نے تمام عمر فرائڈ کی تفہیم میں گزار دی اور ایک خاص مرحلے میں نفسیات کی گتھیوں سے الجھ گیا۔ لیکن نفسی اور جنسی کیفیت ایسے ہی

طورطریقے سے عبارت ہے جس کا ایک تخلیقی ثبوت 'نجات'' ہے۔

''سنگ مرمر کا رنگ'' عبدالصمد کی ایک اور غیر معمولی کہانی ہے، جس میں آئیسولیشن کے Fixation کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔ لڑکی لڑکے سے قدرے زیادہ اونچی ہے۔ دونوں میں پھوپھی زاد بھائی بہن کا رشتہ ہے یہ رشتہ اپنی جگہ پر محترم رہتا ہے، لیکن حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ دونوں کی قربت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ قربت کسی منزل تک نہیں پہنچاتی لیکن لڑکی کی بھابھی لڑکے کے جذبات کو مہمیز کرتی رہتی ہے۔ اس طرح کہ دونوں کا ملنا جلنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ کئی طرح کے تلخ واقعات ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں لیکن ہیجان کو کوئی سمت نہیں ملتی۔ یہ کیسا ہیجان ہے کم از کم لڑکا اس سے واقف نہیں۔ آخرش دونوں جوان ہو جاتے ہیں، لڑکی کی شادی ہونے لگتی ہے، لڑکا انجینئرنگ کی پڑھائی میں لگا ہوتا ہے لیکن شادی کے موقع پر اسے ملنے کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے اور یہ اعمل سرزد بھی ہوتا ہے لیکن لڑکے کے ایک جملے سے:

''۔۔۔اور میں وہاں دیر تک کھڑا اس خوشبو کو اپنے نتھنوں میں بھرنے کی کوشش کرتا رہا جس کے دوش پر ہوا کے جھونکے کی طرح وہ گزر گئی تھی، کبھی واپس نہیں آنے کے لیے''

اس کے ہیجان میں اضافہ ہوتا ہے اور کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

دراصل اس کہانی کی بناوٹ میں بچے کے جذبات کی عکاسی جس طرح کی گئی ہے وہ بیحد پر معنی ہے۔ مبہم بے سمتی کا جو رول ہونا چاہیے وہ اپنی جگہ پر ہوتا ہے اور کہانی کے ضمنی واقعات تاثر کی کیفیت کو مزید غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ عبدالصمد جانتے ہیں کہ کیسے واقعے کی شدت کس طرح پیدا کی جاتی ہے۔ ان کی تخلیقی روش جلا پا چکی ہے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ایک واضح سمت حاصل ہو چکی ہے۔ اس لیے Fixation کی یہ کہانی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

بہر طور مجھے اس کا احساس ہے کہ میں عبدالصمد کے تمام افسانے کی کیفیات کو نظر میں نہیں رکھ سکا۔ نہ ہی بعض دوسرے اہم افسانوں کا تجزیہ کر سکا، لیکن جن چند افسانوں پر میں نے نگاہ ڈالی ہے وہ ان کے انقلابی شعور کا پتہ دیتے ہیں اور یہ انقلاب عمومی، سماجی اور سیاسی احوال سے الگ جنسی کیف وکم سے عبارت ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے یہ نئی راہ ہے۔ یہ راہ یقیناً دشوار گزار بھی ہے۔ لیکن چند افسانے ہی جو میرے تجزیے میں آئے ہیں وہ ان کی فنی گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔ واقعات کے ربط، پھر ان کے ارتقائی مدارج کی پیوستگی اور اسلوب کا کیف سبھی مرحلوں سے وہ ایک چابکدست فنکار کی طرح گزرتے نظر آتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا افسانوی سفر پہلی صف کے افسانہ نگاروں کی طرف ہے اور یہ ایک خوش آگیں امر ہے۔

''بے باک ناول نگار''

کئی دوسرے دانشوروں اور سماجی مفکّروں کی طرح عبدالصمد کو بھی یہ احساس رہا ہے کہ سیاست اب ہماری زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''آج کی زندگی میں سیاسی عوامل کا بہت گہرا دخل ہے کیوں کہ اب یہ ایوانوں اور قصروں میں مقید نہیں رہی۔ ہر وہ سانس جو انسان کے اندر جاتی ہے اور ہر وہ سانس جو اندر سے باہر آتی ہے، سیاسی عوامل سے متاثر ہے۔۔۔ سیاست نے آج ہم کو چاروں طرف سے یوں حصار میں لے لیا ہے کہ ہم اس سے بھاگنا بھی چاہیں تو نہیں بھاگ سکتے۔۔۔''

خیر، یہ تو ایک ایسی سچائی ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ مگر تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیاست کی یہ حکمرانی جن پستیوں کی طرف لے جا رہی ہے، ان سے چشم پوشی ہماری عادت بن چکی ہے۔

ان امور کو سامنے رکھ کر عبدالصمد کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ تقسیمِ ہند سے لے کر آج ہندوستانی سیاست کے مختلف پہلوؤں سے خاصی بے باکی کے ساتھ آنکھیں چار کرتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول ''دوگز زمین'' کو دیکھئے۔ اس کا قصّہ تقسیمِ ہند کے چند برسوں قبل سے شروع ہو کر بنگلہ دیش کے قیام تک پھیلا ہوا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی تلخ نوا سیاست، فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ووٹ کا Polarisation اور اس کے نتائج، ملک کی آزادی اور اس کے بعد آزاد ہندوستان کے سیکولر لیڈروں کی بدمستی، نیشنلسٹ مسلمانوں کی ناقدری، زمینداری کا خاتمہ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی مالی بدحالی، سیاسی رہنماؤں کی مفاد پرست سیاست اور لوٹ کھسوٹ کے سبب روز افزوں بے روزگاری، اس کے سبب عام لوگوں کی دیہاتوں سے شہر کی طرف اور مسلمانوں کی مشرقی یا مغربی پاکستان کی طرف ہجرت، پھر بنگلہ دیش کا قیام اور قتل وغارت گری، ہندوستان میں ایمرجنسی کا نفاذ اور کانگریس کی شکست، پاکستان میں مہاجرین کی درگت اور تلاشِ رزق میں عرب ملکوں کی طرف روانگی، یہی وہ بنیادی موضوعات ہیں جو اس ناول کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور ان واقعات میں صداقت اس قدر ہے کہ خیال آفرینی کا کہیں گزر نہیں۔

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

باریابی تمنا کی

شافع قدوائی

(بھارت)

ازلی خواہش اور دیرینہ تمنا کی باریابی کے امکانات کس طرح انسان میں شکست اور ہزیمت کے مسلسل اور جاں گسل احساسات کے داعیوں کو متحرک کرتے ہیں اور تخلیقی نابغہ (Creative Genius) کس طرح فہم عامہ سے غذا حاصل کرنے والے مانوس اور مقبول تصورات کی بے بضاعتی اور بے مائیگی کو خاطر نشان کرتا ہے، اس کے سب سے بہتر اور موثر اظہار کا وسیلہ ناول ہے۔ ادب کی مقبول صنف ناول انسانی وجود کے سروکاروں کے مضمر تناقفات اور تضادات کے مسرت آگیں اور اطمینان بخش ازالہ کے ڈسکورس کو قائم نہیں کرتا بلکہ اظہار، نقطہ نظر، کرداروں کے داخلی ارتکاز اور ان کے افعال و اعمال کی نمائندگی کے مختلف طریقوں اور تہذیبی مظاہر اور جذباتی وابستگی کو Domesticate کرنے کے پورے عمل کو Subvert بھی کرتا ہے۔ فن پارہ میں زبان کے حوالے سے خلق پذیر حقیقت یہ باور کراتی ہے کہ انسانی زندگی کسی ایک مرکزی اصول کے تابع ہونے کی شعوری کوشش کے باوجود اصلاً پسندیدہ اور مقبول تصورات کی مسلسل شکست کے محور پر گردش کرتی ہے، گو کہ اس کا احساس عام نہیں ہوتا۔ انسان اپنی لسانی اور ثقافتی آرزومندیوں کے حصول کے لیے زبان کے توسط سے ایک ایسا بیانیہ خلق کرتا ہے جسے وہ حقیقت یا سچائی کا نام دیتا ہے، جو اپنی اصل میں بے وجود ہوتی ہے۔ کارزار حیات کو اس نوع کے بیانیہ عرصہ (Narrative Space) پر اولاً قائم کرنے اور پھر اس کی خود شکستگی (Self Collapsing) کے عناصر کو فنی شعور کے ساتھ متحرک کرنا فن کا معجزہ گردانا جاتا ہے جسے ژاں زینے نے Heterodiegetic Narration سے تعبیر کیا ہے۔ اس نوع کا بیانیہ واقعہ Fabula اور پلاٹ (Sjuzet) کی مسلسل آویزش کے حوالے سے مرتب اور متشکل ہوتا ہے۔ اردو میں اس نوع کے تخلیقی اور کثیر حسی بیانیہ کی سب سے بہتر اور خیال انگیز مثال عبد الصمد کا چھٹا ناول ''شکست کی آواز'' ہے، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ ناول عبد الصمد کے سب سے مشہور ناول ''دوگز زمین'' سے جو اصلاً حاوی ڈسکورس کے مقابلہ میں ثقافتی خلقیہ (Petile) قائم کرنے کی روش کا غماز ہے، موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر یکسر مختلف ہے۔

عبد الصمد نے اپنے اس ناول میں تخلیقی انفرادیت اور فنی اظہار کے یکسر نئے ابعاد ہویدا کیے ہیں۔ ناول نگار نے تقریباً چار سو صفحات کو محیط اس ناول میں ایک مانوس انسانی تجربہ کے شکست ہوتے بیانیہ کو انسان کے ایک خلقی Doxa کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ندیم اوائل عمری میں اپنی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کی سرشاری کے لمحات میں ایک شدید قسم کی شکست خوردگی کا احساس کرتا ہے اور ناول نگار نے مرکزی کردار کے اعمال سے یہ باور کرایا ہے کہ انسان کی شکست اور زوال کا بنیادی سبب خارج میں وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ انسان جب اپنی آرزومندی کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اصلاً اپنی شکست کی داستان رقم کرتا ہے۔ مرکزی کردار اپنے گھر کی پروردہ لڑکی نوری کی شدید آرزو رکھتا ہے اور اسے برہنہ دیکھنے کی تمنا اسے غسل خانے کے ایک چھوٹے سے سوراخ پر نظریں گاڑنے پر مجبور کرتی ہے تاہم اس کے اور نوری کے درمیان ایک نہ دکھائی دینے والا پردہ جب ہٹ جاتا ہے تو اسی لمحے اسے اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے، یعنی خواہش کی تکمیل ہی انسان کی موت کا علامیہ ہے اور اگر کوئی اس عمل میں سرگرم طریقے سے شریک ہو جائے تو پھر احساس شکست دو چند ہو جاتا ہے۔ ندیم غسل خانے کے سوراخ سے دعوت نظارہ میں مشغول تھا:

''اندر نوری دھیرے دھیرے کپڑے اتار رہی تھی۔ اس نے ایک دوپٹے کو سینے سے کولہے تک باندھ لیا اور نل کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہاں نل سے بے تحاشہ پانی نکل رہا تھا اور ادھر اس کے حلق کا پانی ایک دم سوکھ گیا تھا۔ بدن میں جیسے ہلچل سی مچ گئی، آنکھیں جیسے اپنے آپ بند ہونے لگیں حالانکہ وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیدار یار میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک کسی نے اس کو دبوچ لیا، بجلی کی سرعت سے وہ پلٹا تو نوری اس کو پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں پر اسرار چمک۔۔۔ وہ جیسے نکیل سے بندھا، سحر زدہ سا اس کے ساتھ بڑھتا گیا، نوری اس کو کھینچ کر غسل خانے میں لے آئی، پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر اس کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔ لو بابو دیکھ لو کیا دیکھنا چاہتے ہو، جی بھر کے دیکھ لو۔''

جذباتی خروش سے آباد بصری تجربہ کو Relive کرنے کی کوشش سرشاری اور جمالیاتی اہتزاز کے بجائے مرکزی کردار کو احساس شکست خوردگی سے دوچار کرتی ہے:

''وہ بارہا سوچتا نوری کو آخر اس دن کیا سوجھی؟ اسے یہ سوچ کر ایک لطیف سہرن بھی ہوتی کہ نوری کا تقریباً عریاں جسم اس کی نگاہوں کے بالکل سامنے تھا، پھر اسے یاد آ جاتا کہ نوری نے اس کو چوری چوری جھانکتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور اسے گھسیٹتے ہوئے غسل خانے میں لے آئی تھی، تو وہ احساس شکست خوردگی سے نیم جاں سا ہو جاتا۔''

مرکزی کردار اس تجربے کی باز آفرینی سے لذت کشید کرنے کی بجائے ان لمحات کو اپنی شکست کا اعلامیہ سمجھتا رہا اور جب نوری جس نے عورت ہونے کے باوجود پیش قدمی میں پہل کی تھی، گرم جوشی کا اظہار کرتی ہے تو پھر احساس شکست خوردگی کا زخم ہرا ہو جاتا:

''اس وقت اس کی حالت اور بھی غیر ہو جاتی جب نوری خواہ مخواہ ٹکرانے اور مس ہونے کی کوشش کرتی۔ اس کے بدن میں شاید بجلی کا تیز کرنٹ تھا

کہ مس ہوتے ہی ندیم کے جسم میں جھن جھنی سی دوڑ جاتی مگر اس طرح اس کی شکست کا احساس ہرا ہو جاتا۔''

مرکزی کردار ندیم جو عین لحہ سرشاری میں شکست کے جس شدید حسی تجربہ سے دوچار ہوا تھا اسے ذہن سے محو نہ کر سکا اور جب ندیم کے اولین Mentor ماسٹر صاحب نے نوری کے بدن کے پیغام کو Decode کر لیا تو پھر شکست کا احساس مزید گہرا ہو گیا۔عنوان ''شکست کی آواز'' اور ابتدائی ۳۰ صفحات ناول کے Kernel Point کو خاطر نشان کرتے ہیں، یعنی لذت یکجائی کے امکانات کی بیش از بیش موجودگی میں ہجر کو ترجیح دینے کی روش اور پھر اسے اپنی شکست کا اساسی حوالہ قرار دینے کے عمل کو فنکارانہ شعور کے ساتھ قائم کر کے ''شکست کی آواز'' کو ایک پیچیدہ اور گہرے حسی تجربے کے طور پر پیش کرتی ہے۔

ناول کے مرکزی کردار ندیم میں نوری کے بعد اختری کے تئیں Infatuation کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ سعی پیہم اور طویل انتظار کے بعد اس کے تقریباً نیم برہنہ جسم کو چھپ کر دیکھ لیتا ہے تاہم لذت دید قلب ماہیت پر منتج ہوتی ہے جو اصلاً تمنا کی تکمیل میں مضمر شکست اور پسپائی کی ایک شکل ہے۔

''ندیم یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ جو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے اس سے کون سا لطف حاصل ہو رہا ہے؟ کیا وہ اسی لطف کے لیے اتنے دنوں سے بے چین تھا؟۔۔۔ندیم کو محسوس ہوا کہ وہ بہت اونچائی سے اچانک نیچے آ گیا۔ یہ اونچائی اس کی خود تعمیر کردہ تھی اس لیے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی، البتہ وہ ایک بالکل اجنبی دنیا میں پہنچ گیا۔وہ یکلخت ان تمام دنیاؤں سے باہر نکل آیا جن میں وہ ابھی تک رہتا تھا اور یہ دنیا تو اس کی بالکل نئی تھی۔اس میں اختری تو موجود تھی لیکن وہ اختری ہرگز نہیں تھی جو اس کی تصوراتی دنیا میں چھائی ہوئی تھی۔''

اسی طرح ناظمہ، جولی اور روزی سے ملاقات کے دوران بھی وہ اسی قسم کے احساسات کی آگ میں جھلستا رہا اور لذت کا ہر لمحہ اسے اپنی شکست کا ایک اور مرحلہ نظر آتا رہا۔ناول میں خواتین کی پیش قدمی کا فنی رویہ خلق کیا گیا ہے اور یہ باور کرایا گیا ہے کہ تعلق کی پیشکش کی نفی دراصل اپنے ہاتھوں اپنی شکست اور ہزیمت کا نظارہ کرنا ہے۔اپنی ذات میں گم انسان اکثر Sharing گریزاں رہتا ہے اور اس لحاظ سے وہ خود اپنی انا کا اسیر ہوتا ہے۔اس تاثر کو مرکزی کردار کی ذہنی کیفیت منکشف کرتی ہے:

''اور اس دن۔۔۔اس دن بھی قصور کس کا تھا، وہی تو دوڑ کر غسل خانہ تک گیا تھا اور بڑے جتن سے اس سوراخ کو دریافت کیا تھا جس نے اس کے سامنے کی ساری بند کھڑکیوں کو کھول دیا تھا اور اس میں سے خوشبودار ہوائیں آ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔

اتنا کچھ ہونے کے بعد وہ اپنی ہی تعمیر کردہ لوہے کی دیواروں میں اپنے آپ کو قید کیے بیٹھا رہا۔۔۔ان دیواروں میں کوئی روزن نہیں تھا۔ کہیں کوئی کھڑکی، کہیں کوئی دریچہ نہیں۔

وہ شاید اپنے آپ کا قیدی تھا۔نوری نے اس کو اسی کی قید سے چھڑانے کی کوشش کی تھی اور شاید اس میں ناکام رہی۔اسے سارا قصور اپنا ہی نظر آتا تھا۔

اس نے کسی اور سے نہیں، اپنے آپ سے شکست کھائی تھی۔''

عبدالصمد کی تخلیقی انفرادیت کے نقوش اس ناول کے صفحہ صفحہ پر ثبت ہیں اور ناول نگار نے انسانی تجربہ یا تصور میں مضمر ثقافت یا خلقی Doxa کو اپنے پہلودار بیانیہ کا ہدف بنایا ہے۔غسل طہارت اور پاکیزگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔تاہم پاک کرنے کا عمل انسان کے ان جذبوں کو متحرک کر دیتا ہے جن کو مروجہ اخلاقیات کی رو سے انتہائی معیوب اور لائق تعزیر سمجھا جاتا ہے۔معاشرتی قوانین اس پر قدغن عائد کرتے ہیں۔ناول کا راوی ندیم غسل کے عمل کو مروجہ اخلاقی اقدار کی رو سے اپنی Wickedness کی تکمیل کا وسیلہ بناتا ہے۔وہ نوری، اختری، جولی اور روزی کو چوری چھپے نہاتے ہوئے دیکھتا ہے اور باور کراتا ہے کہ طہارت کس طرح ثقافت کی راہ ہموار کرتی ہے اور کسی کے پاک ہونے کا عمل کسی دوسرے پر کس طرح کے اثرات مرتب کرتا ہے۔یہ تینوں Episodes بصری تسکین کی ان صورتوں کو خاطر نشان کرتی ہے جو معاشرہ میں قابل قبول نہیں ہے۔کوئی بھی عمل جو چھپ کر کیا جائے کسی پر کوئی ایک حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے یعنی غسل کے لیے پردہ لازمی ہے مگر یہ عمل پاکیزہ ہے تاہم کسی کو نہاتے ہوئے دیکھنا جو چھپ کر ہی کیا جا سکتا ہے، کج روی کا غماز ہے۔مذکورہ دونوں سرگرمیوں کی اساس خلوت ہے، لہٰذا اس پر متضاد لیبل چسپاں نہیں کیے جا سکتے ہیں۔

مرکزی کردار کے اتالیق ماسٹر صاحب کی زندگی آزادانہ جنسی اختلاط سے عبارت ہے اور ندیم کی اولین محبت نوری اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ندیم ماسٹر صاحب کے عمل کو قابل نفریں سمجھتا ہے اور خود کو اس نوع کی سرگرمیوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔مگر ماسٹر صاحب کے پاس موجود فحش تصویریں ضرور دیکھتا ہے۔اسی طرح جب مرکزی کردار کالج میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگتا ہے تو اس کا ایک ریڈر دوست جب اسے کال گرلس سے جنسی آسودگی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اسے وہ بخوشی قبول کر لیتا ہے۔یہاں بھی انسانی سرشت میں پنہاں تضاد کو پیش کیا گیا ہے۔یعنی انسان زبان سے جس عمل سے انکاری ہونے کا مسلسل یقین دلاتا رہتا ہے، اپنے عمل سے اپنے قول کی تکذیب کرتا ہے۔یہ پورا عمل درج ذیل قول کی تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی Representation denotes assence۔

صنفی ڈسکورس (Gender Discourse) مابعد جدید عہد کا بنیادی شناس نامہ ہے۔اردو میں تانیثی ڈسکورس کی ایک ایسی تعبیر سامنے آئی ہے جسے صرف سادہ لوحی کا نام دیا جا سکتا ہے۔اس تعریف کی رو سے عورت کا اس سماج میں ہر سطح پر استحصال کیا جاتا رہا ہے اور بقول وارث علوی اس کا پروٹو ٹائپ ''بلبل

گرفتار'' ہے۔وہ اپنے حقوق کے لیے مسلسل سرگرداں نظر آتی ہے اور پدری سماج کے خلاف پرشور صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی ہے۔گھریلو خاتون اپنے حقوق سے یکسر ناواقف ہوتی ہے اوران سے کسی نوع کی عقلمندی کی توقع کرنا عبث ہے۔ عبدالصمد نے اس عام تصور کی بھی تکذیب کی ہے اور مرکزی کردار ماں جو رسمی طور پرخواندہ بھی نہیں ہے اور جس کی پوری زندگی شوہر کی مکمل تابعداری اور بے چوں وچراں اطاعت میں گزرتی ہے اور وہ کبھی اپنے حقوق کے سلسلے میں کوئی مطالبہ نہیں کرتی۔مگر جب اہم ترین فیصلے کا وقت آتا ہے تو وہ بے مثال دانش مندی کا ثبوت دیتی ہے۔عبدالصمد نے کسی نوع کی نعرہ بازی اور مردوں کے خلاف پرشور احتجاج کے بغیر یہ باور کرایا کہ عقل اور اقدامیت (Wisdom and Initiative) کو کسی ایک صنف تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اور عورت پھر صرف پیار، نازکی اور شفقت کا مجموعہ نہیں ہے وہ ایک ایسا مکمل وجود ہے جو فہم وفراست سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔مرکزی کردار کے والد کا جب انتقال ہوتا ہے جو اپنی امارت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے جائداد کو رہن رکھ دیتے ہیں اور مرکزی کردار اس مسئلہ سے عہد برآ ہونے کے لیے پوری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو اس کی ''بے زبان'' ماں مشورہ دیتی ہے:

''اللہ مغفرت کرے تمہارے والد صاحب کو، انہوں نے اپنے کسی معاملے کی مجھے کبھی بھنک نہیں لگنے دی، مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے، یہ تو ہمارے گھر اور سماج کا دستور ہے۔خیر ان کی ساری ذمہ داری تمہارے کندھوں پر آ گئی ہے۔ساری جائداد رہن رکھی ہوئی ہے، چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔بس ایک ہی حل مجھے نظر آتا ہے۔تمہارے والد جنت مکانی ایک کام اچھا کر گئے کہ انہوں نے جائداد فروخت نہیں کی جبکہ اس کے لیے انہیں کون روک سکتا تھا۔تم اب اپنی زندگی شروع کرنے والے ہو، تمہیں اپنی خاندانی جائداد پر منحصر ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، تمہیں اتنی فرصت بھی نہیں ہوگی۔اس لیے اب ساری چیزوں کو سمیٹنے کی ضرورت ہے۔

جائداد رکھ کر بے جائداد رہنے اور ہر وقت کڑھنے سے کیا فائدہ؟

تو پھر؟

محویت کے عالم میں پوچھا۔

اتنی ہٹادی جائے کہ بقیہ بچ جائے۔''

ماں کی عقل وفہم سے بھری ہوئی باتوں نے مرکزی کردار کو مبہوت کر دیا۔اب اس پر راوی کا ردعمل دیکھئے:

''ایک لمحہ کے لیے تو ندیم سمجھ ہی نہیں سکا، پھر فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ایک حاشیے پر رہنے والی چہار دیواری میں قید، ناخواندہ خاتون نے منٹوں میں مسئلے کا حل بتا دیا۔وہ مسئلہ جس نے رات بھر اسے کانٹوں کے بستر پر لٹایا تھا۔فراست میاں اپنی ہوشیاری اور فراست کے لیے مشہور تھے، وہ بھی اس سلسلے میں روشنی کی کوئی چنگاری پیدا نہیں کر سکے تھے۔''

ناول کے بیشتر نسوانی کردار فعالیت اور تحرک کا پیکر ہیں۔ناظمہ کا کردار اس ضمن میں سب سے اہم ہے۔اس سے مل کر ندیم محض جمالیاتی یا جذباتی انبساط کا احساس نہیں کرتا بلکہ علم وادب پر اس کی گہری دسترس ندیم کو اس کی بے شمار خامیوں مثلاً وسیع النظری، تجربہ، عمیق مطالعہ، حکمت وعزم اور وسیلہ کے فقدان سے واقف کراتی ہے اور مردانہ برتری کا تصور یکسر شکست ہو جاتا ہے۔ندیم کو شروع ہی سے لکھنے سے دلچسپی تھی اور اس کی کہانیاں مقبول رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ناظمہ خود ادیب نہیں تھی، وہ محض ایک ذہین قاری تھی جس نے افسانہ کے بدلتے ہوئے معیار ومنہاج سے ندیم کو واقف کرایا۔اس مبتدا پر ناظمہ اور ندیم کی گفتگو دراصل Story Narratology میں Meta Fiction Discourse کے دخیل ہونے کی غماز ہے۔Meta Fiction دراصل فکشن کی ماہیت اور متن کو متشکل کرنے والے اسلوبیاتی خصائص کو موضوع بحث بناتا ہے۔

مابعد جدید دراصل یک زبانی معاشرہ (Monolingual Society) کی طرف بڑی تیزی سے راجع ہے اور انگریزی نے دنیا کی بیشتر زبانوں کو مغلوب کر لیا ہے۔عبدالصمد کا ناول مادری زبان کی اہمیت کے غیر افادی تصور کی معنویت کا آشکارا کرتا ہے۔اردو سے متعلق عام سوچ اور پھر مرکزی کردار کا ردعمل ملاحظہ کریں:

''وہ تو ٹھیک ہے، آپ کو اچھا لگتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کی مادری زبان اردو ہے۔مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا آپ کو؟ وہ کیا کہنا چاہتے تھے ندیم کی سمجھ میں نہیں آیا۔اردو پڑھنے نہ پڑھنے سے فائدہ نقصان کا کیا معاملہ؟ وہ تو اردو نہ پڑھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کہانیاں کیسے لکھے گا۔نوری کے بارے میں کیا سوچے گا اور کیسے لکھے گا۔گویا اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ اردو اور نوری کے درمیان کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔''

حالیہ برسوں میں اردو میں متعدد اہم ناول شائع ہوئے ہیں۔مگر عبدالصمد کا ناول ''شکست کی آواز'' تخلیقی اظہار کے یکسر نئے کثیر حسی بیانیہ کو قائم کرتا ہے، نیز یہ کسی ایک مرکزی موضوع کے تابع Narrative Discourse کو قائم کرنے کی خیال انگیز مثال ہے جس کی پذیرائی اردو تنقید کے ناخن پر قرض ہے۔

''نئی دنیا کے تقاضے''

چین کے صوبے شیڈونگ میں بندروں کے لیے پہلا اسکول قائم کیا گیا ہے جس میں بندروں کو ہاتھ ملانا، سلامی دینا اور حساب کتاب کے ساتھ سرکس کی تربیت بھی دی جائے گی۔تربیت کے بعد ان بندروں کو چین کی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری میں بھیجا جائے گا جہاں یہ اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کریں گے۔اب تک اس اسکول میں کل تیس بندروں نے داخلہ لیا ہے جس میں چین کے علاوہ جاپانی بندر بھی شامل ہیں۔

عہدِ آشوب کی تمثیل

قمر رئیس

(●)

عبدالصمد کے ناول ''مہاتما'' کا اگر کوئی موضوع ہے تو وہ ہے آج کا جوان۔تعلیم یافتہ جوان۔وہ جو ہندوستان کے موجودہ وحشی معاشرہ میں کئی طرح کی ترغیبوں، آزمائشوں اور کشیدگیوں کے الاؤ سے گزر کر بھی نہ کندن بن پاتا ہے نہ کوئلہ۔ایک نیم سوختہ چوب کی طرح نہ وہ اپنے کام کا رہتا ہے نہ دوسروں کو جیون بخش پاتا ہے۔ایک طرف ہندوستانی تہذیب کے آدرش اس کا دامن کھینچتے ہیں۔دوسری جانب آسائشوں، زرومال اور اقتدار کی ترغیب اسے بلاتی ہے۔اس کے اُن خوابوں کو گدگداتی ہے جو مادّی فلاح کی طرف دوڑتے ہوئے معاشرہ میں اس کے وجود میں کونپلوں کی طرح پھوٹتے ہیں۔وہ جانتا ہے کہ یہ راستہ اسے سماجی اور اخلاقی جرائم کی دلدل کی سمت لے جائے گا۔لیکن اس کی للک کو وہ دل سے کھرچ کر پھینک نہیں پاتا۔کبھی کبھی اعلیٰ خاندانی روایات اور صالح تربیت اسے عقلِ حلال اور انسان کی فلاح خواہی کے کٹھن راستہ پر ڈال دیتی ہیں اور وہ عزم وارادہ کے ساتھ اس پر قدم بڑھاتا ہے۔محنت سے جی نہیں چراتا۔لیکن جلد ہی اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اس گھناؤنے سماج میں یہ سب لاحاصل ہے۔اصل چیز ہے اقتدار، سماجی دائرہ اثر، دولت۔وہ تھک جاتا ہے۔مایوسی اور اداسی کے بیمار سایے اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔اور پھر زندگی کے پُرفریب تماشے اس کی ذہانت اور صلاحیت کا سودا کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔یہ مقدر ہے آج کے تعلیم یافتہ نوجوان کا۔

''مہاتما'' کا ہیرو راکیش ایسے ہی نوجوانوں کی لاحاصل تگ ودو کی علامت بن جاتا ہے۔وہ اپنی بے چین، بے یقین اور بے اعتماد پیڑھی کا ہیرو ہے جسے مصنف نے ملک کے تعلیمی نظام کے کوہ وقار دروازے سے ناول میں داخل کر دیا ہے۔اس کے خواب، خواہش، منصوبے سب عام انسانوں جیسے ہیں۔وہ ایک غریب کنبہ کی شکستہ کشتی کا تنہا مانجھی ہے۔اسے اس حقیقت، اس ذمہ داری کا احساس ہے۔مشکل یہ ہے کہ یہ سفّاک احساس ہی اس کے آدرشوں کو بپھرے ناگ کی طرح ڈستا رہتا ہے۔پیسہ کمانا، امیرزادوں کی طرح موج اڑانا، اس کی زندگی کا مقصد نہیں تھا۔وہ اپنے ضمیر کی سلامتی اور آتما کی شانتی کے ساتھ سماج میں باعزت زندگی گزارنا چاہتا ہے۔اوسط ذہن کے ایک عام لیکن محنتی نوجوان کی طرح اس کے خوابوں کا جوہر یہی ہے۔

سیاسیات میں فرسٹ کلاس میں ایم اے کرنے کے بعد وہ سول سروس کے امتحان میں شریک ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے شفیق استاد پروفیسر پرشاد اس کی صلاحیتوں اور ذہنی افتاد کو پرکھ کر معلّمی کے پیشہ میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔اسے ریسرچ فیلو بنا دیتے ہیں۔اس کی نئی زندگی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''راکیش نے شعبہ میں جا کر فیلوشپ جوائن کر لی۔اور ایک طرح سے شعبہ کے ٹیچروں کی سطح پر آ گیا۔پروفیسر پرشاد نے ہفتہ میں چار کلاس اسے دیئے۔اور شعبہ میں اسے ایک کمرہ بھی دیا، جس کے آگے راکیش کمار کی تختی لگ گئی۔راکیش کو یہ سب چیزیں اور سہانی لگ رہی ہیں۔اس کے اندر خوشی اور اعتماد کی مضبوط لہریں اٹھنے لگیں۔'' (''مہاتما'' ص۔۱۲)

ریسرچ کا کام بھی اب وہ زیادہ تندہی سے کرنے لگا اور پروفیسر پرشاد کی سرپرستی کی وجہ سے اسے نسبتاً آسانی کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی مل گئی۔لیکن اچانک پروفیسر پرشاد کی موت نے اسے زندگی کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔وہ اپنے باپ کے سایہ سے بھی محروم ہو گیا جن کی معمولی تنخواہ سے گھر کی گاڑی چلتی تھی۔اب ایک نوجوان بہن، بھائی اور بوڑھی ماں کا بوجھ اس کے مضمحل کاندھوں پر تھا۔

شعبہ میں لکچرر کی جگہ پر اس کا تقرر اس لیے نہیں ہو سکا کہ نئے صدر شعبہ اس کی سرپرستی سے گریزاں تھے۔اس المناک دور سے راکیش کی طرح ملک کے لاکھوں نوجوان گزرتے ہیں۔پروفیسر پرشاد کے بعد اسے کوئی God Father نہیں مل سکا۔وہ ہاتھ پیر مارتا ہے۔کالج اور درس وتدریس کی زندگی سے وہ مانوس ہو چکا ہے۔اس میں کچھ تسکین، کچھ کشش ہے جو اسے دوسرے محکموں میں قسمت آزمائی سے روکتی ہے۔ایک موہوم امید کے سہارے وہ کچھ پروفیسروں کے بنائے ہوئے کوچنگ سنٹر سے وابستہ ہو جاتا ہے۔تلخیاں، مایوسیاں اور تجربے اسے آہستہ آہستہ ہوشمندی اور دنیاداری کی تعلیم دے رہے ہیں۔لکچرر کی ایک اسامی کے لیے وہ امیدوار ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ تقرر کے لیے ایجنٹ کی معرفت تیس ہزار کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔راکیش یہ جان کر دنگ رہ جاتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ اتنی رقم حاصل کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہوگی۔لیکن پروفیسر سنہا اس کے لیے ایک ''بائی پاس'' سمجھاتے ہیں۔اور یقین دلاتے ہیں کہ اتنی رقم وہ آسانی سے فراہم کر لے گا۔وہ دوسروں کے لیے معاوضہ پر اسے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔وہ کہتا ہے:

''سر! یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔یہ تو اس پیشہ کے ساتھ سراسر بے ایمانی ہوگی۔

بیٹے یہ سب بھول جاؤ اور پھر تم کس دنیا کے ایمان اور بے ایمانی کی باتیں کر رہے ہو، اسی دنیا کی جس نے تمہارے ساتھ انصاف کرنے کا حوصلہ نہیں پیدا کیا، تمہارا حق تمہیں نہیں دیا۔اور پھر یہ تو ایک طرح کا ٹیوشن ہے۔۔۔

سر! مجھے تو یہ سب سن کر سوچ کر عجیب سا لگ رہا ہے۔

اس وقت تم صرف پیسہ کی بات سوچو۔جس کے سبب تمہاری بحالی نہیں ہو سکی۔تمہیں چوری نہیں کرنا۔ڈاکہ نہیں ڈالنا، بس اپنی محنت سے پیسے کمانا ہے۔''

یہ تلقین ایک دانش گاہ کا پروفیسر کر رہا ہے، جو راکیش کی اس ''محنت

کی کمائی''میں نصف کا حصہ دار ہوگا۔

راکیش کی آنکھیں کھلنے لگتی ہیں۔زندگی کی المناک سچائیاں اس کے سامنے ہیں۔اب وہ اس اذیت ناک کشمکش سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے وہ گذر رہا ہے۔اپنی دوسری کشتیاں وہ جلا چکا ہے۔بھائی،بہن اور بوڑھی ماں کے اداس چہرے ہر لمحہ اس کا پیچھا کرتے ہیں۔وہ پروفیسر پرشاد کو اب بھی عقیدت سے یاد کرتا ہے جنہوں نے اس کو علم اور انسانیت کی خدمت کا راستہ دکھاتا تھا۔لیکن جب وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے تو ''کامیاب'' انسانوں کی اکثریت اسے پروفیسر سنہا کے لباس میں ہی نظر آتی ہے جو اپنے استدلال سے نہایت کریہی جرائم کا جواز بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔

راکیش،ڈاکٹر سنہا کے دام میں گرفتار ہو چکا ہے۔کام شروع کرتے ہیں ڈاکٹر سنہا اسے پانچ ہزار روپے دیتے ہیں۔اتنی بڑی رقم زندگی میں پہلی بار اس کے ہاتھ آتی ہے۔یہ اس کے حوصلوں کو مہمیز کرتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔

اس کا بھائی شک کرتا ہے کہ راکیش کو نوکری تو ملی نہیں پھر اچانک اتنی آمدنی کہاں سے ہو رہی ہے؟اس کی ماں کہتی ہے:

''مجھے پورا وشواس ہے میرا بیٹا (کسی) ایسے ویسے دھندے میں نہیں پڑ سکتا۔وہ تیرے پوجیہ پتا کا بیٹا ہے جو مرتے مر گئے لیکن اپنی ایمانداری اور اصول کے دمان کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔'' (''مہاتما''ص۔۴۲)

ایمانداری،اصول،آدرش یہ سب راکیش کے ذہن میں خوابوں کی طرح دھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔صرف ایک کانٹا سا اس کے وجود میں کھٹکتا ہے۔اسے ضمیر کہئے،مر یادہ کہئے یا متوسط طبقہ کی اخلاقی حس۔وہ تحقیقی مقالوں کی تدوین کا کام بھی مزدوری سمجھ کر کرتا ہے اور چونکہ وہ پی ایچ ڈی ہے اس لیے دوسروں سے زیادہ مزدوری پاتا ہے۔

زندگی کے تجربے دھیرے دھیرے اس کی سوجھ بوجھ کی کمانیں کھولتے ہیں۔وہ ایک پرائیویٹ کالج میں لکچرر کی جگہ خریدنے کے لیے بڑے محتاط انداز میں سیکرٹری سے سودا کرتا ہے۔کالج جب امتحان کا مرکز بنتا ہے اور وہاں پرنسپل اور اساتذہ اجتماعی اور منظّم طور پر طلبا کو نقل کراتے ہیں تو وہ ابتداً حیران اور دکھی ضرور ہوتا ہے لیکن پھر اس سازش میں شریک ہو جاتا ہے۔سمجھوتے کرنے کے باوجود راکیش ''اندر بیٹھے اس نامعلوم کے ہاتھوں پریشان تھا جو ہمیشہ اسے بتاتا رہتا ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا؟'' اس کی حرکتوں کو اندر کی اس طاقت نے تسلیم نہیں کیا تھا اور۔۔۔اس کے اندر ہاں اور نہیں کی مسلسل جنگ ہو رہی تھی۔''

(''مہاتما''ص۔۷۸)

کالج کے دوسرے نوجوان اساتذہ کا مسئلہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔یہ اس کی اداس پیڑھی کا المیہ تھا۔یہ اس سماجی نظام کا المیہ تھا جس میں پیسہ،پیروی اور اخلاقی پستی کو اقتدار حاصل تھا۔اس گراوٹ کا نقطۂ عروج وہ ہے جب راکیش اپنے شناسا ہری موہن کی پریشانی میں اس کی مدد کرتا ہے۔ہری موہن کے پی ایچ ڈی کے Viva میں جو پروفیسر ممتحن ہو کر آتے ہیں وہ اور مطالبوں کے ساتھ ایک نازنین کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جسے راکیش اپنے ایک دیرینہ شناسا ڈیوڈ کی مدد سے مہیا کرتا ہے۔

یہ کانٹا بھی اس کے وجود میں مسلسل کھٹکتا ہے۔

پروفیسر گورکھ ناتھ سنگھ اور یونیورسٹی کے بزرگ اساتذہ یونیورسٹی کے بگڑتے ہوئے ماحول میں اصلاح لانے پر زور دیتے ہیں۔ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جلسہ میں راکیش بھی حصہ لیتا ہے۔جوشیلی تقریروں اور بحث کے بعد طے ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے ماحول کو گندگی سے پاک کرنے کے لیے کوئی استاد بھوک ہڑتال کرے۔کوئی اس چنوتی کو قبول نہیں کرتا،تب راکیش کھڑا ہوتا ہے:

''میں کرونگا بھوک ہڑتال۔کیمپس اور کالجوں کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو درست کرنے کے لیے اگر مجھے جان بھی دینی پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' (''مہاتما''ص۔۱۲۴)

اس کے چھ دن کی بھوک ہڑتال سے ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ وزیر تعلیم بھی اس کی بھوک ہڑتال ختم کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔باہر راکیش زندہ باد کے نعرے لگتے ہیں۔

آخر بھوک ہڑتال ختم ہو جاتی ہے۔وزیر تعلیم،وائس چانسلر کو ہدایت کرتے ہیں کہ راکیش کو یونیورسٹی میں جگہ دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بنگلہ بھی الاٹ کیا جائے۔لیکن اس مہربانی کے پیچھے ان کے جو سیاسی مفادات بروئے کار ہیں ان کو چھپانے کی ضرورت بھی وہ محسوس نہیں کرتے۔

راکیش ناتوانی کے باعث بخار میں مبتلا ہے۔وہ ایک ہسپتال میں زیر علاج ہے۔وہ ایک کنویں میں گر کر وہاں سے رستم کی طرح تڑپ کر باہر نکلتا ہے۔لیکن اسے نہیں معلوم کہ خسرو نے گھاس پھوس کے پیچھے مسلسل سات کنویں کھدوا کے رکھے ہیں۔وہ بڑبڑاتا ہے:

''سسٹر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا کیوں ہے؟

اسپتال کے بستر پر آنکھیں پھاڑے ساری دنیا کو وہ نرس کی طرح سفید کفن میں لپٹا چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

سب انجانے قبرستان اور شمشان کی اور جا رہے ہیں۔''

یہ اس کے آخری الفاظ ہیں۔یہ مایوسی اور محرومی کی ایک چیخ ہے۔اسے ہر سمت اندھیرا ہی نظر آ رہا ہے۔اس لیے کہ اس نظام کا ہر ادارہ،خواہ وہ کتنا ہی مقدس مانا جاتا رہا ہو،حرص و ہوس کا اکھاڑہ بن چکا ہے۔انسانی قدریں معدوم ہو چکی ہیں۔بربریت کا راج ہے۔اس اندھکار میں نوجوان پیڑھی کو روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔راکیش اسی آشوب حیات کی تمثیل ہے۔وہ ایک غریب گھرانہ کا فرد ہے۔اس کی نفسیات سیدھے سادے عام انسان کی نفسیات ہے۔اس لیے اس کی تگ و دو اور کردار میں کسی پیچیدہ،پہلودار اور Sofisticated سیرت کو تلاش کرنا عبث ہوگا۔

"دوگز زمین"

آغا سہیل

(لاہور)

اردو میں ادبی ناولوں کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے اور اس میں اعلیٰ درجے کے ناولوں کی اور بھی کمی ہے۔ اس برصغیر میں بعض صوبائی اور علاقائی زبانوں کے ادب میں کچھ اچھے ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ جن کی بازگشت اردو ادب تک سنائی دی لیکن صرف اردو میں اور محض اردو میں براہِ راست جو ناول لکھے گئے اور جنہیں ادبی اور معاشرتی ناول کہنا چاہیے ان کی تعداد یقیناً اب بھی کم ہے۔ سنہ ۱۹۸۸ء میں ہندوستان سے جو چند اچھے ناول سامنے آئے ان میں عبدالصمد کے "دوگز زمین" کا ذکر کسی طرح نامناسب نہ ہوگا۔ یقیناً کچھ بڑے نام بھی موجود ہیں اور ان بڑے ناموں کے ساتھ بڑے ناول بھی معرضِ شہود پر آئے لیکن نوجوانوں میں عبدالصمد کے اس ناول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جس کا ایک تاریخی احاطہ اپنے معاشرتی سیاق وسباق میں قائم ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ دیہی اور شہری علاقوں کی معاشرت پر اردو میں کم ناول لکھے گئے۔ تاریخی لحاظ سے اس بنا پر یہ ناول اہم ہے کہ تحریک خلافت، کانگریس، گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح وغیرہ کے حوالے سے ان تحریکوں کے جو اثرات پورے برصغیر میں پھیلے وہ بہار کے ایک چھوٹے سے خطے میں بھی نمودار ہوئے اور شیخ الطاف حسین جدّی اور پشتینی علاقہ بین میں بھی ظاہر ہوئے جس کے سبب الطاف حسین کے خانوادے سے لے کر ان کے گاؤں اور بہار کے اطراف تک پھیل گئے۔ دوسرے لفظوں میں برصغیر کی آزادی کی تحریک نے جہاں تمام خطوں کو اپنی لپیٹ میں لیا وہاں اس کے محرکات اور عوامل بہار کے معاشرت پر بھی مرتب ہوئے۔ یہ ہے وہ موضوع جسے عبدالصمد نے اپنی گرفت میں لے کر ایک خانوادے کے افراد کے ذریعے مشرقی و مغربی پاکستان تک پھیلایا اور ان کرداروں کے کوائف کے حوالے سے جو قصہ پھیلایا اس نے ثقافتی اور تہذیبی رنگوں کو جذب کرتے ہوئے تاریخ کے عوامل سے کام لیتے ہوئے قصہ اور افرادِ قصہ کو مربوط رکھا۔ یہ ایک منضبط پلاٹ ہے اور ارتباط کے لحاظ سے اس میں کہیں بھی اونچ نیچ موجود نہیں۔ گٹھا ہوا یا Compact پلاٹ تکنیک کے لحاظ سے اپنے میکانکی سیاق وسباق کو کسی طرف سے بھی مجروح نہیں کرتا۔ یہ وہ خوبی ہے جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد بھی اس خوبی پر پوری طرح نہیں اترتے اور رتن ناتھ سرشار تو بالکل ٹریک سے اتر جاتے ہیں۔ البتہ مرزا ہادی رسوا وہ پہلے باقاعدہ ناول نگار ہیں جنہوں نے ناول کے پلاٹ کے میکانکی رشتوں کو مربوط اور منضبط رکھا۔ عبدالصمد بھی اس سعی میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر کسی کمی کا احساس ہوتا ہے تو وہ یہ کہ پلاٹ کو مربوط رکھنے کی دھن میں کردار بسا اوقات پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آتے اور کہیں کہیں تو محض پرچھائیوں کا احساس ہوتا ہے اور اصل کردار دبے دبے سے محسوس ہوتے ہیں۔ چونکہ کردار پوری طرح واضح نہیں ہوتے لہٰذا ان کا نفسیاتی تشخص بھی بہت زیادہ واضح نہیں ہوتا۔ ان کے مکالمے بھی محض مصنف کے وہ کلمات نظر آتے ہیں جو اس کے پلاٹ کی بنت کے تابع ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک مستحسن کوشش ہے۔

ناول کو مجموعی طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور زمانی لحاظ سے تحریک خلافت سے شروع کر کے پاک و ہند کی اس جنگ تک پھیلایا گیا ہے جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء لگا اور ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے کر جمہوریت کی تحریک کو سبوتاژ کیا گیا۔ دیکھا جائے تو یہ تاریخ کا ایک طویل دورانیہ ہے لیکن اس دورانیے کو کل دو سو چھیاسی صفحات میں قید کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس منزل پر بہت سے تاریخی ناول نگار ناول کو واقعات اور حالات کی کھتونی بنا دیتے ہیں۔ عبدالصمد نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے صرف تاریخی واقعات کے محرکات وعوامل اور ان کے اثرات پر نگاہ رکھی ہے اور جو نتائج معاشرے پر مرتب ہو چکے تھے صرف ان سے سروکار رکھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ تاریخی واقعات کے سرچشموں سے اختلاف و اتفاق کی بہت سی صورتیں نکلتی ہیں جہاں دانشوروں کے نظریات وتعصبات خواہ سطور میں یا بین السطور ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن عبدالصمد نے معروضیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے تاثرات اور تعصّبات کو کہیں بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ خوبی ہے جس سے ان کے ناول کی مقبولیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ زمانی لحاظ سے ناول نگار کو تاریخ کے منتخب حصوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو اس کے پلاٹ سے مربوط ہوں اور فالتو حصوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ضروری اور غیر ضروری حصوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ناول نگار کی بالغ نظری پر منحصر ہے، جب کہ "دوگز زمین" بجائے خود تاریخی ناول نہیں ہے۔ محض تاریخی واقعات کے حصار میں سفر کرنے تک محدود ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مصنف پیشے کے لحاظ سے زندگی کے کس معاشرتی شعبے سے وابستہ ہیں لیکن ان کا ذہن کتر بیونت اور قطع و برید کے میکانکی اصولوں کا سختی سے پابند نظر آتا ہے اور منطقی لحاظ سے اس قدر سخت گیر بھی کہ غیر منطقی اور فالتو واقعات کا کسی طور بھی متحمل نہیں ہوتا۔

مکانی لحاظ سے بین اور بہار مشرقی پاکستان اور کراچی (تھوڑا بہت

نیپال بھی) ناول میں اہم مقامات ہیں، بنیادی مقام بین ہے۔اس چھوٹے سے گاؤں کی مربوط زندگی میں بہاری مسلمانوں کا ایک خاص تاریخی کردار ہے۔قرۃ العین حیدر کی طرح مسلمانوں کے اس کردار کا تعین ماضی بعید سے نہیں قائم ہوتا۔

ع جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

کا احساس ہوتا ہے یعنی مسلمانوں کے زوال کی تاریخ ان کی وراثت میں منتقل ہوئی تھی۔انحطاط اور مسلسل زوال اقتصادی اجارہ داری سے وابستہ ہے اور اقتصادی اجارہ داری اپنے مخصوص نظام زندگی سے مربوط ہے۔بنگالہ اور بہار مغلوں کے جاگیردارانہ نظام سے باہم دگر منضبط اور مربوط چلے آرہے تھے۔ان کا فرسودہ نظام زندگی جاگیرداری سے عبارت تھا۔جاگیردار علاقے کا مالک مختار کل ہوتا تھا۔جو اکثر جابر و ظالم بھی ہوتا ہے۔کسان محنت و مشقت کرتا تھا۔ کسان اور اس کی آل اولاد اس کی رعایا اور پرجا ہوتے تھے۔جو جاگیردار کے لیے جیتے مرتے تھے۔ان کی اپنی کوئی زندگی اور ان کا کوئی تشخص نہ ہوتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ جاگیردار کے تابع مہمل بن کر زندہ رہتے تھے۔وہ اس فرسودہ نظام حیات کے کل پرزے تھے۔اب اس لحاظ سے ہندو اور مسلمان کا کوئی تشخص قائم نہیں ہوتا، البتہ وہ مذہبی لحاظ سے آزاد تھے اور ماضی بعید میں انہوں نے کوئی ایسا نقش نہیں بنایا تھا جو روایتاً اور وراثتاً ان کی اجتماعی زندگی میں کوئی کردار ادا کر سکتا۔جو کچھ ہوتا تھا جاگیردار کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔شیخ الطاف حسین اور ان کے بعد ان کے بھانجے اور داماد اختر حسین کا اثر و رسوخ اس علاقے پر شروع سے قائم تھا۔یہاں ہندو اور مسلمان دونوں آباد تھے۔حسن اتفاق سے الطاف حسین اور اختر حسین دونوں شریف النفس، مرنجاں مرنج، مہذب اور نستعلیق جاگیردار تھے جو اپنے علاقے میں مقبول بھی تھے۔دونوں کانگریس کے حامی تھے اور ان کی مقبولیت کا گراف آخر تک بدستور قائم رہتا ہے۔یہ بھی واضح رہے کہ اس علاقے میں مسلم لیگ اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑتی ہے اور کانگریس کو شکست بھی دیتی ہے۔کانگریس کے زعما اور اکابر مطعون بھی ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد کو جو قائداعظم نے کانگریس کا شو بوائے کہا تھا وہ یہاں سکّہ رائج الوقت کی طرح مقبول ہوتا ہے، لیکن قیام پاکستان کے ساتھ مسلم لیگ کا گراف نیچے آتا ہے اور کانگریس کا گراف اوپر جاتا ہے۔یہاں ہندو مسلم فسادات بھی ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو بطور خاص نقصانات بھی اٹھانا پڑتے ہیں ان کے کھیت کھلیان گھربار جلائے جاتے ہیں۔لوگ قتل ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کے مناظر دور دور تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن مصنف مبصر کے طور پر کسی نقطہ نظر کی وکالت کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔صرف کرداروں کی مدد سے تاریخ کے حالات اور واقعات دکھاتا ہوا چلتا ہے۔یہ بھی معروضیت کی ایک اچھی مثال ہے۔حالات اور واقعات مشرقی پاکستان کے بھی سامنے آتے ہیں، جہاں بہاری بنگالیوں کے علاقے میں رہنے کے باوجود ان کی معاشرت اور ان کی معیشت پر استحصالی تبختر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ان کی ثقافت اور تہذیب کو خاطر میں نہیں لاتے۔ان کی تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی تضحیک کرتے ہیں۔یہ ہیں وہ مضمرات جنہوں نے مسلم لیگ کی قومی تحریک کو نقصان پہنچایا اور بنگلہ دیش کی بنیاد رکھی۔مصنف خود ایک بہاری نوجوان ہیں لیکن اپنی بالغ نظری کا اس مقام پر وافر ثبوت فراہم کر گئے۔جس معروضیت سے انہوں نے کام لیا وہ ان کی شرافت، نیک نفسی اور فکری لحاظ سے ذہانت کی دلیل ہے۔بنگلہ دیش بن جانے کے بعد اور پاکستان کی المناک شکست کے بعد بنگلہ دیش ہندوستان اور نیپال میں اور ازاں بعد مغربی پاکستان میں جوان بہاریوں کا حشر ہوا اس کے خونیں واقعات و حادثات کو جس چابکدستی اور بے باکی سے عبدالصمد نے پیش کیا ہے وہ بھی اس ناول کا وقیع حصہ ہے۔

اصغر حسین اسی خاندان کا ایک اہم حصہ تھے جو ہجرت کر کے کراچی میں آ بسے تھے۔کراچی کی معاشرت اور نئی تہذیبی قدروں نے جو ایک خاص طبقہ پیدا کیا وہ ہیں تو مہاجر لیکن مقامی لوگوں میں جذب نہ ہونے کے سبب ایک عجیب و غریب سنوبری میں مبتلا ہیں۔جن کی زندگی میں نمود و نمائش کے سوا کچھ نہیں۔اچھے مکان، اچھا فرنیچر، اچھے ملبوسات اور مہنگے کاسمیٹکس کے بے دریغ استعمال کے سوا ان کی زندگی میں کوئی معنوی گہرائی نہیں۔ان کی ثقافتی اور تہذیبی قدریں کھوکھلی ہیں اور زمینی رشتے ٹوٹے ہوئے ہیں۔سب اکھڑے ہوئے لوگ ہیں جو فضا میں معلق ہیں۔ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچی جا چکی ہے لیکن جس سرزمین پر ان کے قدم ٹکے ہیں اس کے گرد و پیش اور اس کے ماحول سے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں جو نہ بنگال میں جذب ہوئے اور نہ سندھ کی سرزمین پر جذب ہونے کو تیار ہیں۔اگر کوئی آمر یہ کہتا ہے کہ اس کے آگے سمندر ہے تو اس کا ایک پہلو ہر چند کہ تلخ ہے لیکن حقیقت سے خالی نہیں۔یہ جس دیس کی ہوا کھاتے ہیں جس مٹی کا غلہ استعمال کرتے ہیں اور جہاں کی معیشت ان کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے اس سے انہوں نے کوئی سروکار پیدا نہیں کیا اور کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔انہوں نے اپنا ایک اور ہی ماحول خود تخلیق کیا ہے کہ جس کے تبختر کو ہی اپنا اثاثہ قرار دیتے ہیں اور اس لحاظ سے جس خیالی فضا میں معلق ہیں وہ انہیں اور ان کی نسلوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔عبدالصمد نے اس سائیکی کو بخوبی سمجھا ہے اور اس کے مجہول اور بر خود غلط ہونے کا صحت مند تجزیہ کیا ہے۔اس ناول کا خاتمہ دو خطوط پر ہوتا ہے۔ایک وہ جو اختر حسین نے اپنے بیٹے کے نام لکھا اور دوسرا وہ جو ان کے بیٹے نے اختر حسین کے نام لکھا۔آخری خط بہت معنی خیز ہے کیونکہ کھوکھلی معیشت اور بہتر ملازمت کے حصول کے سلسلے میں بیٹا پاکستان سے ہجرت کر کے سعودی عرب میں جا بسا ہے۔جو اس بات کی علامت ہے کہ جو افراد و اقوام اپنی سرزمین سے ناتہ توڑ لیتے ہیں ان کا ماضی ہی ماضی ہوتا ہے۔ان کا حال مبہم اور ان کا مستقبل مبہم تر بن جاتا ہے۔اس ناول کے موضوع کا یہی وہ پہلو ہے جسے مصنف نے بخوبی اجاگر کیا ہے۔

عبدالصمد کے افسانے

حامدی کاشمیری
(سری نگر، کشمیر)

عبدالصمد کے افسانے نقادوں کے لیے فوری طور پر یہ باور کرانے کا خاصا سامان رکھتے ہیں کہ یہ موجودہ بحرانی دور میں انسان کے معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی حقائق و واقعات کی آئینہ داری کرتے ہیں، اس طرح سے ان کے افسانوں میں آسانی سے سوچی سمجھی گئی موضوعیت کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے اور کی جاسکتی ہے، اس انداز نقد کو بدیہی طور پر ماقبل کے دور کی مروجہ حقیقت نگاری کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کرنا نقادوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کام تھا، اور ایسا کیا بھی گیا ہے، حالانکہ ہیئتی تنقید نے متن کے خود مکتفیانہ وجود کا اثبات کر کے اسے بہت حد تکEclipse بھی کیا، حقیقت نگاری کے تحت افسانہ نگار کے مطمعِ نظر، اس کی معاصر آگہی اور ثقافتی شعور وغیرہ کے بارے میں صفحوں کے صفحے سیاہ کیے جاسکتے ہیں، تاہم یہ مکتبیانہ انداز نقد جو متن ناشناسی کے تحت یا اس سے سرسری گزرنے یا اس کے غیر علامتی اور غیر مبہم ہونے سے اسے موضوعیت میں بدلتا ہے اور مصنف سے راست رشتہ قائم کرتا ہے داخل دفتر ہو چکا ہے۔

عبدالصمد کے افسانے اپنے تخلیق کار کے حوالے سے نہیں، بلکہ اپنے بل بوتے پر زندہ ہیں، اور زندہ انسانوں کی دنیا آباد کرتے ہیں، یہ افسانوی دنیا ہے، جو بیانیہ کی موزونیت، شگفتگی اور جاذبیت اور ڈرامائیت کی بنا پر قاری کو حقیقی دنیا کی بے بضاعتی، بلکہ بسا اوقات میں اس کی عدم موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ افسانہ اپنی تخیلی کارکردگی سے پہلی سطر سے ہی خاتمے تک کرداروں کی ذہنی الجھنوں، خوابوں، امیدوں، شکستوں، کامرانیوں، گم کردگیوں اور بازیافتوں کا نوشتہ تقدیر بن جاتا ہے اور یہ سب کچھ انسانی صورت حال پر مرتکز ہو کے اس یقین آفرینی سے واقع ہوتا ہے، کہ قاری اس کا حصہ بن جاتا ہے اس ضمن میں ان کے افسانوں کی پہلی سطر ہی بیان کنندہ کے لہجے، الفاظ کی نشست اور ادائیگی افسانوی دنیا میں داخل ہونے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے، کیوں کہ یہ اس کے لیے حد درجہ Captivating بن جاتی ہے اور پھر وہ آگے آنے والی ہر سطر کی تجسس آفرینی سے اپنے آپ کوidentify کرتا ہے:

''اچانک دروازہ زور سے کھلا، اور کئی افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔''

(ہونی انہونی)

''اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر کوئی گومڑ سا نکل آیا ہے۔''

(گومڑ)

''تیر نشانے پر ہی نہیں بلکہ ٹھیک نشانے پر جا بیٹھا تھا۔''

(کیس ہسٹری)

''نیند ٹوٹی تو گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔''

(صبح کا تارا)

آیئے سب سے پہلے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ان کے افسانوں میں ہوتا کیا ہے۔ ایک بیان کنندہ یا متکلم سامنے آتا ہے، اسے مصنف پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اس کی اپنی انفرادی شخصیت ہے، یہ تمام تر ایک فرضی کردار ہے، جو ایک افسانوی دنیا میں نمود کر کے اس میں ہونے والے واقعات کو مختلف فرضی کرداروں کے توسط سے بیان کرتا ہے، بیانیہ جاری رہتا ہے، اور نئے نئے وقوعات کا اکتشاف کرتا ہے، یہ میکانکی انداز میں نہیں ہوتا، یعنی یہ یکسانیت، سطحیت اورSuperficiality کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ بدلتی سچویشنز اور کردار کے عمل اور ردعمل کو ذہنی سطح پرVisualise کرتے ہوئے خود غائب بھی ہوتا ہے اور کردار واقعہ کو آزاد چھوڑ کر ان کی آویزشوں اور آمیزشوں کو راہ دیتا ہے، تاہم مجموعی طور پر وہ ایک صاحب الرائے، نکتہ رس اور ماہر نفسیات کردار ہے، وہ اپنے مشاہدے کی باریکی اور گہرائی سے اور دوسروں کے دکھ سکھ میں شرکت سے اپنے ردعمل سے اپنے ہونے کا جواز پیش کرتا ہے:

''دکان سے باہر آتے ہی اس کا لچکیلا دروازہ ایک خاص ادا کے ساتھ خود بخود بند ہو گیا، اس نے مسکرا کر بند دروازے کے شیشوں پر اپنا ہاتھ پھیرا اور سامنے بہتی ہوئی دنیا پر ایک نظر ڈالی، دنیا زندگی سے بھرپور، خوبصورت اور رواں دواں تھی، اور اس میں اس قدر حرارت تھی کہ اس کی ساری کمزوری اور بدصورتی اگر تھی بھی تو اب چھپ گئی تھی، دکان کی اونچی سیڑھیوں سے فوراً اترنے کو اس کا جی نہیں چاہا، اور وہ یونہی سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا، شام بازار میں اتر آئی تھی اور اس کی نیون لائٹ کی افشاں بکھر گئی تھی۔۔۔'' (شرط)

دوسری بات یہ ہے کہ ان افسانوں میں جہاں جہاں مصنف کے حوالے سے خارجی زندگی کے مناظر و مظاہر، سماجی اور سیاسی حقائق یا تاریخی نام و مقام در آتے ہیں، وہ افسانے کی فرضیت میں رخنہ اندازی نہیں کرتے نہ اس پر غالب آتے ہیں نہ مخمل پر ٹاٹ کا پیوند بن جاتے ہیں، بلکہ بیانیہ کی قوتِ نمو اور ارتباطی عمل سے اس سے میل کھاتے ہیں، یا اس میں تحلیل ہو کے رہ جاتے ہیں اور من حیث الکل افسانے حقیقت کی بے رنگی کو تیاگ کے فرضیت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، یہی وہ چیز ہے جو عبدالصمد کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممیّز کرتی ہے اور ان کے تخلیقی ذہن کا اثبات کرتی ہے۔

ان کے افسانے کہیں سے بھی اپنا سفر شروع کرتے ہیں اور کسی تنقید و تعارف یا تمہید یا فضا نگاری یا مقصدیت یا کسی ذہنی جھکاؤ سے کام نہیں لیتے۔ یہ آہستہ آہستہ کردار واقعہ کے عمل اور ردعمل سے اور افسانوی عمل کی اونچ نیچ سے

گزرتے ہوئے ایک منطقی انجام کی طرف بڑھنے کے رجحان کوظاہر کرتے ہیں، لیکن منطقی انجام سامنے نہیں آتا، وہ اس سے گریز پا ہوتا ہے یا شاید اس کا التباس پیدا کرتا ہے اور کئی مواقع پر یہ بھی نہیں ہوتا اور ہوتا یہ ہے کہ خاتمے پر بیک وقت افسانے کے سامنے کئی نامعلوم راستے کھلتے نظر آتے ہیں نتیجتاً نہ صرف افسانے کے کردار بلکہ قاری کے لیے بھی کسی ٹھوس اور قابل شناخت مقام تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس طرح افسانہ جہان آشنا ہو جاتا ہے اور قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔

''دوسرے دن صبح وہ اپنے دوست کی لانڈری سے اپنی مخصوص خاکی پینٹ اور کھدر کی سرمئی شرٹ پہن کراس کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تو مسلسل ایک ہی بات سوچے جارہا تھا،

''زندگی گزارنا اتنا مشکل نہیں ہے۔۔۔ زندگی گزاری جا سکتی ہے۔۔۔بشرطیکہ۔۔۔بشرطیکہ۔۔۔'' (شرط)

ان کے اکثر افسانے کرداروں کے نفسیاتی اور ذہنی پیچ وخم کے مرقعے ہیں، وہ بظاہر خانگی سطح پر یا معاشرتی ماحول میں نارمل زندگی بسر کرنے کے باوجود داخلی طور پر الجھنوں اور تضادوں کے شکار ہیں۔ وہ شعور اور لاشعور کے تعمل (Interaction) سے اپنی آگہی کو علامتی پردوں میں چھپانے کے بجائے اسے نمایاں کرتے ہیں اور اپنی بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔اس طرح سے اپنے جذباتی دھچکوں اور نفسیاتی عوارض سے انسانی دکھ کا احساس دلاتے ہیں، ایسا کرنے سے وہ معصوم انسانوں کو، بیہمانہ قوتوں سے متصادم ہونے اور بے بسی پر منتج ہونے کی فکر انگیز انسانی صورت حال سے آشنا کراتے ہیں۔''کیس ہسٹری'' کا کردار جہد البقا کی مثال ہے۔ وہ اپنی دائمی جدوجہد کے باوجد اس بیماری سے نجات نہیں پاتا، جو اسے نورانی اور نفسیاتی طور پر ملی ہے، قاری شروع سے آخر تک کردار کے اذیت ناک جسمانی اور ذہنی سفر میں شریک ہوتا ہے۔آخر میں ڈاکٹر اس کے مرض کو آبائی قرار دیے کر مریض سے زیادہ اپنی تشفی یوں کرتا ہے، حالانکہ وہ طبعی علم کی نارسائی پر محض طفل تسلی سے کام لیتا ہے:

''ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ان کا یہ مرض خاندانی ہے اور بس۔''
اور مریض سوچتا ہے ''لیکن ڈاکٹر کو یہ پتہ نہیں کہ اب وہ (مریض) اپنے پرانے چوکھٹے میں واپس نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس نے اپنا جون ہی بدل ڈالا تھا۔۔۔ایک بالکل نیا جون، جہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی مرض نہیں تھا اور کوئی علاج۔۔۔''

''گومڑ'' بھی اسی قبیل کا افسانہ ہے۔اس میں کردار جسمانی اور ذہنی طور پر سر پر نکلے ہوئے گومڑ سے پریشان خاطر ہو جاتا ہے اور بے بسی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔''رُکے ہوئے قدم'' میں ایک کم آمدنی والے طبقے سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی کی تصویر اُبھری ہے، وہ کرائے کے مکان میں کب تک رہیں گے، وہ دونوں طے کرتے ہیں کہ وہ اپنے اخراجات میں کٹوتی کریں گے، حد درجہ کٹوتی کرنے کے بعد جب مرد زمین کے دلال کے پاس جاتا ہے تو یہ سن کر اس کی سٹی گم ہوتی ہے کہ زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں، وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں بچائی ہوئی رقم سے ایک بڑی شاپنگ کرڈالتا ہے، درجنوں گھریلو چیزوں کے علاوہ بچوں کے لیے اور بیگم کے لیے قیمتی ملبوسات خریدتا ہے یہاں تک کہ وہ ''لدا پھندا دو رکشوں اور دو ٹھیلوں پر سامان لئے گھر پہنچا۔''

اس کے بعد:

''بیگم باورچی خانے میں تھیں، ہنگامہ سن کر دوڑی دوڑی آئیں، تو اتنا سامان پھیلا ہوا دیکھا تو بت سی کھڑی رہ گئیں، میری آنکھیں ان سے چار ہوئیں تو میرے قدم وہیں رہ گئے۔۔۔اور رُکے ہی رہے۔''

ظاہر ہے افسانے کا مرکزی کردار اور اس کی بیگم لاکھ چاہے، گھر خرچے میں حد درجہ کی کمی کرنے اور ایک ایک پیسہ جوڑنے کے باوجود زمین خرید سکتے ہیں نہ مکان بنوا سکتے ہیں۔متکلم مایوسی اور لاچاری کی آخری حدوں سے گزرتے ہوئے اپنی ساری بچت گھر کا وہ رنگارنگ سامان خریدنے میں اڑاتا ہے جس سے وہ کٹوتی کے ایام میں محروم ہو چکے تھے اور جس کا اب وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔یہ اس کا وہ نفسیاتی موڑ ہے جو اس کی بیچارگی کی انتہا کا غماز ہے اور جسے وہ درد کی حد سے گزرنے پر نوشتہ تقدیر سمجھتا ہے۔ساتھ ہی یہ طنزیہ صورت بھی اختیار کرتا ہے اور پھر بیگم کا بت بننا، اور متکلم کے قدموں کا وہیں رک جانا، میاں بیوی کی بدلتی ذہنی کیفیات انسان کی مجبوری کا اشاریہ ہیں۔

ان کے یہاں ایسے افسانے بھی ہیں جو حالات کے مارے ہوئے کرداروں کی کھوئی ہوئی خوداعتمادی کی بازیابی یا بحالی کی تصویر کشی کرتے ہیں اور ''اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے'' والی بدلتی ذہنی کیفیت متشکل ہوتی ہے۔''ہونی انہونی'' میں اچانک کئی غنڈے مالک مکان کے گھر میں داخل ہورتے ہیں اور اسے اپنا آبائی مکان خالی کرنے کو کہتے ہیں، میاں بیوی سکتے میں آجاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں گھر چھوڑنا پڑے گا، کیوں کہ وہ کسی طرح بھی غنڈہ گردی کا سامنا نہیں کر سکتے، لوگوں کی ہمدردی زبان جمع خرچ تک ہی محدود رہتی ہے۔نتیجتاً وہ ہونی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، بیوی سوچتی ہے کہ اس کا شوہر مریل، بیمار، بے کار اور کاہل سا آدمی اسلحہ سے لیس غنڈوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا وہ سامان سمیٹنا چاہتی ہے، لیکن وہ اسے بہت سختی سے روکتا ہے، اس نے دو دن پہلے ہی یقین کو مضبوطی سے تھام لیا تھا، اس لئے اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں تھی، وہ گھر کے چھوٹے بڑے سب سامان کو مناسب ترین جگہ پر بہت قرینے سے لگاتا ہے:

''اور وہ آنے والے ہیں، اسے اٹھا اٹھا کر پھینکنے والے''
اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا اور وہ بہت ہی مستحکم لہجے میں بولا
''کس کی مجال ہے؟''
''لیکن وہ تو پھر آئیں گے'' اس کی بیوی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔
''دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے پروائی کے ساتھ آہستہ سے کہا اور

دوسری طرف کروٹ بدل لی۔''

افسانے میں مرکزی کردار کی یہ ذہنی تقلیب (Meta morphasis) انسانی نفسیات کی تغیر وتبدل کو اجاگر کرتی ہے، یہ کٹھن اور آزمائشی (Trying) سچویشن میں فرد کے اپنے آپ کی بازیابی کے مثبت رویے پر بھی دلالت کرتی ہے۔

بہر کیف، عبدالصمد کسی اختیار کردہ نظریے کے تحت افسانے نہیں لکھتے، وہ ذہنی آزادی کو عزیز رکھتے ہیں اور جدیدیت کی عاید کردہ حد بندیوں کو عبور کر کے مابعد جدیدیت کے رویوں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوی سفر میں کسی ایک مقام پر رک نہیں جاتے، بلکہ

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کی پاسداری کرتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ معاشرتی اور عصری زندگی کے تضادوں اور الجھنوں کے دائرے میں ہی رہتے ہیں اور اسی نوع کے انسانی مسائل کا سامنا کرتے ہیں اور یہی انسانی مسائل ان کے افسانوں میں صورت یاب ہوتے ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ یہ افسانے اپنی دلکشی، کہانی پن اور مطالعہ پذیری (Readalibity) پر برابر اصرار کرتے ہیں، اس کام میں ان کا نثری اسلوب غیر مطلوبہ شعریت اور توضیح وتفصیل سے احتراز کرتا ہے، حالانکہ بعض موقعوں پر وہ اس سے اپنا دامن بچا نہیں سکے ہیں۔ عبدالصمد کا تخلیقی سفر جاری ہے، پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اور ''ستاروں سے آگے کے جہاں'' ان کی دست رس میں ہیں۔

''زندگی کے مسائل''

ان کے افسانوں میں نظم، ترتیب، حسن، ربط، ہم آہنگی، ہمدردی، توسع، تدریب، تہذیب، تسلیم، تمثیل اور توقیر نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کے مسائل کو احتسابی کیفیات سے گذارنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اس فن میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ زندگی، سماجی اور فرد کے ساتھ ان کا ربط قائم ہے۔ ان کے افسانے اسی ربط کو ظاہر کرتے ہیں۔ عبدالصمد کے یہاں شعوری عمل ان کے دوسرے معاملات میں دخیل نہیں ہوتا۔ وہ شعوری عمل کو کسی بھی شخصی یا اجتماعی تبدیلی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے تجربات اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ عبدالصمد کے یہاں مقصد اصل چیز ہے۔ وہ کسی مقصد کے بغیر کوئی تخلیقی کام یا کسی تخلیقی پیش کش کو بے سود تصور کرتے ہیں۔ عبدالصمد کے یہاں ایک اعتماد کی فضا ہے، جس میں وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور انہیں بھی اس کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا اپنے ماحول سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس دریافت میں ان کے یہاں کچھ ایسے اظہارات ملتے ہیں جو ان کے کرداروں کو کسی عمل زائد کی طرف اپنی مرضی سے چلنے نہیں دیتے۔ عبدالصمد کا تخلیقی عمل ان کے لیے ایک مضبوط قلعہ کی طرح ہے۔ وہ اس قلعے میں اپنے دوسرے غیر تخلیقی اعمال کے ساتھ پناہ گزیں ہیں اور اس طرح اپنے تخلیقی عمل کو اجتماعی مفاد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اردو افسانہ ہر دور میں کسی ایسے اسلوب کا متلاشی رہا ہے جو واقعات کو اسی ترتیب وانتخاب کے ساتھ پیش کرے، جس ترتیب اور انتخاب کے ساتھ وہ پیش آتے ہیں۔ مگر اس بات کا لحاظ بھی ہو کہ کوئی ایسا واقعہ تحریری صورت میں آنے کے بعد اپنے اصل سے اس طرح الگ بھی ہو جس طرح ایک واقعہ طبعاً دوسرے واقعہ سے جدا ہوتا ہے۔ حالانکہ محض واقع ہونے کی حد تک وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتا ہے۔ عبدالصمد نے ایسا کام کیا ہے کہ ان کے یہاں واقعہ اصل سے صرف مشابہ نہیں ہوتا بلکہ خود اصل بن جاتا ہے اور افسانہ نگار جس واقعے کو نقل کرنے چلا تھا وہ خود نقل کی طرح معلوم پڑتا ہے۔ عبدالصمد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور تجربات کو تخلیقی شکل دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے موضوع اپنی داخلی تخلیقی منطق سے توثیق کراتے ہیں یا اس سے تصدیق کرانے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر اپنی تخلیقی منطق کا اشارہ یا اذن ملتے ہی قلم اٹھا لیتے ہیں۔ تخلیقی منطق کی توثیق کا عمل عبدالصمد کے یہاں کسبی بھی ہے اور عطائی بھی۔ اس کا تعلق اسی قدر اور مزاج سے ہے جو عبدالصمد کی تربیت میں معاون رہا ہے۔ اسی لیے عبدالصمد کے یہاں عام طور پر پیار ومحبت کے قصے نہیں پائے جاتے۔ ان کے تمام افسانے open society کے پروردہ ہے۔ یہ سب صاف ستھرے افسانے ہیں جو اعصابی کمزوری اور جنسی تلذذ پسندی کے اوصاف سے عاری ہیں۔ ان افسانوں نے فرد اور سماج کے رشتوں کو مضبوط کیا ہے اور ایک معیاری اخلاقی اور سیاسی شعور کو رواج دیا ہے، اسی کے ساتھ عبدالصمد کو ان کے ہم عصروں میں نمایاں مقام بھی عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال واجد (بھارت)

''خوابوں کا سویرا''

عبدالمغنی

(●)

ہندوستان میں قابل ذکر اردو ناول بہت ہی کم لکھے جا رہے ہیں۔ان میں تازہ ترین عبدالصمد کا ''خوابوں کا سویرا'' ہے۔اس کا موضوع آزاد ہندوستان کا تیزی سے بدلتا ہوا معاشرہ ہے،جس میں پرانی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور نئے مفادات ابھر رہے ہیں۔پورا ماحول سیاست زدہ ہو گیا ہے اور سماج جمہوریت کے نام پر انتخاب و اقتدار کے بھنور میں چکر کھا رہا ہے۔پارٹی پالیٹکس اور Power Politics نے انسانیت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہین، حسّاس اور دردمند افراد سیاست وقت سے کنارہ کش ہو کر خدمت خلق اور سماجی انصاف کے لیے خالص معاشرتی اداروں کی تلاش میں ہیں۔ان افراد کے ذہنوں پر ملک کی فرقہ وارانہ فضا اور اس میں ہونے والی بہیمانہ فسادات کا ردعمل بھی ہے، گرچہ ان افراد کا انداز نظر مثبت اور طریق کار تعمیری ہے۔اس سلسلے میں آزاد ہندوستان کے مسلم سماج، خاص کر نوجوانوں کے ذہن و کردار کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔اس لیے مصنف نے ناول کا انتساب حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''ان لوگوں کے نام جو ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر پیدا ہوئے''

یہ ناول ایک وسیع تناظر میں اور بڑے پیمانے پر تحریر کیا گیا ہے۔اس کی ماجرا سازی بہت چابک دستی سے کی گئی ہے اور اس میں عصر حاضر کے متعدد اہم رجحانات کی عکاسی ہوئی ہے۔اس کے علاوہ مختلف قسم کے دلچسپ اور موثر کردار سامنے آتے ہیں، جن کے طور طریقوں کا پرتو قصے کے رنگ و آہنگ پر پڑتا ہے۔کرداروں کے درمیان مکالمے بھی برجستہ، چست اور معنی خیز ہیں۔زبان بہت سادہ وصاف ہے جس سے عبارت کی روانی بڑھ جاتی ہے اور کہانی کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے مگر محاورۂ زبان اور الفاظ کے استعمال نیز جملوں کی ساخت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ ایک بڑے اور اہم فن پارے کی قدر و قیمت کے تعین میں کوئی الجھن نہ ہو۔کوئی فنی کارنامہ کلاسیک کا درجہ اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب متعلقہ صنف ادب کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی ہر جہت سے درستی و ہمواری ہو۔

ناول کا عنوان اس کے موضوع کی نشان دہی کرتا ہے۔بہار کے تاریخی شہر ''گیا'' کے ایک اعلیٰ خاندان کی دو نسلوں کے افراد نے، تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد، ملک کی آزادی اور سماج کی ترقی کے لیے کچھ سہانے خواب دیکھے ہیں اور ان کی سچی تعبیر کے لیے بصیرت اور ہمت اور ایثار و قربانی کے ساتھ جدوجہد کی ہے، تاریکیوں سے روشنی میں آنے کے لیے ان کی کچھ آرزوئیں ہیں اور وہ ہر شب کو سحر کرنے کی امنگ رکھتے ہیں۔تمام مشکلوں، مصیبتوں، ہنگاموں، تہلکوں اور آزمائشوں کے درمیان وہ ایک طویل مدت تک فتنہ وفساد کے جاں گداز مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اپنے اونچے آدرش پر قائم رہتے ہیں اور واقعات و تجربات کی روشنیم یں سنگین حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے پسندیدہ نصب العین کو ترک نہیں کرتے، یہاں تک کہ جب ان کے حسین خوابوں کا سویرا ایک داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تب بھی وہ بالکل مایوس اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ نہیں جاتے بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ عام انسانیت کی فلاح کے لیے زندگی بھر کام کرنے کا ایک نیا راستہ نکال لیتے ہیں۔چنانچہ ناول کا انجام ایک نئے سفر کے آغاز کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یاد ماضی سے غمگین اور دہشت فردا سے نڈھال نئی نسل میں بھی ایسے حوصلہ مند افراد پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

یہ دراصل بیسویں صدی کے ہندوستان کی المناک صورت حال میں رجائیت کا ایک پیغام ہے۔خواہ اس سے کسی تابناک مستقبل کی واضح نشاندہی ہوتی ہو یا نہیں اور تاریک راہوں کے مسافروں کو کسی بہت روشن منزل کا سراغ ملتا ہو یا نہیں، ناول کے قصے کی دوسری یا نئی نسل کے اہم ترین کرداروں کا مثبت رویہ اور تعمیری رجحان بجائے خود امید کی ایک کرن اور حوصلہ مندی کی ایک مثال ہے، جس سے کم از کم منفی اور تخریبی رجحانات کی نفی ہوتی ہے۔

ناول کا ماجرا یہ ہے کہ انوار احمد ابن خان بہادر ضمیر الدین احمد کی زندگی میں ایک بحران اس وقت آیا جب ہندوستان آزادی کی آمد کے ساتھ ہی تقسیم ہو گیا اور ایک طرف فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو دوسری طرف انتقال آبادی ہوا۔انوار احمد شہر گیا کے سب سے بڑے رئیس کے فرزند اکبر، تحریک آزادی کے ایک نمایاں مجاہد اور ضلع کانگریس کے صدر تھے، جب کہ ان سے چھوٹے دو سوتیلے بھائی، صابر وجابر، ہوشیار کاروباری تھے۔انوار احمد ایک کشادہ دل اور کشادہ دست زمیندار تھے، لیکن اپنی قوم پرستانہ سیاست میں وہ کبھی اقتدار کے طالب نہیں ہوئے، صرف خدمت خلق کرتے رہے اور حکومت کے کسی عہدے پر فائز نہیں ہوئے۔آزادی کے چند ہی سال بعد زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے انوار احمد کی معیشت کمزور ہو گئی جب کہ ان کے لاکھوں کے خاندانی زیور اپنے ساتھ لے کر ان کے سالے مصطفیٰ اور مجتبیٰ پاکستان چلے گئے۔اس لیے کہ انوار احمد کی بیوی نے پوشیدہ طور سے، مستقبل کی امید پر، جو کبھی پوری نہیں ہوئی، یہ زیور اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیے۔وقت گزرنے کے ساتھ صابر وجابر زیادہ سے زیادہ دولت مند ہوتے گئے اور انوار احمد زیادہ سے زیادہ تنگ دست، سوتیلے بھائی باپ کی زندگی ہی میں اپنی الگ حویلی بسا چکے تھے اور بڑے بھائی کے ساتھ ان کا ربط تقریباً ختم ہو چکا تھا۔اس عالم میں بھی انوار احمد نے وضع داری اور کنبہ پروری برقرار رکھی یہاں تک کہ خاندانی ملازم لیاقت

میاں کے علاوہ رشتہ دار فخرو چچا کی بھی ان کی بیوی کے ساتھ ساتھ کفالت کا بار انوار احمد اٹھاتے رہے۔ اس حالتم یں ان کا اکلوتا بیٹا آفاق جوان ہوا تو اس کی اعلیٰ تعلیم کا سامان مشکل سے ہوسکا۔ مگر وہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد اصحاب اختیار سے بغاوت کر کے طلباء کا لیڈر بن گیا، جیل میں ڈالا گیا اور رہائی کے بعد گھر آ کر بیٹھ گیا۔ صابر کے لڑکے وسیم اور شمیم انگلستان وغیرہ یورپ کے ملکوں میں چلے گئے جب کہ جابر کی بیٹی کلثوم شہر ہی میں پڑھ لکھ کر ایک مشہور سماجی کارکن بلکہ رہنما بن گئی۔ اس لڑکی کے اس انقلابی کردار سے آفاق کو اتنی دلچسپی ہوئی کہ وہ اس سے خاموش محبت کرنے لگا۔ حالات کی نئی کروٹ نے آفاق کو بھی ایک ہر دلعزیز لیڈر بنا دیا اور وہ بھی باپ کی طرح، گرچہ مختلف حالات میں، ڈسٹرک کانگریس کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں پرویز نام کے ایک یوتھ کانگریس لیڈر نے ایک قسم کی محلاتی سیاست میں آفاق کی مدد کی، گرچہ آفاق خود باپ کی طرح ایک باکردار اور خدمت گزار رہنما کا رول ادا کرتا رہا، حالانکہ بعض اوقات اسے چند امور میں سمجھوتا بھی کرنا پڑا۔ آفاق اور کلثوم کا رشتہ طے ہو گیا، مگر انہیں سماجی مصروفیات کے سبب ایک مدت تک شادی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ صابر کا بیٹا شمیم تو یورپ سے لوٹ کر گھر نہیں آیا، لیکن دوسرا بیٹا وسیم انگلستان میں ایک امریکی خاتون کے ساتھ ناکام ازدواجی زندگی گزار کر اور کچھ بری عادتیں اختیار کر کے ہندوستان لوٹ آیا۔ پھر اپنی عیّاری سے مرکزی سطح پر کانگریس کے اقلیتی سیل کا انچارج بن گیا۔ گرچہ اپنے گھر سے وہ نہ صرف بیگانہ رہا بلکہ غائب ہو گیا۔ شہر اور علاقے میں ماضی کی طرح پھر ایک ہولناک فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں حکام اور حکمراں جماعت کے فرقہ پرست لیڈروں نے بھی بلوائیوں کی حمایت کی۔ ان واقعات کی رپورٹ لے کر آفاق دہلی گیا تو کسی صاحب اقتدار نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور وہ اپنے مشن میں ناکام ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اس نے حکمراں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور بالآخر اپنی منگیتر کلثوم کے ساتھ فلاحی سرگرمیوں میں شریک ہو گیا۔ یہ دو مثالیت پرست کرداروں کا ازدواج تھا جس سے ایک نئی اور شاید بہتر نسل کی توقع ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئی جس کے افق پر ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قصّے کا یہ نقطۂ عروج بہت فکر انگیز ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ پرانی نسل کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔

یہ ماجرا جدید ہندوستان کے ایک نمایاں اور نمائندہ مسلم خاندان کا ہے، جس کے درد و غم کی بنیاد وہ فرقہ پرستی ہے جو پچھلی ایک صدی سے برصغیر پر چھائی ہوئی ہے اور آزادی کے بعد نصف صدی کے اندر بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا زوال بھی ہے، جو پورے سماج پر محیط ہے، سیاست، معیشت، مذہب، تعلیم سبھی شعبہ ہائے زندگی اس زوال سے بری طرح متاثر ہوئی۔ ان حالات میں نسلوں کی تبدیلی اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج بھی ہے۔ یہ صورت حال کسی ایک فرقے یا طبقے تک محدود نہیں، اس کی زد کم و بیش ہر فرقے اور طبقے پر پڑی ہے۔ جمہوریت کی منطق نے اکثریت اور اقلیت کی تفریق ضرور کر دی ہے اور پرانے تعصّبات بالخصوص تحریک آزادی کے دوران میں برپا ہونے والی سیاسی کش مکش نے اس تفریق کو فرقہ وارانہ رنگ بھی دیا ہے۔ خاص کر آر ایس ایس جیسی ہندو تنظیموں کی دہشت گردی نے اس رنگ کو زیادہ سے زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ مگر اچھے برے افراد ہر فرقے اور طبقے میں پائے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرح ہندوؤں میں بھی اصول پسند، انصاف پسند اور انسانیت نواز افراد موجود ہیں جن کی وجہ سے جمہوریہ ہند کے سیکولرزم یعنی مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کا بھرکسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔ ناول میں اگر انوار احمد اور آفاق نیز کلثوم جیسے اعلیٰ کردار کے مسلمان پائے جاتے ہیں تو کملا پتی سنگھ اور متّا لال جیسے بلند خیال ہندو بھی۔ یہ گویا مایوسیوں کی تاریکی میں امید کی وہ کرنیں ہیں جن سے ہندوستان کے مستقبل کے افق پر روشنی کے کچھ آثار تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس تلاش میں مسلمانوں کی نئی نسل کے نمائندوں، آفاق اور کلثوم کا عزم راسخ کامیابی کے امکانات کی طرف ایک اشارہ کرتا ہے۔

ناول کے بڑے کرداروں کے علاوہ ایک چھوٹا سا اور بظاہر مخبوط الحواس کردار، فخرو چچا سب سے دلچسپ، پرالم اور عبرت انگیز ہے۔ وہ آخری سانس تک اس امید پر جیتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو کر بچھڑے ہوئے عزیز و رشتہ دار دوبارہ ایک دوسرے سے ملیں گے اور اجڑے ہوئے خاندان آباد ہو جائیں گے۔ یہ معمولی سا کردار بعض اوقات غیر معمولی کام کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب آفاق کو علی گڑھ بھیجنے کے لیے انوار احمد اپنی تنگ دستی کے سبب وسائل کی فراہمی سے ناامید ہو جاتے ہیں تو فخرو خاموشی سے اپنے بعض خاندانی زیور بیچ کر جس کی خبر اس کی غریب بیوی تک کو نہیں ہوتی، کافی رقم مہیا کر دیتا ہے اور مرتے وقت باقی ماندہ زیورات کی بھی پوٹلی اپنی بیوی کے بجائے آفاق کے حوالے کر دیتا ہے۔ یقیناً یہ قابل ذکر کردار آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی بعض محرومیوں اور حسرتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس طرح کامریڈ ہاشمی کا کردار ذیلی ہونے کے باوجود جن تبدیلیوں سے گذر کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے وہ فکر انگیز ہیں۔ انوار احمد کی بیوی اور آفاق کی ماں عالیہ خاتون چراغ خانہ کی طرح جلتی ہوئی اپنے خاندان میں اجالا کئے رکھتی ہے۔ فخرو کی بیوی بھی اپنی مسکینی کے باوجود ایسی ہی ایک عورت ہے۔ ضمیر الدین احمد کا خاندانی ملازم لیاقت، وفاداری بہ شرط استواری کی ایک مثال ہے۔ استاد قمرو میاں اپنی بنوٹ کی ہلکی سی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن یاد رہتے ہیں۔ انور کی تھوڑی سی دہشت گردی بھی غیرت مندی کی ایک شان رکھتی ہے۔ رحمو خاں موجودہ مسلم سماج پر پڑنے والی ایک پرچھائیں ہے جو عام ہندوستانی معاشرت اور معیشت کی کڑی دھوپ کا جس میں مسلمان تپ رہے ہیں فقط ایک سایہ ہے۔ گرچہ ناول نگار کی نگاہوں کے سامنے اس دھوپ کی تمازت نہیں ہے اور اس نے سطحی طور پر صرف پرچھائیوں کو دیکھا اور دکھایا ہے۔ بڑے کرداروں کے جلو میں ان چھوٹے چھوٹے کرداروں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ماجرا سازی

کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کی بھی بڑی صلاحیت رکھتا ہے۔انوار احمد اور آفاق، جابر اور کلثوم، فخرو چچا اور ہاشمی سب یاد رکھے جانے والے کردار ہیں۔ عالیہ، لیاقت، قمرو میاں، رحمو خاں، کملا پتی سنگھ، منّا لال، پرویز، انور اور وسیم کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

''خوابوں کا سویرا'' ایک مکمل، کامیاب، دلچسپ اور پر اثر ناول ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے اس میں حالات حاضرہ اور موجودہ مسائل پر غور وفکر کا بھی کافی سامان ہے۔ یہ جدید ہندوستان کے ماحول کا بہ یک وقت سیاسی اور سماجی دونوں قسم کا مطالعہ ہے۔اس مطالعے میں ایک عمرانی تجزیے کی جہت نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں ناول نگار نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور قصّے کی بنیاد اسی زمیں پر رکھی ہے جس سے وہ براہِ راست اور اچھی طرح واقف ہے۔ گرچہ اس زمین پر باہر سے آنے والی ہواؤں کا بھی کچھ نقشہ اس نے صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے مثلاً وسیم کی غیر ملک میں ناکام شادی اور اس کی خانہ بربادی کا بیان موجودہ مغربی سماج کی قلعی کھول دیتا ہے اور اس کی بے راہ روی کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ ناول نگار کے انداز نظر میں بہر حال اخلاق پسندی اور ترقی پسندی کے درمیان ایک کشمکش سی ہے، وہ ذہنی طور پر اپنی مشرقی تہذیبی قدروں سے وابستہ ہے مگر رنگ زمانہ نے اس مشرقی تہذیب میں رائج الوقت مغربی تہذیب کے جو میلانات پیدا کر دیئے ہیں وہ ان کا اثر بھی قبول کرتا ہے۔اس کی ایک مثال عالیہ خاتون جیسی چراغ خانہ کے بالمقابل کلثوم جیسی شمع محفل کا نمودار ہونا ہے، خواہ یہ شمع آفاق جیسے صاف ستھرے جوان کے فانوس ہی میں جلنے والی ہو۔ اسی طرح نیشنلزم اور سیکولرزم کو ناول نگار نے جس طرح بلا شرط قبول کیا ہے جب کہ دونوں کے بعض تاریک پہلوؤں سے اپنی واقفیت کا اظہار بھی وہ قصے کے متعدد واقعات میں کرتا ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے ان موضوعات پر ابھی بہت زیادہ وسعت اور گہرائی سے غور وفکر نہیں کیا ہے۔ بہر حال یہ ناول بجائے خود ایک شاندار ادبی تخلیق ہے اور عبدالصمد کے فن کے ارتقا کی اگلی منزل۔

''خود شکن قلمکار''

گذشتہ برسوں میں بعض ایسے ناولوں سے سابقہ پڑا جو کئی اعتبار سے ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔سب سے اہم بات یہ کہ ناول کا فن جس قسم کے علم و باخبری کا متقاضی ہے اس معیار پر یہ پورا اترتے ہیں نیز یہ کہ ہر ناول اپنے موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے، یہی چیز عبدالصمد کے ناولوں کو بھی ایک الگ منصب عطا کرتی ہے۔وہ بڑے خود شکن واقع ہوئے ہیں۔ان کے علم اور تجربات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کسی ایک ناول کی گونج کسی دوسری ناول میں سنائی نہیں دیتی۔''شکست کی آواز'' ایک کرداری ناول ہے۔ایک بڑے عرصے کے بعد ایک کامیاب ترین کرادری ناول کو پڑھنے کا موقع ملا۔پہلی مرتبہ یہ علم بھی ہوا کہ عبدالصمد ''ورق ناخواندہ'' کے ایک ایک بین السطور معنی سے بھی آگہی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔وہ کردار کے ضمیر و باطن کی تہہ داریوں میں اترنے اور کھُب جانے والی نگاہ بھی رکھتے ہیں۔عبدالصمد نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ندیم کے اس نفسی تفاعل سے پردے اٹھائے ہیں جو ہمارے لیے اتنا نامانوس بھی نہیں لیکن اس کی اپنی نزاکتیں بھی ہیں جن کا تعلق ہمارے نظام محسوسات و نظام اعصاب سے ہے۔عبدالصمد نے انہیں کسب کرنے اور ندیم ہی نہیں ہمیں اپنے اندر سے باہر نکالنے میں جس کمال فن کا ثبوت دیا ہے اس کا تاثر ان کے دوسرے ناولوں سے قطعاً مختلف ہے۔''شکست کی آواز'' میں انہوں نے اپنے آپ کو اندر سے مجتمع کرنے اور پھر بکھیرنے کی سعی کی ہے۔باہر کی دنیا کے انتشار کو تو وہ کئی بار معنی فراہم کر چکے۔انہیں ایک نئے معنی کی تلاش تھی جس کا رخ اندر کی طرف ہو۔ یہاں پہنچنے پر شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اس پردۂ نگاری کے پیچھے خود مصنف تو نہیں ہے۔ کیونکہ کرداری ناول میں ناول نگار اپنے خلق کردہ کردار کے ساتھ نفسیاتی اور جذباتی ہم آہنگی قائم کئے بغیر اسے ایک زندہ اور متحرک کردار کے پیکر میں نہیں ڈھال سکتا۔اپنی انتہائی پیچیدہ ترین نفسی گرہوں کی فہم سے ہو کر دوسرے کے باطن تک پہنچنے والی ایک راہ جاتی ہے۔ایک ایسی ہی راہ سے ہم ''شکست کی آواز'' میں بھی دوچار ہوتے ہیں۔ میری نظر میں یہ ناول ہمارے دور میں لکھے ہوئے دو چار اہم ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔اور عبدالصمد کے دوسرے ناولوں سے بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

عتیق اللہ

شب گزیدہ سحر

شفیع جاوید

(بھارت)

ایک مستند دانشور بس سے سفر کررہے تھے کہ ایک جگہ ان کی بس رکی تو ان کے پہلو میں نہایت ہی ہونق قسم کا ایک شخص آ کر بیٹھ گیا جو بظاہر کسی بھی طرح ان کا ہمسفر ہونے کے لائق نہ تھا۔ انہیں سخت کوفت ہوئی۔ وہ خود کو سمیٹ کر بیٹھے رہے، کرتے بھی کیا؟ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتے رہے کہ جانے کب تک یہ ہونق ان کے ساتھ چپکا رہے گا۔ کچھ دیر کے بعد اس شخص نے کچھ بولنا چاہا تو دانشور نے منہ پھیر لیا، وہ چپ رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد جب انہوں نے پہلو بدلا تو اس ہونق پینکی شخص نے کہا ''اِن درختوں، ان پتیوں کو، ان باغوں اور فصلوں کو اگر خدا نے سبز رنگ نہ دیا ہوتا تو قدرت کے مناظر کا کیا رنگ ہوتا؟'' دانشور کو محسوس ہوا کہ گویا ان کے ذہن کو کسی نے جھنجھوڑ دیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اگلے سٹاپ پر وہ شخص مسکراتا ہوا ان سے رخصت ہوگیا۔ اس کے اس جملہ پر وہ جتنا سوچتے گئے ان کی حیرت بڑھتی گئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ اس ایک جملہ میں وہ پوری دنیا رکھ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ لگاتے ہوئے وہ اس تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک عظیم مصور تھا۔ اس سے مل کر انہوں نے اپنی بداخلاقی کی معافی مانگی اور اس کے ساتھ شیر وشکر ہو کر انہوں نے بلند تخلیقی منزلیں طے کیں۔ کچھ ایسا ہی واقعہ عزیز القدر عبدالصمد کے ''خوابوں کا سویرا'' کے ساتھ ہوا۔ کتاب آئی، رکھ دی گئی، رکھی رہی، ایک دن بے دلی سے چند اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے گئے۔ میری عادت ہے کہ شروع میں اسی طرح الٹ پلٹ کر چند اوراق بے دلی سے دیکھا کرتا ہوں اور اندازہ لگاتا ہوں کہ اس کتاب میں کیا قوت ہے، مجھے پکڑتی ہے یا نہیں، اگر اس نے پکڑ لیا تو پھر میرا مطالعہ باضابطہ شروع ہوتا، ورنہ میں اس کتاب کو چھوڑ دیتا ہوں۔

اوّل اوّل ''خوابوں کا سویرا'' کا بے ربط مطالعہ جو شروع کیا تو صفحہ ۲۷۳ سامنے آ گیا۔

''مکینوں کا حال یہ تھا کہ اگر اچانک کوئی وہاں آ جائے تو اسے فخرو چچا کا **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین** کا، کبھی کمپنی کا بھی وہ دور مجرمانہ یاد ہے۔۔۔ کا کمزور ونحیف ورد سنائی دیتا۔ سائبان پر آنکھوں اور ہاتھ پیر سے معذور لیاقت میاں بیٹھے دکھائی دیتے۔ ایک پرانی کرسی پر گھر کے دھوئے ہوئے سفید کپڑے پہنے، اخبار پڑھتے ہوئے انوار احمد نظر آتے، چلمن سے لگی ہوئی عالیہ خاتون اور ان کے پیچھے فخرو چچا کی بیوی، جن کی نگاہیں پھاٹک پر پتہ نہیں کس کے انتظار میں سلگتی رہتیں۔ اگر فسادیوں کی بھیڑ یہاں چلی آتی تو انہیں کتنی راحت ہوتی؟ آفاق اپنے گھر میں داخل ہوا تو اچانک اسے یہی منظر دکھائی دیا اور فوراً یہی خیال اس کے ذہن میں کوند گیا۔

نہیں۔۔۔ اس جنون کو روکنا بہت ضروری ہے، مقابلہ اس کا کوئی حل نہیں اور مقابلہ بھی کیا، بس اپنے دل کی تسلی ہے ورنہ۔۔۔''

ایک لرزہ سا طاری ہوا ''اور مقابلہ بھی کیا؟'' کے مقام پر جانے کیوں گئے بیتے برسوں کے مرادآباد عیدگاہ کی یاد آ گئی اور اس کے ساتھ ہی صفحہ ۴۲۹ کھل گیا:

''پولس۔۔۔؟ آپ کو پتہ ہے ابا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے بلکہ پولس کے ذریعہ باقاعدہ قتل عام کیا جاتا ہے۔ چندیری کا واقعہ تو ابھی تازہ ہے جہاں درجنوں معصوم لوگ، عورتیں، بچے، پولس کے ذریعہ ذبح کر دیئے گئے، پھر بھی ہمارے ملک میں کسی کا ضمیر بیدار نہیں ہوا، کسی کی سوئی ہوئی آتما نہیں جاگی، کوئی بابا آمتے امن مشن لے کر نہیں آیا۔ کسی نرملا دیش پانڈے نے اس کے خلاف پدیاترا نہیں کی، کیوں؟ کیوں کہ ان مظلوموں سے کسی کو ہمدردی نہیں، یہاں جانوروں کی بے بسی پر رونے والی آنکھیں بہت ہی لیکن ان مظلوموں کی آہیں سننے والا کوئی نہیں۔ امریکہ جیسے ملک کو مائی رائی کے واقعہ پر ویتنام کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا، یہاں کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی اور آپ پولس کی بات کرتے ہیں ابا''

اس پیراگراف کے بعد میری آنکھیں جلنے لگیں اور باوردی مجرموں کے انصاف کی یاد آنے لگی۔ کیسی دل ہلا دینے والی حقیقت نگاری ہے؟ مجھے سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ صفحہ ۱۴۵ سامنے آ گیا:

''اب میں اپنے دل کا کیا کروں، میں بھی تو مجبور ہوں، یہ تو ذرا سوچیے۔۔۔''

''ہاں بھئی، ہم سب مجبور ہیں، یہ تو مجبوروں کی دنیا ہے۔''

انوار احمد کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر تاسف بھرا ہوا تھا، جسے عالیہ خاتون محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

''نہیں جی، آپ اتنے مجبور کیوں بنتے ہیں، آپ صرف مجھے مجبور رہنے دیجئے، آپ ہمیشہ مضبوط رہئے ورنہ پھر ہم سب زندہ رہ سکیں گے؟''

اس کے بعد جب صفحہ ۳۷۴ آیا:

''۔۔۔ ہم نے اقلیت کے مفاد کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے ایک باقاعدہ سیل (Cell) قائم کیا ہوا ہے جس کا انچارج ہم نے امریکہ سے آئے ہوئے ایک بہت پڑھے لکھے مسلمان کو بنایا ہے جو صحیح معنوں میں اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

تو اس ناول نے مجھے جکڑ لیا۔ اس صفحہ پر مجھے لگا کہ عبدالصمد نے ایک بھرپور طمانچہ مارا ہے اُس پورے سسٹم پر جو کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ اور ہے۔ صفحہ ۴۷۹ اور ۴۸۰ پر بیوروکریسی کے کھوکھلے پن کا اظہار جس حوصلہ اور سچائی کے ساتھ فائلوں کے حوالے سے مصنف نے کیا ہے اس کا دوسرا کوئی نمونہ میری نظر سے اب

تک نہیں گزرا ہے۔ مارواڑی کا منشی کہا کرتا ہے، وسیم کو برہنہ کر کے مصنف سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اقلیتی سیل بھی قائم ہے اور فائلیں بھی مرصع کیبنٹ میں سجی ہیں۔ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی''، ''عرب اسرائیلی جنگ''، ''اوّلیت کے آئینی حقوق''، ''فرقہ وارانہ فسادات''، ''بنگلہ دیش میں پھنسے بہاری''، ''اردو''، ''شاہ بانو کیس''، ''سلمان رشدی''، ''رام جنم بھومی''، ''بابری مسجد''۔۔۔ حالانکہ حقیقتاً یہ ہوتا ہے کہ ''وسیم نے بڑی فائلیں ایک ایک کر کے کیبنٹ میں سجا دیں، آفاق کی فائل جس کا بھی فیتہ بھی نہ کھلا تھا، دوسری فائلوں کے انبار میں گھسا دی۔۔۔''

اس کے بعد باضابطہ مطالعہ صفحہ درصفحہ اور بین السطور شروع ہوا تو ''خوابوں کا سویرا'' کی مختلف جہتیں سامنے آتی گئیں اور آخرش یہ اندازہ ہوا کہ ناول نگار نے سب کچھ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور سچ کہا ہے۔ سچ کا گھر دل ہوتا ہے اسی لیے اس کا موثر ابلاغ ہوتا ہے۔ درِ دل پہ دستک دیتا ہے۔ ناول کا پورا مواد صداقتوں میں پیوست ہے۔ عاجزی اور منافقانہ مفاہمت کہیں نہیں ہے۔ جو کچھ ہے برملا ہے، روبرو ہے، یہ مجاہدۂ فن ہے۔ کوئی Prescription یا ناصحانہ انداز کہیں نہیں ہے، یہ معجزہ فنکاری ہے۔ اس موقع پر فارغ بخاری کے دو اشعار یاد آ گئے:

قتل گاہوں میں جو گلزار کھلا بھی نہ سکیں
ظلم کو ظلم تو کہنے کی جسارت کر لیں
فن کی عظمت کے لیے، لفظ کی حرمت کے لیے
آؤ سچائیوں کے ہاتھ پر بیعت کر لیں

مکمل مطالعہ کے بعد اس کا یقین ہوا کہ عبدالصمد نے سچ کے ہاتھ پر بیعت کیا ہے اور ظلم کو ظلم کہنے کی جسارت پورے طور سے رکھتے ہیں۔ یہ ہی فن کی عظمت بھی ہے اور لفظ کی حرمت بھی۔ عبیداللہ علیم نے لکھا ہے:

''میرے خیال میں ایمانیات کا مسئلہ ہی ادب کا اصل ہے اور ایمانیات یہ کہ خالق کا نام بتا دے۔''

بہت دن ہوئے شوکت سبزواری نے کہا تھا:

''ادب کا زندگی سے جو ناتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ زندگی کی تضاد کاری کی جھلک ادب میں بھی نظر آئے۔۔۔ ان متضاد میلانات میں توازن قائم رکھنا ادب ہے، ان الجھنوں سے سلجھن پیدا کرنا ادب ہے، ان کے پیچ وخم کو قائم رکھتے ہوئے ان میں سیدھی راہ نکال لینا ادب ہے۔ یہ بھول بھلیاں ضرور ہے لیکن کامیاب وہ ہے جو اس بھول بھلیاں سے بچ کر نکل آئے اور اس میں کھو نہ جائے۔''

گورکی نے فکر کی پرواز کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے کہیں کہا تھا کہ واقعات کی سطح سے بلند ہو کر واقعات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان تناظر میں بھی عبدالصمد کس قدر کھرے اترتے ہیں، عاجزی اور منافقانہ مفاہمت کہیں نہیں ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اور یہ ہی برملا کہہ گزرنے کا حوصلہ بھی ان کے تخلیق کی گواہی ہے۔ ظلم، جبر، استحصال، سیاسی غلامی کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں عبدالصمد کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے۔ یہ ناول زندگی کی متعدد جہتوں کا عکاس ہے۔ یہ ہماری تہذیبی، سماجی اور ثقافتی زبوں حالی کا داستان پارینہ بھی ہے، سفر بے سنگ ومیل کا بیان بھی ہے اور تاریخی بصیرت کا آئینہ خانہ بھی۔ اس طرح تضادات کی الجھنوں سے بچ کر زندگی کی بھول بھلیاں سے انہوں نے اپنی راہ نکال لی ہے اور یقیناً بغیر جذباتی Involvement کے واقعات کی سطح سے اوپر اٹھ کر مکمل ایمانداری سے کہہ گئے ہیں کہ:

جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

عبدالصمد نے اس ہراساں انسان کو دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو اپنی گہری اور بنیادی کیفیات سے تشخص پاتا ہے۔ ان کا فن زندگی کرنے کا حق طلب کرتا ہے، وہ دنیاداری اور مصلحت اور عاجزی کا شکار نہیں ہے اور انہوں نے اس خاک سے رشتہ جوڑ کر لکھا ہے جس سے جھوٹ، ناانصافی، بے ایمانی اور استحصال نمو پاتے ہیں۔ یہ کالے سمندروں کا سفر ہے، یہ زندگی کا تانڈو نرتیہ ہے، زندگی اور سمئے کے کھیل بڑے نرالے ہیں، زندگی کی گلیاں دھول اڑاتی ہیں، مڑتی چلی جاتی ہیں، کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، سسکیاں ابھرتی ہیں، عبدالصمد ہر موڑ اور ہر آواز سے واقف ہیں اور سب کو آئینہ بناتے ہیں۔ ''خوابوں کا سویرا'' کہیں حیران وششدر کرتا ہے، کہیں مرعوب ومتاثر اور کبھی اشکبار و دل گرفتہ۔ اس آئینہ خانہ میں انوار احمد ملتے ہیں جنہوں نے صبر آزما مراحل میں بھی ظرف اور ضمیر کو سپر بنایا، عالیہ بیگم مسلم معاشرہ کی دبی ہوئی سسکی، فخرو چچا کھوئی ہوئی جنت کی تلاش، پرویز سیاسی بساط کا ایک معمولی مہرہ، ایک سیاسی دلال جو دوسروں کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر چلاتا ہے اور سیاست کو ملوث کرتا ہے، کئی دوست کی وحشت میں مبتلا جابر، ہندوستانی بیوروکریسی کی بوسیدہ کتاب کا پھٹا ہوا ایک ورق صلاح الدین، ناراض اور حوصلہ مند نوجوان انور جو باپ کو چھٹا ہوا کارتوس سمجھتا ہے اور انہیں فلسفہ شتر مرغ کے نشہ سے آزاد کرا کر اپنے گھر کی حفاظت کرنا چاہتا ہے، وسیم امریکہ پلٹ منافقوں کی بہترین مثال ہے جسے Show boy بنا کر حکمراں دھوکہ کی ٹٹی کھڑا کرتا ہے، منالال جو فرقہ وارانہ آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور انسان ابھی پورے طور پر امر نہیں ہے، اس کی نشاندہی کرتا ہے اور آفاق اور کلثوم ہیں جو گھٹا ٹوپ تاریکی میں دو جھلملاتے دیئے ہیں اور ان کی بے زبانی کہتی ہے:

ہے اعتراف ہمیں ظلمتوں میں بستے ہوئے
سحر کی رکھتے ہیں خواہش بڑی خطا کی ہے

اس صدی کا دوسرا نصف مسلمانوں کے لیے اپنے آپ میں ایک صدی ہے جو بھٹکی ہوئی روح کی رح ویرانوں کو نکل گئی۔ پروانے تو اسے کہیں نہیں ملے ہاں دیوانوں نے اسے ضرور گھیر لیا۔ ''خوابوں کا سویرا'' کا آغاز عام قاری کے لیے بٹوارہ سے ہوتا ضرور ہے لیکن یہ ایک وسیع عصری تاریخی کارنامہ کے ساتھ ابھرتا ہے جس میں اقدار کی شکست، انسان دوستی کا خون اور نفرت کی نئی سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کسی مجرد تجربہ کا بیان نہیں ہے بلکہ عصری حسیت کے ساتھ بدلتے ہوئے ادوار کی روداد ہے۔

یوں دیکھئے تو "خوابوں کا سویرا" میں کچھ بھی نیا نہیں، نہ اسلوب، نہ انداز، نہ فارم۔ آپ حیران ہوں گے کہ آخر اس نے مجھے جکڑ کیسے لیا، تو عرض کروں کہ اس کا سب سے اہم پہلو ہے واقعات و گردوپیش کی طرف اس کا Response۔ عبدالصمد کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اصحاب وکہف کی طرح غار میں پناہ گزیں نہ رہے بلکہ وسیع عصری موضوع سے اردو ناول نگاری کو انہوں نے گرم لہو مہیا کیا ہے۔ ان کی جستجو اس خرابے کی اسیر ہے جو ہمارا مقدر ہے۔ خیروشر کے جس پیکار کا اظہار یہاں ہے وہ زندگی اور انسان سے ان کی پرخلوص وابستگی پر اصرار کرتا ہے۔ ان کا سماجی شعور بے حد استوار اور انسان دوستی ایمان کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ اس ناول کا نمایاں ذائقہ تلخی ہے لیکن اس کے باوجود عبدالصمد کا فن منفعل نہیں ہے۔ ریاکاری، منافقتوں، تضادات اور مظالم کی عکاسی کے باوجود "تنفر" کا شائبہ کہیں نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے سب کچھ صرف اپنی ذات کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ وسیع تناظر میں پورے معاشرے کے حوالے سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ یہ سماجی تبدیلیوں کا غیر جذباتی تجزیہ ہے اور اسی کو زندگی آمیز اور زندگی آموز فن کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار کی پامالی کا سوالنامہ مرتب ضرور کرتا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ سوالیہ نشان کہیں نہیں اور آشوب کی جو فضا تیار ہوتی ہے اس میں کوئی بازگشت سنائی نہیں دیتی حالانکہ مسموم معاشرہ اور سماجی مسائل سے مصنف کی مربوط وابستگی زیریں لہروں کی طرح پورے بیانیہ میں موجود ہے۔

"خوابوں کا سویرا" میں شکستگی تو ہے لیکن برگشتگی نہیں، اضطراب ہے لیکن فغاں کہیں نہیں۔ تعمیری ربط اور تخلیقی تسلسل شروع سے آخر تک میں نے پایا۔ پابند ہیئت میں اظہار آسان ضرور ہو جاتا ہے اور موثر بھی لیکن تخلیقی امکانات کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عبدالصمد اس پل صراط کو بھی بخوبی پار کر گئے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کا بیان اتنا آسان نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے، حال سے ماضی اور ماضی سے حال اور پھر مستقبل کی جھلکیاں فنکار کے لیے بڑا پیچیدہ عمل ہوتا ہے، اس کی بنت (Knitting) میں پختہ فنکاری کی ضرورت ہوتی ہے، اس ناول میں یہ کارِگراں بھی بخوبی کیا گیا ہے۔

عبدالصمد اس طرح Effortless لکھتے ہیں جیسے کوئی بغیر باضابطہ تعارف کی باتیں شروع کردے۔ بے تکلفی، روایتی انداز سے بے نیاز لیکن باتیں کرتے کرتے لگے گویا سالہا سال ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بس اسی طرح بے تکلفی اور خلوص کے ساتھ وہ قاری کو انگلی لگائے پھرتے ہیں۔

یہ ناول دراصل بارشِ سنگ ہے، سید ھا دل میں اترتا ہوا، نہ ترکیب سازی ہے نہ کرتب بازی، مخصوص اور مبہم مفہوم تراشی سے شعوری طور پر گریز کیا گیا ہے تاکہ تاریخی اور عصری عنصر اجاگر ہوسکیں۔

مسلم معاشرے کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو سمجھنے کے لیے "خوابوں کا سویرا" سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ معاشرتی کوائف، اجتماعی شعور اور جمی جمائی قدروں کی ٹوٹ اور اداسیوں کا سیل رواں ہے، شکست و ریخت کا المیہ ہے، خیروشر کا ڈرامہ ہے، جذبوں اور محبتوں کی پامالی کا نقش ہے، بدلتے ہوئے سماجی رشتوں کا عمرانی مطالعہ ہے، تضادات کی چترکاری ہے، ایک دور جاں کنی میں ہے اور دوسرا نوزائیدہ وہ ساحل کہاں ہے جہاں انسان اور انسانیت لنگر انداز ہوں، لہر در لہر خون، خون رشتوں کا، محبتوں کا، جذبات کا اور شہر دل کا۔ یہ اس آباد خرابے کی کہانی ہے جہاں ہر کوئی ہر کسی سے اپنا ہی پتہ پوچھ رہا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود عبدالصمد کا فن مثبت ہے۔

"اگر ان کا ماضی بلاقصور ان سے چھین لیا گیا ہے تو حال اور مستقبل کی طاقت پر وہ اس کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے؟" (ص:۵۰۸)

اس طوفانِ بلا میں ایک قلم جھلملاتا ضرور ہے، حالانکہ:

بدلی بدلی ہے فضا صبح کے آثار بھی ہیں
آخر شب کی ضرب مگر قیامت کی ہے

"اہم ناول نگار"

ممتاز اور اہم ناول نگار عبدالصمد کا نیا ناول دھمک منظر عام پر آ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کولے کر کوئی زوردار دھما کا نہیں ہوا ہے جب کہ ناول یقیناً دھما کے دار ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں کہ یہ ابھی حال میں ہی منظر عام پر آیا ہے اور قارئین و ناقدین کے درمیان زیادہ نہیں پہنچا۔ وہ زمانہ بھی رخصت ہوا جب پریم چند اور کرشن چندر کے ناولوں کا انتظار رہا کرتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اب ناول شائع ہوتے ہیں تو بس ہاتھوں ہاتھ دیے جاتے ہیں اور اکثر تو اس کے باوجود پڑھے نہیں جاتے۔ عبدالصمد جیسی شخصیت کے ساتھ ایک سماجی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض ایک استاد ہیں۔ طبیعت کے سادہ اور شریف ہیں۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے کسی ناول کی تقریب اجرا یا تہنیتی جلسے کا اہتمام کیا ہو جیسا کہ ان دنوں عام ہے۔ گذشتہ دنوں ناول سے متعلق پٹنہ کے ایک سیمینار میں دو بزرگ نقادوں (قمر رئیس۔ عابد سہیل) نے اس ناول سے متعلق باتیں ضرور کیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں فکشن کے معتبر اور محترم ناقدین ہیں لیکن نسل، نظر اور طبع کا فرق تو بہرحال کام کرتا رہتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہم عصر تخلیق۔ ہم عصر تنقید کے حوالے سے جس قدر مزاجی اور عصری پہچان رکھتی ہے شاید ذہنی تفاوت و تفارق کے ساتھ نہیں تاہم ان بزرگ ناقدوں کا احترام و اعتبار اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ یہ حضرات پوری ہمدردی کے ساتھ نئی چیزیں پڑھتے ہیں اور ناقدانہ دانشورانہ اظہار بھی کرتے ہیں جیسا کہ پٹنہ کے سیمینار میں ان بزرگوں نے کیا۔

علی احمد فاطمی (الہ آباد)

مہاساگر

اے۔خیام
(کراچی)

اردو ادب میں ناول نگاروں اور ناولوں کی تعداد بس اتنی ہی ہے کہ بہ آسانی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔تعداد کم ہونے کے باوجود کچھ ناول یقیناً ایسے ہیں جنہوں نے اردو ناول نگاری کی آبرو کو نہ صرف بچائے رکھا ہے بلکہ فخر کا باعث بھی بنایا ہے۔سَن اسّی کی دہائی میں ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے قلم کاروں نے شعوری طور پر ایک پروگرام کے تحت اس کمی کو پورا کرنے کی ٹھان لی اور یکے بعد دیگرے کئی ناول منظر عام پر آئے۔زیادہ تر لکھنے والے تسلیم شدہ افسانہ نگار تھے اور انہیں شاید ناول کے باب میں اردو ادب کی تہی دامنی کا شدید احساس تھا۔چند ناول تو یقیناً چونکا دینے والے تھے مثلاً ''فائرایریا'' اور ''دوگز زمین'' ۔''دوگز زمین'' نے (ڈاکٹر) عبدالصمد کو نہ صرف ناول نگار کی حیثیت سے فوراً تسلیم کرالیا بلکہ یہ ناول بہت اہم بھی قرار پایا۔اس کی پذیرائی سے عبدالصمد کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے اسی میدان میں قدم جما کر یکے بعد دیگرے کئی اور ناول لکھے۔زیر مطالعہ ناول ''مہاساگر'' ان کا چوتھا ناول ہے۔

منافرت اور منافقت ایسے مسائل ہیں جو اس وقت دنیا بھر میں سیاست کی سطح تک ہی نہیں معاشرے کی رگ و پے میں زہر بن کر سرایت کر چکے ہیں۔عبدالصمد نے اسے اپنے معاشرے میں شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ انہوں نے اس کا سرسری یا سطحی جائزہ نہیں لیا بلکہ ان کی جڑوں تک پہنچنے کی پوری اور کامیاب کوشش کی ہے۔کوئی بھی معاشرہ مختلف الخیال افراد کے اجتماع سے تشکیل پاتا ہے لیکن جس طرح چند ناپسندیدہ عناصر ایک بڑے اجتماع کو منتشر کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں اسی طرح چند پراگندہ ذہن رکھنے والے افراد پورے معاشرے کو غلیظ کرسکتے ہیں۔''مہاساگر'' کا بنیادی یا مرکزی خیال یہی ہے۔اپنی اس تھیسس کے لیے انہوں نے بڑی محنت سے معاشرے کے مختلف طبقات کے ذہنوں کو کھنگال ڈالا ہے۔ایک خاندان ہے جس میں ویاس جی، شکن جی، شیکھر، ریکھا اور نرنجن ہیں۔ شیکھر اور ریکھا لبرل خیال رکھتے ہیں۔ویاس جی اپنی روایت ، وضعداری، امن پسندی، صلح جوئی اور رواداری کو سینے سے لگائے جی رہے ہیں، شکن جی ماں ہیں اور بیوی ہیں جب کہ نرنجن انتہائی زیرک اور ذہین ہونے کے باوجود لسانی تعصبات میں نہ صرف یہ کہ بری طرح گھرا ہوا ہے بلکہ انتہا پسندی کی طرف مائل ہے۔اس معاملے میں اس کا مستقبل بھی داؤ پر لگ چکا ہے۔پانچ افراد کے خاندان میں صرف ایک فرد ایسا ہے جس نے ایک پرسکون گھرانے کا امن وسکون تہہ وبالا کرکے رکھ دیا ہے۔لیکن نرنجن کا تعصب اس کے اپنے ذہن کا پیدا کردہ نہیں ہے۔وہ اپنی علمیت اور ذہانت کی بدولت کسی نتیجے پر پہنچ کر اس ڈگر پر نہیں لگا بلکہ یہ وہ ناسور ہے جو اس کے استاد پروفیسر لکشمی نرائن نے اس کے ذہن میں سرائیت کر دیا ہے۔پروفیسر لکشمی نرائن کی اپنی ذات بھی بڑی منافق ہے۔ایک طرف وہ لسانی اور مذہبی بنیاد پر ایک ایسا طبقہ پیدا کر رہا ہے جو معاشرے میں موجود رواداری اور کشادہ دلی کے خلاف ہے اور دوسری طرف وہ خود ایک مزار کا بے حد معتقد ہے۔لیکن نرنجن جیسے پڑھے لکھے لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کا مرتکب بھی ہو رہا ہے۔پروفیسر لکشمی نرائن تمام تدریسی طبقے کی نمائندگی نہیں کررہا ہے۔نرنجن تحقیقی کام کر رہا ہے، جس کے گائیڈ پروفیسر یادو ہیں جو ایک کھلے دل اور کھلے ذہن کی شخصیت ہیں، اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں، درست راہ پر گامزن کرتے ہیں اور مثبت تجزیے سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ویاس جی کے چوکھٹے میں ہی منشی اللہ دین بھی فٹ ہوتے ہیں۔ دونوں کے مذہب مختلف ہیں لیکن خیالات ایک جیسے ہیں۔وہی اخلاص، رواداری، وضعداری اور روایتوں کی پاسداری۔۔۔ویاس جی کے گھرانے میں نرنجن جس ذہن کی نمائندگی کر رہا ہے اسی ذہن کی نمائندگی منشی جی کے گھر میں صلاح الدین بھی کر رہا ہے۔منشی جی کے گھرانے میں دوسرے افراد پڑھ لکھ رہے ہیں، مقابلے کے امتحان میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں لیکن صلاح الدین نے اپنے اور اپنی قوم کی راہ نجات کے لیے دوسرے راستے کا انتخاب کیا ہے اور یہ راستہ نرنجن کے منتخب کردہ راستے سے مختلف نہیں ہے۔ایک طرح سے یہ توازن قائم رکھنے کی ایک کوشش ہے اور عبدالصمد کی مجبوری بھی سمجھ میں آتی ہے۔

نور محمد اور اس کے حواری ہیں جو مذہب کی روح سے واقفیت رکھنا تو درکنار، اس کی الف ب سے بھی واقف نہیں اور نہ ہی کسی مذہبی اصول پر عمل پیرا ہیں لیکن ان کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے، انہیں لالچ دیا جاتا ہے ان کے ذہن میں منافرت پیدا کی جاتی ہے، وہ غلط عادتوں کے شکار ہیں اور فسادات کے ذریعے مال بٹور رہے ہیں اور یہ سب کچھ مذہب کی آڑ میں ہو رہا ہے۔

معاشی بدحالی نچلے طبقے کا مقدر ہے خصوصاً مسلم معاشرہ بے حد غربت کا شکار ہے۔ملازمتوں کا حصول ان کے لیے ناممکن ہو چکا ہے اور تجارت یا دوکانداری ناقابل عمل ہے کیونکہ فسادات کی آڑ میں ان کی دوکانیں خاکستر کر دی جاتی ہیں اور انہیں پنپنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔یہ انتہائی پسماندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور حکمرانوں کے مفادات بھی کچھ ایسے ہیں کہ اس طرف سے انتہائی بیگانگی اور بے توجہی برتی جاتی ہے۔چند افراد جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں اور کسی طرح بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں وہ سہمے ہوئے اور خوفزدگی کی کیفیت میں وقت گزار رہے ہیں، نچلے عملے پر ان کے احکامات بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ منشی جی کا ایک بیٹا اور ہاشم لی ان ہی لوگوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

ہاشم علی اپنے سگے بھائی قاسم علی کو، جو پاکستان ہجرت کر چکا تھا، خط تک لکھنے سے گریز کرتا ہے کہ کہیں اس پر پاکستانی جاسوس کا الزام نہ لگ جائے لیکن ملازمت کی بھی اپنی رقابتیں ہوتی ہیں وہ پھر بھی اس کا شکار ہو کر رہتا ہے۔قاسم علی

اپنی ہجرت سے غیر مطمئن ہے اور واپس اپنے آبائی وطن آ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔اس کے غیر مسلم دوست اس کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔

ناول نگار کا خیال ہے کہ منافرت اور منافقت پیدا کرنے والے اور معاشرے میں زہر پھیلانے والے چند افراد ہی ہوتے ہیں، حکمرانوں کی بے توجہی سے اسے مزید مہمیز ملتی ہے اور ایمانداری اور خلوص کے فقدان نے معاشرے میں مزید بگاڑ پیدا کی ہے۔

عبدالصمد نے معاشرے کے مختلف طبقوں کو نمائندگی دی ہے، لسانی اور مذہبی بنیاد پر بھی دیہاتوں اور شہروں کی بنیاد پر بھی، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کی بنیاد پر بھی۔۔۔غنڈوں کی بھی نمائندگی ہے اور سیاست دانوں اور بیوروکریٹ کی بھی۔گویا ہر طبقے سے نمائندگی حاصل کر کے عبدالصمد نے اپنی تھیسس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا ہے اور حقیقی انداز میں نتائج اخذ کیے ہیں اور قاری کو منطقی نتائج تک پہنچایا ہے۔البتہ اگر ہاشم علی اور منشی جی کے ایک بیوروکریٹ بیٹے کا ذکر نہ ہوتا یا مسلم معاشرے کے اس طبقے کے ذکر سے گریز کیا جاتا جو انتہائی پسماندگی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے تو یہ توازن برقرار رکھنے کی ایک غیر فطری کوشش ہوتی اور یہ ناول کرشن چندر کے ''پشاور ایکسپریس'' کی پھیلی ہوئی ایک شکل بن کر رہ جاتا۔

ناول کی بنت میں بھی رائج اصولوں سے گریز کیا گیا ہے۔مکالمے کی صورت میں خاکے سے بنتے چلے جاتے ہیں اور تمام خاکے قاری کے ذہنوں میں محفوظ رہتے ہیں جو باہم مربوط ہو کر ناول کے بنیادی خیال کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ذہنوں میں سوال اٹھاتے ہیں، سوالوں کے جواب بھی میسر ہیں، مسائل ایسے نہیں ہیں جو لا ینحل ہوں، انہیں بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے اور یہ سب ایسی خوبیاں ہیں جو قاری کے ذہنوں پر دیرپا اثر قائم کرتی ہیں۔

''سماجیات اور سیاسیات''

عبدالصمد بنیادی طور پر سماجیات اور سیاسیات کے طالب علم رہے ہیں۔لسانی کرتب بازی نہ تو ان کے بس کی بات تھی اور نہ انہوں نے شعوری طور پر اس رویے کو اپنایا۔یہ سلسلہ ان کی ناول نگاری میں اس وقت زیادہ معنی خیز ہو جاتا ہے جب ہم پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کے تقریباً ساتھ شائع ہونے والے عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' کی تکنیک اور اسلوب کے فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔پیغام آفاقی کے ناول میں تہہ دار کردار نگاری، تحلیل نفسی اور داخلی خود کلامی جس طرح ان کی ہنرمندی کی سب سے بڑی پہچان بنتی ہے بالکل اسی کے برخلاف عبدالصمد کے ناول میں روایتی بیانیہ، قدیم زمانی ساخت اور سیاسی اور سماجی بیدار مغزی، قاری کی توجہ سب سے پہلے اپنی طرف مبذول کراتی ہے۔اس طرح عبد الصمد کی شناخت خواہ ناول نگار کی حیثیت سے ہو یا افسانہ نگار کی حیثیت سے شروع ایک ایسے قصہ گو کی بن چکی ہے جو اپنے کرداروں کی داخلی اور نفسیاتی تحلیل کرنے سے زیادہ ان کے گرد و پیش کے حوالے سے کردار کے داخلی احساسات اور رویوں کا تعین کرنے پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے۔عبد الصمد کا یہ فنی رویہ ناول نگاری کے معاملے میں دوگز زمین سے لے کر حالیہ ناول دھک تک یکساں طور پر قائم ہے۔تاہم گذشتہ چند برسوں میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے کردار نگاری کی داخلی اور نفسیاتی جہت پر خاصی توجہ صرف کی ہے اور اس کے نمونے بعض ایسے کامیاب افسانوں کی شکل میں پیش کیے ہیں جو ان کی ژرف نگاہی اور کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کی حیرت انگیز مثال پیش کرتے ہیں۔

ابوالکلام قاسمی (علی گڑھ، بھارت)

''تخلیقی جہات''

معاصر اردو فکشن نگاروں میں عبدالصمد اپنی تخلیقی جہات اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے ایک منفرد اور بے حد فعال ادیب ہیں۔درجن بھر سے زائد ناولوں اور افسانوی مجموعوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ عمر اور تجربات کی اس منزل پر بھی تازہ دم ہیں۔کسی فنکار کے ابتدائی ناول کی شہرت کے بعد تواتر اور تسلسل کے ساتھ تخلیقی عمل سے وابستگی اس کے ادبی شعور اور خلاقانہ ذہن کی دلالت ہے۔بہ الفاظ دیگر عبدالصمد نے ''دوگز زمین'' سے اردو فکشن میں جو جست لگائی وہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ناولوں اور افسانوی مجموعوں کی مستقل اشاعت ان کے ادبی ذہن کی تازگی ہی کہی جائے گی۔ہمارے دور کی تنقید کا یہ بڑا المیہ ہے کہ ہماری توجہات اور مطالعے میں وہ تصانیف قابل اعتراف ہوتی ہیں جنہیں اعزاز و انعامات کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔عبدالصمد کا ناول ''دوگز زمین'' اس کی عمدہ مثال ہے جس پر ادبی حلقوں میں سنجیدگی سے گفتگو کی گئی۔لیکن بعد کے دوسرے ناول مثلاً ''مہاتما''، ''خوابوں کا سویرا''، ''مہاساگر'' اور ''دھک'' پر چند ایک مضمون تو نظر آئے لیکن بحث و تمحیص کا موضوع نہ بن سکے۔حتیٰ کہ حالیہ اشاعت پذیر ناول ''بکھرے اوراق'' بھی بے توجہی کی نذر ہو گیا جبکہ عہد حاضر کے مسلمانوں کی نفسیات کو بڑی فنکاری سے تخلیقی وسیلہ بنایا گیا ہے۔

آفتاب احمد آفاقی (بھارت)

اجالوں کی سیاہی

(ناول سے انتخاب)

عبدالصمد

باہر نکڑ پر نیم کے گھنے درخت میں چھپے کسی پرندے پر پتہ نہیں کیا بپتا پڑی کہ وہ اچانک چیخ اٹھا۔ آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر کے سنگین سناٹے میں اس کی آواز ایک خوف ناک چیخ کی صورت ابھری۔

زیب النسا کی آنکھوں میں رات کا مہیب سناٹا نہ جانے کب سے اترا ہوا تھا، وہاں نیند کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ پرندے کی چیخ سے وہ لرز اٹھیں اور کسی طرح آنکھیں کھول کر دالان پر بچھی چوکی پر بظاہر سوئے ہوئے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ انہیں نیند میں مدہوش دیکھ کر مطمئن سی ہو کر انہوں نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دئے۔ دعا کے الفاظ انہیں بالکل یاد نہیں تھے، لیکن شاید انہیں یقین تھا کہ اوپر والا الفاظ کا ہرگز محتاج نہیں، وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا مانگتی ہیں، انہیں کیا چاہئے۔

مولوی فضل امام ان سے زیادہ جاگے ہوئے تھے، وہ چرند و پرند تو کیا، آدمیوں کی چیخ سے بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ نہ انہوں نے آنکھیں کھولیں، نہ کروٹ بدلا اور یوں پڑے رہے جیسے گہری نیند میں ہوں۔ نیند کا یہ ڈھلا وہ ان کے لئے بہت بڑا ڈھال تھا جو انہیں بہت سی بلاؤں سے بھی محفوظ رکھتا تھا۔

پرندے کی بے ساختہ چیخ کے بعد ماحول پر چند لمحوں تک ایک نامعلوم سی تھرتھراہٹ قائم رہی، پھر سناٹا چھا گیا، مگر مولوی فضل امام اچھی طرح جانتے تھے کہ سناٹے کی چادر میں سکون کا جگنو کہیں بھی چھپا ہوا نہیں ہے، اور ان کے احساسات تو رات کی تاریکی میں شاید ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ جب لیٹیں تو ایک ہی کروٹ پڑے رہیں۔ کروٹ بدلنے سے ان کی پرانی چوکی کے چول چرمرا اٹھتے تھے، اس سے سناٹے میں ایک خلل سا پڑتا تھا۔ یونہی ایک کروٹ لیٹے لیٹے انہیں کسی پہر جھپکی سی آ جاتی، لیکن ایک عجیب بات تھی، اس جھپکی میں بھی ان کے ذہن کے سارے دفتر کھلے رہتے اور وہاں خاصی چہل پہل اور رونق رہتی۔ جب ان کی آنکھیں کھلتیں تو انہیں محسوس ہوتا کہ اتنا سارا وقت شاید انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے گزار دیا ہے، وہ سوئے ہرگز نہیں، مگر ان کی گھڑی ان کو چپکے سے بتا دیتی تھی کہ جب ان کی آنکھیں لگی تھیں تو وہ وہ وقت تھا اور اب یہ وقت ہے۔

رات اپنے سفر کے آدھے راستے سے کچھ فاصلے طے کر چکی تھی کہ صدر دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ عام حالات میں اسے دستک سمجھنا مشکل تھا، زیادہ سے زیادہ ہوا کا ایک جھونکا جو جب مستی میں رہتا ہے تو دروازے پر ایک چپت لگا دیتا ہے۔ زیب النسا جلدی سے اٹھیں اس انداز میں کہ مولوی فضل امام کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑے اور ننگے پیر، دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے آہستہ سے کھول دیا۔

ان کا بیٹا فہیم تھا جو جلدی سے اندر آ گیا اور دروازے کو اسی آہستگی سے بند کر دیا۔

''ابا سو گئے کیا......؟''

اس نے سرگوشی کے انداز میں دریافت کیا۔

''وہ تو سوتے ہی رہتے ہیں، جاگتے کب ہیں......؟''

زیب النسا نے یوں جواب دیا جیسے یہ کوئی نئی بات نہیں ہو۔

''اماں آپ جا کر سو رہیں، مجھے بھوک نہیں، لگے گی تو نعمت خانے سے نکال کر کھا لوں گا......''

فہیم نے باپ کی نیند سے مطمئن ہو کر ماں کو دلاسہ دیا۔

''گرم کر دوں......؟''

ماں کو اس کے اتنی رات میں گھر آنے پر کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ ان کی ممتا کچھ اور نکھر آئی تھی۔

''اماں، اس کی کوئی ضرورت نہیں، آپ جانتی ہیں مجھے گرم کھانے پسند نہیں، جس وقت ضرورت ہوگی، میں کھا لوں گا......''

کہتا ہوا فہیم اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس میں دونوں بھائیوں کے بستر لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں گرل لگی ہوئی کھڑکی کھلی تھی اور گلی کا بجلی کا کھمبا اس کے عین سامنے تھا جس کے سبب اندھیری رات میں بھی کمرہ روشن رہتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی بجلی کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ روشنی کی حاجت نہیں ہوتی تو کھڑکی کو بند کر دینا پڑتا تھا۔ مولوی فضل امام کی بیوی زیب النسا لیٹنے سے پہلے شوہر کی طرف آئیں اور انہیں سوتا پا کر مطمئن ہو گئیں۔ حالانکہ فضل امام نے گھر کے حالات اور لوگوں کے نقل و حرکت پر عرصے سے چپی سادھ رکھی تھی، مگر پتہ نہیں کیوں زیب النسا کو ان کی خاموشی بیحد بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، اس وقت بھی فضل امام ساری سرگرمی کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، یوں بظاہر ان کی آنکھیں بند تھیں، پر یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ بند آنکھوں سے جتنا کچھ دیکھ سکتے ہیں، کھلی آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

زیب النسا جانتی تھیں کہ بیٹا نے انہیں بہلانے کی کوشش کی ہے، وہ کھانا نہیں کھائے گا، ہر صبح اس کا کھانا جوں کا توں موجود ملتا ہے اور استفسار پر بس ایک ہی جواب......

''اس قدر نیند آ رہی تھی اماں کہ کھانے کا ہوش ہی نہیں رہا، بھوک تو بہت لگ رہی تھی، اس وقت بھی لگ رہی ہے، لاؤ وہی کھا لیتا ہوں......''

بھلا ماں جان بوجھ کر اسے باسی کھانا کیوں کھانے دیتی۔ وہ اسے

اپنے لئے رکھ کراس کے لئے تازہ روٹیاں بنادیتی۔

مولوی فضل امام پہلے بھی بہت کم بولتے تھے،اب تو کچھ بولنا گویا انہوں نے چھوڑ ہی دیا تھا، یہاں تک کہ ضرورتوں کے لئے بھی وہ اشارے کنایے ہی سے کام چلا لیتے۔لیکن جب سے دونوں بیٹوں پران کا اختیار ختم ہوا تھا، زیب النسا کو ان کی ایک ایک خاموشی ہزار بول پر بھاری محسوس ہوتی۔ وہ ان سے آنکھیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتیں اوران کی ضرورتوں کوخود ہی محسوس کر کے پورا کر دیتیں۔ویسے فضل امام نے بیٹوں پر بے جا رعب داب رکھنے کا معاملہ کبھی نہیں رکھا تھا نہ کبھی اپنے پدرانہ اختیار کا استعمال کیا تھا،مگران کا اختیار جب واقعی ختم ہو گیا تب انہیں شدت سے محسوس ہوا کہ کوئی چیز ان کے قبضہ میں تھی ، اب نہیں رہی۔

فہیم سے بڑا قسیم تھا۔ وہ قریب ہی کے ایک دوسرے شہر میں ایک چھپائی کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ ہفتہ دس روز پر گھر آجاتا، اس کا رنگ ڈھنگ کافی حد تک باپ سے ملتا جلتا تھا۔زیادہ تر خاموش ہی رہتا۔لیکن اس کی آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی ہوتیں،اس کی سوچ کی تحریریں مولوی فضل امام تک بہ خوبی پہنچ جاتی تھیں مگر وہ کسی ایسی انجان زبان میں ہوتیں کہ فضل امام انہیں سمجھنے سے ایک دم مجبور تھے، یوں وہ اتنا ضرور سمجھ جاتے یہ تحریریں کسی انتہائی سنجیدہ موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔انہوں نے دوایک بار دبی زبان سے دریافت بھی کیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔وہ چونک پڑا۔

''کچھ نہیں ابا......کچھ نہیں......''

''پھر بھی کچھ تو......''؟

''نہیں ابا، کچھ نہیں، بھلا ، آپ سب کی موجودگی میں ، میں کیا سوچوں گا......''

اتنی دیر میں، کمال ہوشیاری سے وہ اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا،اس قدر قابو کہ وہ ہنس بھی پڑا۔فضل امام کو کچھ کچھ اس کی خاموشی اور کچھ کچھ ہنسی سے کچھ سمجھنے میں مدد ملی۔انہوں نے اس معاملے کو یہیں چھوڑ کر دوسری باتیں چھیڑ دیں۔مثلاً وہ آج کل کس طرح رہ رہا ہے،کھانے پینے کا کیا نظم ہے،فرصت کے اوقات میں کیا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل پر وہ پہلے بھی باتیں کر چکے تھے اور ہر بار انہیں ایک ہی سا جواب ملتا تھا، وہ بڑی توجہ سے اس کے بار بار کے جواب میں کوئی فرق ڈھونڈنے کی کوشش کرتے اور اپنے طور پر کسی نتیجے پر بھی پہنچ جاتے، اگر چہ اس قسم کی نقل و حرکت سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔انہیں تو حتمی طور پر یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ قسیم واقعی کسی پریس میں کام کرتا ہے یا نہیں۔ بہرکیف، دوسرے شہر میں رہ کر وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر رہا تھا تو ضرور کوئی کام کرتا ہوگا، کبھی کبھی اس کے انداز سے ایسی پراسراریت جھلکتی تھی کہ وہ الجھن میں پڑ جاتے۔کئی بار انہوں نے ارادہ بھی کیا کہ وہ خود جا کر دیکھیں کہ آخر وہ وہاں کس طرح رہتا ہے، کیا کھاتا پیتا ہے،فرصت کے اوقات میں کیا کرتا ہے وغیرہ۔مگران کا ارادہ ہر بار ارادے سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔اس کے کئی اسباب تھے،سب سے بڑا سبب تو مالی دشواری ہی تھی۔ وہ محلے کی مسجد میں امام مقرر تھے بلکہ امام کیا،مؤذن اور خدمت گار بھی۔ مؤذن مقرر نہیں تھا، اگر اذان کے وقت کچھ لوگ مسجد میں موجود رہتے تو ثواب لوٹنے کی خاطر ان میں سے کوئی اذان دینے کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ مسجد کی صفائی، دھلائی، گھڑی، قالین وغیرہ کی حفاظت بھی انہیں کے ذمہ تھی۔ ایسی صورت میں ایک دن کیا، ایک وقت بھی غیر حاضر رہنا ان کے لئے مشکل تھا۔ پھر بیوی بیمار رہتی تھیں، چھوٹے بیٹا فہیم کے گھر میں رہنے کا کوئی وقت نہیں تھا، یوں بھی وہ بس شب گزاری ہی کے لئے گھر آتا تھا۔ پھر بھی قسیم نے انہیں جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق چار پانچ بندوں نے آپسی اشتراک سے ایک کمرہ لے رکھا تھا، اس میں ایک چھوٹا سا وارنڈہ اور بیت الخلا بھی تھا۔ غسل کرنے کا کوئی نظم نہیں تھا، مگر کمرے کے سامنے والی گلی میں میونسپلٹی کا نل تھا، جس پر یہ لوگ نہانے دھونے کی ضرورت پوری کر لیتے۔ چھٹیوں کے دن اپنی پسند کے کھانے پکا لیتے، بقیہ دنوں کے لئے ان لوگوں نے ایک لاج کے میس میں بات کر رکھی تھی۔ مولوی فضل امام کو روٹین کے معمولات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں تو بس اس کی فکر تھی کہ فرصت کے اوقات میں وہ کیا کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ آج دنیاوی مصیبتیں جتنی نازل ہوتی ہیں، ان کی جڑوں میں یہی اوقات ہوتے ہیں......یعنی فرصت کے۔ اپنے اس خدشے کو وہ کسی سے ظاہر بھی نہیں کر سکتے تھے، جانتے تھے کہ سننے والے انہیں احمق قرار دیں گے۔ ایک بار دبی زبان سے انہوں نے اپنی بیوی سے یہ بات کہہ دی تھی تو وہ بہت دیر تک انہیں یوں گھورتی رہی تھیں جیسے وہ انہیں پاگل سمجھ رہی ہوں اور جب وہ بولیں تو ان کے دل کی بات بھی زبان پر آ گئی۔

''پتہ نہیں، آپ کیا کیا سوچتے رہتے ہیں، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بیکار دماغ شیطان کا......''

انہوں نے حیرت سے بیوی کو دیکھا......یہی بات تو وہ بھی کہہ رہے ہیں......مگر وہ چپ رہے، جانتے تھے کہ اب بولیں گے تو بات دوسری سمت مڑ جائے گی۔

انہوں نے ملنے جلنے ، بات چیت کرنے کا ایک الگ ہی طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

دونوں کے ہاتھوں میں موبائل ہوتا اور دونوں کسی طے شدہ جگہ پر کچھ فاصلے پر بیٹھے رہتے، جیسے کسی پارک کے الگ الگ دو بینچوں پر، کسی بلڈنگ کی سیڑھیوں پر اوپر نیچے، قدرے کم بھیڑ بھاڑ والے راستوں پر فاصلے سے چلتے ہوئے ، یا کسی بھی ایسی جگہ پر جہاں وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہار سکیں، ایک دوسرے کی آنکھوں کے سمندر میں آزادی کے ساتھ تیر سکیں، ایک دوسرے کے

چہرے کے رنگ سے اپنے آپ کو مسحور کر سکیں۔ وہ یہ سارے کام خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ وہ اپنے موبائل میں منہ ڈال کر دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہتے، آنکھیں ایک دوسرے پر ٹکی رہتیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ان کے درمیان ایک ان دیکھی مضبوط ڈوری بندھی ہوئی ہے۔ وہ باتیں بھی کیا کرتے تھے، انہوں نے کبھی رومانی ناولوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا، رومانی شاعری سے وہ واقف نہیں تھے، فلموں میں جب رومانی گانے گائے جاتے تھے تو اس دور سے بہت آگے نکل آئے تھے۔ یوں بھی وہ باتیں کم کرتے تھے، ہنستے زیادہ تھے۔ وہ اپنے ملن سے بہت خائف تھے، جانتے تھے کہ یہ راز کھل گیا تو بہت غضب ہو جائے گا، مولوی فضل امام کا بیٹا اور بنئے دینا ناتھ ساہ کی بیٹی......

وہ ایک دوسرے کے پڑوسی نہیں تھے۔

دونوں ایک کلاس میں نہیں پڑھتے تھے۔

ان کے خاندان ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔

ان کے بار بار ملنے کی کوئی زمین بھی نہیں تھی۔

کسی میلے ٹھیلے میں ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

انٹرنیٹ اور اسکائپ پر ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ دونوں نے ان چیزوں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

وہ اپنے باپ کی دکان پر کبھی کبھی بیٹھ جاتی تھی۔ دکان ان کے گھر کا اگلا حصہ تھا، ان سے جب کوئی ملنے آتا تو دکان ہی پر آتا۔ دکان کی دکان اور ڈرائنگ روم کا ڈرائنگ روم...... باپ پوجا پر بیٹھا ہوتا، کھا رہا ہوتا، نہا رہا ہوتا تو اتنی دیر کے لئے بیٹی دکان پر آ جاتی۔ لڑکے کا بھی کسی نہ کسی کام سے اس سڑک سے گزرنا ہوتا ہی تھا۔ ایک دن ٹھیک دکان کے سامنے ٹریفک جام ہو گیا۔ وہاں لڑکا بھی پہنچ گیا اور لڑکی بھی تماشہ دیکھنے دکان کی سیڑھیوں پر آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بس۔ جام ختم ہو گیا تو تماشہ بھی ختم۔ لیکن تماشہ ختم کہاں ہوا، اب لڑکا جب بھی وہاں سے گزرتا، اس کی نگاہیں بے ساختہ دکان پر اٹھ جاتیں، لڑکی موجود ہوتی تو نگاہوں کا خاموش تبادلہ ہو جاتا۔ آگے چل کر یہ نگاہیں مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئیں۔ پہلے لڑکا مسکرایا ، پھر لڑکی قدرے جھجک کے ساتھ مسکرائی، مسکراہٹوں کا تبادلہ جڑ پکڑتا گیا، پھر ایک دن لڑکے نے دکان میں صرف لڑکی کو دیکھ کر چپکے سے ایک پرزہ پھینک دیا اور تیزی سے آگے نکل گیا۔

پرزے پر موبائل کا نمبر لکھا تھا۔ اس کو امید تھی کہ شاید اس کے موبائل میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں گی۔ وہ انتظار کرتا رہا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ایک دن موقع دیکھ کر لڑکی نے بھی پرزہ کا ایک بہت چھوٹا سا گولہ لڑکے کی طرف اچھال دیا۔ لڑکے نے اسے اپنی ہتھیلی پر کیچ کر لیا۔ لڑکی کا موبائل نمبر تھا۔

موبائل پر لڑکے کا نام سن کر لڑکی ایک دم گم صم ہو گئی۔ لڑکے کو شک ہوا کہ شاید موبائل آف ہو گیا۔ اس نے پھر لگانے کی کوشش کی، لائن مصروف ملی، وہ بار بار لگاتا رہا، آخر بڑی کاوشوں کے بعد نمبر ملا۔ لڑکا بولا۔

''پتہ نہیں، یہ ٹاور کا فالٹ تھا یا تم نے بند کر دیا تھا......''

''میں نے بند نہیں کیا تھا، میں سوچنے لگی تھی کہ کیا ہماری تمہاری دوستی مناسب ہو گی......؟''

لڑکی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لڑکے کا عندیہ جاننا چاہ رہی ہو۔ خود کسی نتیجے پر ابھی نہیں پہنچی ہو۔

''کیوں مناسب نہیں ہو گی۔ آخر ہم تم کالجوں میں پڑھتے ہیں تو ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں اور لڑکے کون ہیں اور ان سے دوستی رکھنے میں کیا فائدہ، نقصان ہو گا......''

لڑکے کے لہجے میں خاصی خود اعتمادی تھی۔ لڑکی پھر ایک لمبے وقفے تک خاموش رہی۔ اس دفعہ لڑکے نے موبائل آن رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کی آواز آئی۔

''تم سے دوستی کرنے میں بہت ڈر لگتا ہے۔''

لڑکا ہنسا۔

''کاہے کا ڈر......؟''

''تم لوگ بڑے بے رحم ہوتے ہو، تمہیں کسی پر دیا نہیں آتی، تم ذرا ذرا سی بات پر خون کرنے سے باز نہیں آتے......''

لڑکی بولتی گئی۔ اس دفعہ خاموشی کا وقفہ لڑکے کے حصے میں آیا تھا۔ وہ اس کی معلومات پر دنگ تھا۔ ان میں کتنی باتیں صحیح تھیں، وہ الگ، اس لڑکی تک یہ باتیں پہنچیں کیسے۔ بہر کیف، اس نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور ایک زور دار قہقہہ لگایا۔

''مجھے تو کوئی ڈر نہیں لگتا۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں ویسا ہی ہوں، جیسا تم نے سنا ہے؟''

''میں کیا جانوں...... میں تمہیں کیا جانتی ہوں، ابھی تو میں نے تمہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے......''

لڑکی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''جب مجھے ٹھیک سے دیکھ لینا، ٹھیک سے جان لینا، تب دوستی کرنا، ٹھیک......؟''

لڑکے نے فوراً ہی مسئلے کا حل نکال لیا۔

فہیم ایک اقلیتی کالج میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی تفریح کرنے کو جی چاہتا تو کالج چلا جاتا۔ وہاں حاضری کی کوئی قید نہیں تھی، وہ گویا امتحان میں شریک ہونے کا ایک مرکز تھا۔ یعنی اس کے ذریعہ امتحان کے فارم وغیرہ بھرے جاتے تھے اور یونیورسٹی اس کے تصدیق شدہ فارم کو تسلیم کرتی تھی۔

روپا ایک گرلز کالج کی طالب علم تھی۔ وہاں امتحان میں فارم بھرنے کے لئے کلاس حاضری بہت ضروری تھی، اس کے علاوہ وہ اس ماحول سے آتی تھی

جہاں علم کی نئی روشنی نمودار ہوئی تھی۔ بیحد چمک دار، روشن اور کھلی ہوئی...... جب کہ فہیم کے گھر میں وہی روشنی اب گل ہو رہی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں فہیم نے یہ اندازہ لگایا کہ روپا تقریباً روز ہی کالج جاتی ہے، اس کے آنے اور جانے کے اوقات بھی اس نے نوٹ کر لئے تھے۔ مگر ان جانکاریوں سے کیا ہونا تھا۔ روپا کے پاس اس کا نمبر موجود تھا اور اس سے اس نمبر پر باتیں بھی ہو چکی تھیں، لیکن فہیم کا وہ موبائل ہی خاموش تھا جس پر ایک بار یہ نمبر نشر ہوا تھا، رات دن ملا کے وہ بلا مبالغہ سینکڑوں بار اپنے موبائل پر امید بھری نگاہیں ڈالتا تھا۔ مگر وہ نمبر ایسا راستہ بھولا بیٹھا تھا کہ غلطی سے بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ وہ خود بھی بات کر سکتا تھا لیکن اس میں خدشہ یہ تھا کہ پتہ نہیں اس وقت روپا کا موبائل کس کے ہاتھوں میں ہو اور کون اسے ریسیو کر لے۔ اس کا اپنا نمبر پتہ نہیں کون سی آفت مچا دے۔ اس کے بغل کے شہر میں ایک دوسرے فہیم اور ایک دوسری روپا کے قصے نے قیامت ڈھائی تھی۔ ہفتوں یہ آگ سرد نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی آنچ اس کے اپنے شہر میں بھی پہنچی تھی اور اس کا شہر بھی اس کی تپش سے بہت دیر تک گم صم رہا تھا۔ یہ قصہ بہت پرانا نہیں ہوا تھا، لیکن روپا کی سانولی سلونی صورت دبیز کپڑوں میں چھپا ہوا اس کا ملکوتی حسن، بولتی ہوئی آنکھیں اور جل ترنگ پیدا کرنے والی آواز اس قصے پر مکمل پانی پھیرنے سے معذور تھی۔ پانی کا گرم ریلہ آتا تو سب کچھ ہٹ جاتا۔ جیسے ہی پانی ٹھنڈا ہوتا، روپا کے وہ تمام روپ ابھر آتے۔

اس کا جی چاہتا کہ وہ روپا کا پیچھا کرے جیسا کہ اس نے ان معاملات میں سن بھی رکھا تھا، پھر فوراً ہی اس کی سمجھ اسے بتا دیتی کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا، روپا سے کچھ بولنے کی اسے ہمت نہیں ہوگی اور جب روپا اس سے خود مخاطب نہیں ہوگی تو اپنی ہی نگاہوں میں اس کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فوراً ہی یہ بات کھل جائے گی۔ چھوٹا سا تو شہر ہے، یہاں تو چہرے اور آنکھوں کا بار بار ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ اکثر لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، بات کھلے گی تو کہاں تک جائے گی، یہ سوچ کر ہی وہ کانپ جاتا۔ ان باتوں اور دوسری بہت ساری باتوں نے اس کے اندر کی دنیا کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔ مگر روپا کا سراپا ایک ریلے کی طرح آتا اور سب باتوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتا۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے آپ پر بہت جبر کر کے روپا کے راستے میں ایک دو میل کے پتھر پیدا کر لئے، ان کے پاس وہ کھڑا ہو جاتا، ایک آدھ لمحے کے لئے ان کی نگاہوں کا ملن ہو جاتا، ایک نامعلوم سا رنگ دونوں کے چہروں پر ناچ جاتا، بہت دیر تک یہ رنگ انہیں سرشار رکھتا، مگر اس دن رنگ میں پھیکے پن کی ایک آمیزش سی ہو گئی۔

موبائل پر اس کا نمبر چمک اٹھا۔

''کیوں کھڑے رہتے ہو میرے راستے میں......؟''

''کیوں......؟ وہ راستہ تو عام ہے، اس پر کوئی بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔''

اس نے الزام قبول کرنے کی بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

''مگر ایک ہی جگہ پر کوئی روز روز کیوں کھڑا ہوگا......؟''

اس دفعہ تیکھے پن میں کمی آ گئی تھی۔ اب خواہ مخواہ کی تکرار اسے بے تکی لگی۔

''سارے راستے بند ہیں تو میں کیا کروں......''

''آخر کیا چاہتے ہو......؟''

اس دفعہ تیکھا پن سرے سے غائب تھا۔

''کیا چاہتا ہوں......؟ کیا چاہتا ہوں......؟''

یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، وہ لڑکھڑا کے رہ گیا، اپنے آپ پر سخت غصہ آیا، کمال ہے یار، ساری باتیں سوچ لیں اور اصل بات ہی نہیں سوچی۔

آخر اتنے دنوں کی مشقت کا کچھ تو مقصد ہونا چاہئے۔ اپنے آپ کو اندرونی پھٹکار لگانے کے بعد ایک سیدھی سی بات اسے سوجھ گئی۔

''میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں......''

''دوستی......؟ وہ کس لئے......؟''

جس لہجے میں سوال کیا گیا، اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی، اور کوئی موقع ہوتا تو شاید اس کا کوئی ردعمل بھی سامنے آتا، مگر یہ تو نہایت ہی نازک موقع تھا، جس کا موجد وہ خود تھا۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''دوستی کرنے کا کوئی مقصد تو نہیں ہوتا، جو دوستی مقصد کے لئے کی جاتی ہے، وہ دوستی نہیں، بے ایمانی ہوتی ہے۔ ہم ایک مثالی دوست بنیں گے اور دنیا کو ایک مثال پیش کریں گے......''

اس کی مختصر سی تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی، وہ دم سادھے موبائل سے چپکا رہا، پھر جیسے ایک قدرے شکست خوردہ سی آواز آئی۔

''مگر ہماری دوستی کی کوئی بنیاد تو ہے نہیں، تم ہمارے ساتھ پڑھتے نہیں، ہم ایک دوسرے کے پڑوسی نہیں، ہمارے خاندان ایک دوسرے کے جانکار نہیں......اور......اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ......''

ایسا محسوس ہوا کہ روپا نے کالج کے کئی درجے آگے تک پاس کر لئے ہیں۔ اس کے کم عمر جسم میں عقل کی عمر پختہ ہو گئی ہے۔

فہیم نے بھی جیسے ہتھیار ڈال دئے۔

''ٹھیک ہے، ہمارے درمیان زمین تو نہیں ہے، تم چاہو تو مت دوستی کرو، کوئی بات نہیں۔''

کبھی کبھی ہار میں بھی جیت چھپی ہوتی ہے۔ روپا نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم پھر بات کریں گے......''

مولوی فضل امام کے گھر میں ایسا سناٹا چھایا رہتا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہو۔ وہ مسجد اور کٹر مٹر پڑھائی کے کام سے فرصت پا کے گھر آتے تو خود

سناٹے کا ایک حصہ بن جاتے۔ گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری زیب النسا پر تھی، کام بھی کیا، بس یہی جھاڑو، بہارو، کھانا بنانا وغیرہ، پھر دو ہی آدمیوں کا تو کھانا بننا تھا، بڑا بیٹا یہاں رہتا ہی نہیں تھا، چھوٹے کے کھانے پینے کا، گھر میں رہتے ہوئے بھی کوئی وقت مقرر نہیں تھا، جو میاں بیوی سے بچ جاتا، وہ اس کے لئے رکھ دیا جاتا، اس کی قسمت میں بھی زیادہ تر باسی ہی ہونا لکھا تھا اور یہ باسی بھی آخر میں زیب النسا ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ وہ ان کاموں میں اتنی مصروف ہوتیں، مانو کوئی پہاڑ سر کر رہی ہوں......روز روز کے پہاڑ، اس کے بعد انہیں کچھ بولنے چالنے کا بالکل جی نہیں چاہتا تھا، فضل امام کی فطری خاموشی نے اسی رنگ میں رنگ کر انہیں بالکل چپ شاہ بنا دیا تھا، پھر بھی ان کا بہت جی چاہتا کہ کم از کم فہیم کو تو وہ روزانہ گھر میں دیکھیں، اس سے بات چیت کریں، اس سے پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ وہ اپنے اوقات کیسے بتاتا ہے، کوئی مسئلہ ہے تو وہ اس کے شریک بنیں، اس پر شفقت اور پیار کی نگاہیں ڈالیں، مگر وہ تو......

مولوی فضل امام اپنی قسمت کی تحریر کے گنجلک ہونے سے بہت افسردہ رہتے تھے۔ پھر بھی شکایت کا حرف زبان پر نہیں لاتے تھے۔ ایک سال کے وقفے سے ان دونوں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی اور اس وقت ہوئی تھی جب اس طرف سے بالکل مایوسی چھا چکی تھی، وہ خود پچاس کے لپیٹے میں آ چکے تھے، گو وہ اس سے زیادہ ہی کے لگتے تھے، زیب النسا ان سے چار پانچ سال چھوٹی تھیں۔ کیسا مذاق اڑا تھا ان کے باپ بننے پر، وہ بھی ایک بار نہیں، دو دو بار......

پورے محلے میں طرح طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی جوان ہوتیں تب تو چہ میگوئیاں اپنی ساری حدود کو پار کر جاتیں۔ غنیمت بس یہ تھا کہ ان کے آنگن میں باہر کے پتھر پھینکنے کا خیال کسی کو نہیں آیا تھا، پھر بھی لوگوں کو تمسخر اڑانے کا ایک نادر موقع تو ہاتھ آ ہی گیا تھا۔

''شاید مولوی صاحب بڑے کا گوشت خوب کھاتے ہیں اور بیوی کو دودھ انڈا......''

''دیکھنے میں تو بڑے بھولے بھالے اور مسکین دکھائی دیتے ہیں، مگر کارنامہ دیکھو تو......''

''جتنی لمبی داڑھی ان کی دکھائی دیتی ہے، اس سے زیادہ اندر گھسی ہوئی ہے......''

''ایک میاں کے تین تین نام — فجل، فجلو، فجل امام......''

محلّہ ملی جلی آبادی پر مشتمل تھا، اس لئے مذاق کی سطحیں بھی الگ الگ تھیں۔

جو لوگ ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے یا ان کی اذان سنتے، وہ تو منہ پر کچھ بولنے سے پرہیز کرتے تھے، لیکن دوسروں کے لئے تو وہ بس 'مولی صاحب' تھے، ......فجل، فجلو، فجل امام......

مولوی فضل امام ان باتوں کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ وہ لوگوں کی اس نوع کی توجہ کو بھی اپنے لئے لائق تحسین ہی سمجھتے تھے۔ گو اپنے اندر اس عمر میں دو دو بیٹوں کے باپ بن جانے پر افتخار کی ایک ان دیکھی لہر انہیں شادکام بنائے ہوئے تھی اور اس کو چھوٹے موٹے مذاق اور تضحیک کے جملے ضرب پہچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

اپنے بیٹوں کی پرورش و پرداخت میں انہوں نے جی جان لگا دیا۔ مگر بقول ان کے ہوا وہی جو خدا کو منظور تھا۔ ان کی تربیت اور پڑھائی پر انہوں نے جو محنت کی اس کا ان کے حساب سے عشر عشیر بھی ان کے ہاتھ نہیں آیا، اگرچہ ان کے ذرائع بہت محدود تھے اور انہوں نے کبھی کوئی وسیع و عریض خواب بھی نہیں دیکھا تھا، پھر بھی جو کچھ انہیں ملا تھا، وہ ان کی محدود سوچ سے بھی کم تھا۔ قسیم تو ابتدائی دینی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکا اور فہیم کئی بار فیل ہوتے ہوئے بھی برسوں سے ایک ہی کلاس میں تھا۔ مولوی فضل امام نے بھی کوئی باقاعدہ ڈگری نہیں لی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے حساب سے اچھے اور برے کی تمیز رکھتے تھے۔ انہیں بچپن اور جوانی میں کچھ ایسے لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی تھی جو صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھنے اور کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے، ان کے سینوں کی آگ کی چنگاری مولوی فضل امام میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ اب زمانہ بہت بدل گیا تھا، نہ وہ بزرگ رہے تھے نہ وہ صحبت۔ اب تو فاضل اوقات لوگوں پر ایسے شیطان کی طرح سوار تھے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہمیشہ غلط پٹی پڑھاتا، اور لوگ غلط کو صحیح ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ فضل امام کو ہمیشہ یہی خدشہ لگا رہتا کہ پتہ نہیں کون سا شیطان ان کے بیٹوں کے کان میں کیا پھونک رہا ہے۔ وہ اپنے طور پر جانکاری حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ، ہاتھ کچھ نہ آتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ ان ماورائی چیزوں کے وجود کو حقیقی تسلیم کرتے تھے جبکہ ایسا تھا نہیں، پھر ان کی کاوشوں کا حاصل کیا ہوتا۔

کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا کہ شاید کہیں پر غلطی انہیں سے سرزد ہوئی ہے۔ انہوں نے ضرور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتی ہے۔ لیکن وہ صرف یہ باتیں محسوس کر کے رہ جاتے، انہیں اپنی آنکھوں سے اپنی غلطی دکھائی نہیں دیتی۔ آخر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ محلے کے اور بچوں کی طرح انہوں نے اپنے بچوں کو بھی مسجد کی چٹائی پر بیٹھایا، جیسے اور بچوں کو تعلیم دی، انہیں بھی دی، جیسے اور بچوں کے سبق سنتے، ان کے بھی سنتے ، جیسے اور بچو کو غلطی کرنے پر مرغا بناتے ، انہیں بھی بناتے ، جیسے اور بچوں کو اقوال ذریں رٹاتے انہیں بھی رٹاتے ، پھر کیا وجہ ہوئی کہ اور بچے تو کہاں سے کہاں نکل گئے اور یہ......

مولوی فضل امام اپنے کم علم ہونے کے باوجود یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کہیں کہیں پر صحیح اور غلط میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ تحریروں اور تقریروں کے معنی بہت آسانی سے بدل جاتے ہیں، ذرا سی غفلت آدمی کو عقل کے میدان سے بھٹکا دیتی ہے اور وہ بھٹک کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے صحیح راستہ پکڑنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کا ذہن اکثر اس تصویر کی طرف منتقل ہو جاتا جب تاریک رات میں، سیاہ پتھر پر ایک سیاہ چیونٹی بہت آہستگی سے حرکت کرتی ہے اور

آسانی سے نظر نہیں آتی، اس کو دیکھنے کے لئے نگاہوں سے زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔اور وہ تعلیم کا حاصل اسی عقل کی بازیافت کو سمجھتے تھے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ ہی بول اٹھتے۔

''شاید مجھی سے غلطی ہوئی، میں نے ہی اپنا فرض ادا نہیں کیا جو میرے ذمہ تھا.....''

ان کی بیوی زیب النسا چونک کران کی طرف دیکھتیں۔

''پتہ نہیں، رہ رہ کے آپ کو کیا ہوجاتا ہے، کیا کیا سوچتے رہتے ہیں آپ.....''

بیوی کی معصومیت پر ان کا جی چپ ہوجانے کو تو چاہتا لیکن چپ ہوجانے سے ان کا دم گھٹتا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر میں، اپنی شریک حیات کے سامنے بھی کچھ نہ بولتے تو پھر اور کہاں ان کا گزر تھا۔ یوں کچھ دنوں سے انہوں نے باہر بولنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ صرف انتہائی ضروری باتیں یا سوالوں کے مختصر جواب..... کسی مسئلے پر اظہار خیال کرنا تو انہوں نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا، پتہ نہیں کیوں زبان کھولتے ہوئے ان پر ایک خوف کی کیفیت طاری ہو جاتی، بظاہر کوئی ایسی وجہ نہیں تھی مگر بچپن ہی سے انہوں نے لوگوں کے چہرے کا رنگ، آنکھوں کی پتلیوں کا اتار چڑھاؤ اور ان کے جسمانی الفاظ وغیرہ کو پڑھنے کا اپنا شوق بنا لیا تھا۔ اب یہی شوق ان کے جی کا جنجال بن گیا تھا۔

''کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ بچے کرتے کیا ہیں.....؟''

انہوں نے جیسے فضا میں ایک جملہ اچھال دیا۔ زیب النسا تنک کر بولیں۔

''آپ کو آج تک معلوم ہی نہیں ہوسکا، کمال کے باپ ہیں آپ۔ معلوم کیسے ہوگا۔ آپ کے ذہن میں تو پتہ نہیں کون کون سی باتیں گھسی رہتی ہیں.....''

''ارے، بندہ پرور..... میں اس کام کے بارے میں نہیں کہہ رہا، اس کام کے بارے میں کہتا ہوں جو نظر نہیں آتا.....''

وہ بہت شانت لہجے میں بولے۔ یوں بھی ان کے اندر کے سارے مقام (Space) کو ان کی سوچ نے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ غصہ، تلخی اور گرمی کی کہیں گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔

''تو آپ ان بچوں سے پوچھ کیوں نہیں لیتے.....؟''

زیب النسا بھی اپنے آپ پر قابو پا کر بولیں۔ مولوی فضل امام مسکرا اٹھے۔

''وہ کبھی بتائیں گے تھوڑی..... یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو میں کب کا ان سے پوچھ چکا ہوتا.....''

''ان سے پوچھ کے دیکھئے تو، وہ جو بتائیں گے، آپ تو اسی سے پکڑ لیں گے، ماشاءاللہ آپ خود بہت عقل مند ہیں.....''

زیب النسا کے الفاظ میں طنز کی جو آمیزش تھی، اسے فضل امام محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے، مگر یوں بن گئے جیسے انہوں نے اس کاٹ کو وصول ہی نہیں کیا۔

اس دن پتہ نہیں کیسے ناشتے کی چوکی پر تینوں اکٹھا ہو گئے.....مولوی فضل امام، زیب النسا اور فہیم.....اچانک زیب النسا نے اس سے پوچھ لیا۔

''بیٹا تم کرتے کیا ہو، دن دن بھر غائب رہتے ہو، گھر میں کھانے پینے کے وقت بھی نہیں رہتے، آخر تمہیں بھوک بھی لگتی ہے یا نہیں.....؟''

فہیم کے دونوں بھوؤں کے درمیان ایک سرخ بھنور سا ناچ اٹھا جو وہاں سے فوراً اتر کر اس کے چہرے پر چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، فضل امام بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے، فہیم نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا کر سب سے پہلے انہیں کی طرف دیکھا۔ شاید فضل امام بھی یہی توقع کر رہے تھے، انہوں نے بھی بہت پھرتی سے اپنی نگاہیں آنگن کی طرف کر لیں۔ فہیم نے ایک ہلکی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں، میں بنا کچھ کھائے پیئے زندہ ہوں.....''

''وہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں.....؟''

زیب النسا نے ہولے سے پھر پوچھا۔ فہیم سمجھ گیا کہ وہ اس کے جواب کو ابا کو سنوانا چاہتی ہیں۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ بولا۔

''اماں، میں کالج سے فرصت پا کر دو تین جگہ ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں، وہیں مجھے کھانا بھی مل جاتا ہے.....''

اس دفعہ مولوی فضل امام نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں کیا۔ فہیم کو شک ہوا کہ شاید انہوں نے اس کے بارے میں کچھ پتہ لگایا ہے، پھر بھی جواب دینے میں اس نے اپنے سکون کو برقرار رکھا اور بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''زیادہ تر ٹیچر یا تو آتے نہیں یا کلاس نہیں لیتے، جو تاکید سے آتے ہیں، میں ان کے کلاس ضرور کرتا ہوں، ابا، کالج میں یوں بھی تعلیمی ماحول ہے نہیں، وہاں وقت ہی ضائع ہی ہوتا ہے.....''

''پھر بھی بیٹا، کالج آنے جانے سے آدمی کو پڑھائی کا ایک ٹیمپو بنا رہتا ہے۔ میں نے پرنسپل کی کتنی خوشامد کر کے تمہاری فری شپ کرائی تھی، تم تاکید سے کالج نہیں جاؤ گے تو وہ کیا سوچیں گے.....''

مولوی فضل امام نے اسے سمجھایا۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ باپ کی مختصر تقریر کے ختم ہوجانے پر وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

اس بے ضرر سے سوال جواب نے اس کے اندر ایک ہلچل مچا دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ سوال جواب کا مرحلہ یوں ہی درمیان میں نہیں آ گیا، ضرور اس کا ڈانڈا کہیں اور سے مل رہا ہے۔ اگر چہ وہ جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ کی دنیا بہت محدود ہے..... ماں کی تو بالکل صفر، خارجی دنیا سے ان کا جو بھی ایک کمزور سا

رابطہ تھا، وہ اس کے باپ تھے، جن کے بارے میں یہ کہاوت سو فیصد صادق آتی تھی کہ ملا کی دوڑ مسجد۔ سماج سے ان کا بہت سروکار نہیں تھا۔ پھر ڈانڈے کا سلسلہ کہاں سے مل رہا ہے، وہ سوچتے سوچتے پریشان ہو گیا۔ جہاں تک سوال و جواب کا معاملہ تھا، سوال تو تقریباً صحیح ہوں گے، مگر جواب اس کا کوئی صحیح نہیں تھا، وہ کبھی کبھار کالج جاتا ضرور تھا مگر کلاس کرنے کے لئے نہیں، فارم بھرنے، امتحان کی تاریخ کا پتہ کرنے اور لڑکیوں کے کامن روم کے آگے بہت سے لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہونے کے لئے، اور وہ ٹیوشن کیا پڑھاتا، وہ خود کتنا جانتا تھا۔ ماں باپ تو سمجھ رہے تھے کہ جب بیٹا کالج میں پڑھ رہا ہے تو اسے چھوٹے بچوں کو پڑھانے میں کیا دقت ہوگی...... یہ جھوٹ ایسے تھے کہ اسے بے دریغ بول دینے میں ذرا جھجک نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اوقات ہی نہیں کہ وہ اس کے جھوٹ کا پتہ لگاتے رہیں۔ وہ بھی کیا کرتا، وہ بھی مجبور تھا، پڑھنے میں اس کا دل ہی نہیں لگتا تھا، جب بھی پڑھنے بیٹھتا نہ جانے کہاں کہاں سے عجیب عجیب خیالات، بے معنی تصورات اور خوفناک ہیولے ذہن کے سارے کونے کھدرے سے در آتے اور اسے پڑھائی سے بہت دور اٹھا لے جاتے، پھر اسے تھپک تھپک کے بے خبری کی نیند سلا دیتے۔ مگر کالج کے بہانے گھر سے باہر جانا بھی ضروری تھا، چنانچہ اس نے ایک ایسی بڑی دکان میں نوکری ڈھونڈ لی جہاں اس کا کام صرف یہ تھا کہ دکان سے باہر جانے والے سامان کی پیکنگ کرتا، اسے ڈاک کے سپرد کرتا، باہر سے آنے والے سامان کی بلٹی چھڑاتا۔ چند گھنٹوں کی مصروفیت تھی، مگر پیسے اتنے مل جاتے کہ وہ قسم قسم کے چاٹ، پکوڑوں اور سستی مٹھائیوں سے اپنا پیٹ بھرتا رہتا، گھر کی روکھی سوکھی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی، کبھی کبھی یہ حالت مجبوری اسے زبردستی ان سوکھے نوالوں کو حلق سے نیچے اتارنا پڑتا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ کوئی زہر نوش جان کر رہا ہے۔

اس قسم کی با معنی اور بے معنی مصروفیات کے بدلے میں اسے روپا کا تصور کرنے، اس سے خیالوں میں باتیں کرنے، اس کے بارے میں سوچتے رہنے اور اپنی ایجاد کردہ ترکیب سے اس سے باتیں کرنے کا خوب موقع مل جاتا اور دراصل یہی موقع اس کا وہ چور تھا جو اسے اندر اندر دنیا سے ڈراتا رہتا۔ اس سے جب بھی کوئی قدرے معنی خیز انداز میں باتیں کرتا تو اس کے دل کا چور اس کا تار فوراً روپا سے جوڑ دیتا، حالانکہ اس نے روپا سے اپنے تعلقات کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی تھی، اس رشتے سے بس دو ہی آدمی واقف تھے، ایک روپا، دوسرا وہ خود۔ پھر بھی رہ رہ کے اسے محسوس ہوتا کہ اس کا رشتہ دنیا پر آشکار ہو چکا ہے۔ ستم یہ تھا کہ وہ اس رشتے کو کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔

روپا اسے پہلی ہی نگاہ میں اچھی لگی، اس سے دوستی کی خواہش دل میں جاگ اٹھی، روپا کو کئی وجوہات سے اس سے ہاتھ ملانے میں تامل تھا۔ اس نے بڑی صفائی اور صدق دل سے اس کے خدشات کو دور کیا۔ دوستی کا رشتہ استوار کرنے میں بھی اس نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا اور ایک 'فل پروف' طریقہ اختیار کیا، جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مگر اب اس بظاہر معصوم اور بے ضرر سی دوستی پر دوسرا رنگ چڑھتا جا رہا تھا، بیحد پکا رنگ......اس رنگ کے آگے کوئی دوسرا رنگ ٹھہرتا ہی نہیں تھا، نہ صرف یہ کہ اس رنگ نے دوستی کو اپنے اندر چھپا لیا تھا بلکہ وہ صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ اور روپا بھی اس رنگ میں نہا چکے ہیں۔

وہ ایک فاصلے پر بیٹھے ایک دوسرے کو بہت دیر تک نہارتے رہے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اپنا موبائل نہیں نکالا تھا، ان کے حرکات و سکنات بھی ساکت تھے، البتہ ان کے چہرے اور آنکھیں جس طرح رنگوں کے اتار چڑھاؤ میں ڈوب گئے تھے، اسے وہ بخوبی محسوس کر رہے تھے، اچانک روپا نے اپنے پرس سے موبائل نکال لیا، اسی پھرتی سے فہیم کی جیب سے بھی موبائل نکل کر اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔

''آخر ہم کب تک یہ کھیل کھیلتے رہیں گے......؟''

موبائل پر روپا کی بے حد دھیمی آواز اسے بہت زور سے سنائی دی، مگر وہ انجان بن گیا۔

''کون سا کھیل......؟''

''یہی اس طرح سے ملنا، جس کا کوئی معنی نہیں، لگتا ہے ہم کسی ندی میں بہے جا رہے ہیں، دور دور تک کنارہ نہیں، کچھ پتہ نہیں کہاں جا کے ٹھہریں گے......''

فہیم ہنس پڑا۔

''آج ضرور تم نے کوئی ناول ختم کیا ہے، یا پھر کوئی فلم دیکھی ہے......؟''

''تم اسے مذاق میں مت ٹالو فہیم، میں اس طرح روز روز یہاں آنے کا جوکھم نہیں اٹھا سکتی۔ کسی دن بھی میرے پتا جی اور بھائیوں کو پتہ چل گیا تو وبال ہو جائے گا۔''

روپا واقعی بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی آواز سپاٹ تھی اور وہ جیسے دو ٹوک انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ فہیم بھی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے......؟''

''اس سلسلے کو ختم ہی کر دینا چاہئے......''

اس دفعہ روپا کی آواز سپاٹ نہیں تھی۔ اس کی آواز معمول کے مطابق نہیں تھی۔ فہیم یہ سن کر فوراً کھڑا ہو گیا، پھر فوراً ہی بیٹھ گیا۔ روپا دور بیٹھی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ فہیم نے ہتھیلی کے گھیرے سے موبائل کو ڈھک لیا اور اس میں منہ ڈال کر بولا۔

''آخر ہم سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا جس کی پاداش میں ہمیں اتنی بڑی سزا ملے؟''

گومڑ

عبدالصمد

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر کوئی گومڑ سا نکل آیا ہے۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سر کے اوپر چلا گیا لیکن سہلانے اور ٹٹولنے کے بعد اس کے ہاتھ نے بتلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کا جی بہت چاہا کہ اس پر یقین کرے۔ رہ رہ کے اسے لگ رہا تھا کہ ضرور اس کے سر پر کوئی گومڑ نکلا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کا باری باری سر پر بھیج کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ہاتھ تھے کہ اپنی جگہ پر اڑے ہوئے تھے۔ تھک ہار کر اس نے اپنے ہاتھوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا لیکن اپنے آپ کو جھٹلانے کی کوشش میں سخت ناکام رہا۔

گومڑ کا احساس ہونے کے بعد اس کا کسی کام میں جی نہیں لگا۔ لیکن بکھرے ہوئے دانوں کو چُننا بھی ضروری تھا۔ سو اس نے اس کا علاج یہ نکالا کہ بڑی سی فر کی ایک ٹوپی خرید لی مگر لوگوں کو بھی کہاں چین تھا، دیکھتے ہی سوال داغنے لگے۔

''کیوں یار۔۔۔ یہ اچانک اتنی بڑی ٹوپی۔۔۔ ابھی تو سردی بھی نہیں آئی''

''بس یونہی۔۔۔ خالی خالی سر کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا''

''رہی، یعنی قبل سے اس میں کچھ تھا۔''

''یار اپنے سر سے میرا مقابلہ کیوں کرتے ہو۔ تمہارے سر میں اگر کچھ نہیں تو اس کا مطلب۔''

''خواہ مخواہ کی باتیں کیوں کرو، سچ سچ بتاؤ، بات کیا ہے؟''

وہ گھبرا گیا، کہیں اس کی چوری نہ پکڑی جائے۔ ایسے میں اپنے آپ پر قابو پانا بھی بہت ضروری تھا۔

''سچ بتا رہا ہوں۔ سر واقعی خالی لگ رہا تھا، ٹوپی پہن لی ہے تو لگ رہا ہے کہ۔۔۔''

''لیکن فر کی ٹوپی۔۔۔ کوئی ہلکی پھُلکی ٹوپی پہن لی ہوتی۔۔۔''

''بس یونہی''

اس وقت تو بات ختم ہوگئی لیکن اسے محسوس ہوا کہ ٹوپی پہننا بھی گومڑ نکلنے سے کچھ کم نہیں ہے۔

اسے لوگوں کے سوالوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دیر تک سوچ میں رہا کہ کیا کیا جائے۔ گومڑ کو برداشت کرے یا ٹوپی پہنے۔ اس نے کمرہ بند کر کے گھنٹوں اپنے آپ کو ٹوپی کے بغیر رکھا اور تب اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹوپی بہر کیف گومڑ سے زیادہ بہتر ہے۔ سوالوں کا سامنا تو اسے دونوں صورتوں میں کرنا ہوگا لیکن ٹوپی نہیں رہنے پر اس کے ہاتھ بار بار سر کا طواف کرتے رہیں گے اور پھر اسے لوگوں کے مذاق اور تضحیک کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ٹوپی کے ذریعے فوری طور پر اس نے درپیش مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا تھا لیکن گومڑ کا احساس اس کے اندر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ ٹوپی کی آڑ میں اس نے گومڑ کو لوگوں سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ پھر بھی جب وہ باہر نکلتا تو اس کا یہ احساس شدید ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ہر آدمی اس کے سر کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے اور پتہ نہیں کب کون سا سوال کر ڈالے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا یہ سوال ٹوپی کو چھوتے ہوئے گومڑ تک پہنچ جائے اور پھر۔۔۔

یہاں تک آتے آتے اس کے انداز میں خاصی تبدیلی آجاتی اور وہ ہر غور کرتے ہوئے آدمی کی نگاہوں سے فوراً باہر نکل جانا چاہتا۔ دفتر میں، بازار میں، ہوٹل میں، دوستوں کے حلقے میں جب بھی وہ باتوں میں حصہ لیتا تو یہ ڈر ہر دم اس پر سوار رہتا کہ کہیں کوئی گومڑ کی بات نہ چھیڑ دے۔ اب جب کہ گومڑ کا احساس اس کے اندر جڑ پکڑ ہی چکا تھا تو وہ بھی اسے ایک راز کی طرح پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ گومڑ کو ایک ذلیل چیز کیوں سمجھے ہوئے تھا۔ یہ بات خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ البتہ جب اسے گومڑ کا احساس ہوا تو اس کے بچپن کے وہ بڑے میاں یاد آ گئے جو اس کی گلی میں کھٹی میٹھی گولیاں بیچتے تھے۔ ان کی پیٹھ پر ایک بڑا سا کوبڑ نکلا ہوا تھا جس کے سبب وہ جھک کر چلتے۔ بچے ان کے کوبڑ پر بڑا ہنستے۔ بڑے میاں ان کی ہنسی کا بُرا نہیں مانتے کیوں کہ ان کی گولیاں خوب بکتیں اور وہ خوش خوش گلی سے واپس جاتے۔ شاید کوبڑ ان کا بزنس سیکرٹ تھا۔ بڑے میاں کے کوبڑ پر ہنسنے والوں میں وہ بھی شامل رہا تھا لیکن جب امّاں نے انہیں سمجھایا کہ کسی کی کمزوری پر ہنسنے اور مذاق اڑانے سے اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں تو اس نے ہنسنے سے توبہ کر لی۔ اب بڑے میاں پر اسے ترس آنے لگا۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی ہنسنے سے منع کرتا۔ اس کے سبب گلی کے لڑکوں سے اس کی کئی بار مار پیٹ اور جھڑپ بھی ہوئی۔ دو ایک بار بڑے میاں نے بھی اسے جھگڑنے سے منع کیا۔ وہ اپنے آپ پر ہنسنے ہی سے خوش تھے اور خوش نہیں رہتے تو کرتے بھی کیا، وہ تو خوش رہنے کے لیے مجبور تھے۔۔۔ وہ بڑے میاں کی طرح مجبور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے تو کچھ ترس کھائیں گے اور یہ دونوں حالتیں کسی قیمت پر اسے منظور نہیں تھیں۔

حسّاس تو وہ قبل ہی سے بہت تھا لیکن گومڑ نے اس میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے گومڑ کو ہر حال میں دنیا سے چھپانا چاہتا تھا۔ جب لوگ اس سے ٹوپی کے بارے میں سوال کرتے تو وہ بھی اس طریقے سے انہیں مطمئن رہنے کی کوشش کرتا کہ بات ٹوپی سے آگے نہیں بڑھے۔ اسے ہر دم یہ ڈر لگا رہتا کہ کہیں کوئی اس کے گومڑ تک نہ پہنچ جائے۔ اس کے سبب اس نے ہوٹلوں، بازار اور

دوستوں کے حلقے میں جانا بھی کم کر دیا، بس ضرورت کی حد تک ہی۔ خالی وقتوں میں کمرے میں بند گومڑ کے احساس سے تڑپتا رہتا۔

اس کا گومڑ بھی کچھ عجیب شے تھا۔ ہاتھوں پر یقین نہیں کرنے کے باوجود وہ انہیں ہاتھوں سے گومڑ کی تصدیق کرانے کی بے شمار کوشش کر چکا تھا۔ ہاتھوں کو بھی ضد تھی کہ جو وہ چاہتا، اس پر کبھی تیار نہیں ہوتے اور کرتے بھی وہی جو ان کا جی چاہتا۔ وہ سینکڑوں زاویے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کر اس بات کی بھرپور کوشش کر چکا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی اس کے گومڑ کو دیکھ لیں۔ اس کی آنکھیں اب کچھ اور ہی رنگ اختیار کر چکی تھیں، وہ اسے کسی طرح بھی اس کے گومڑ نہیں دکھا سکیں۔ اس کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ ہمیشہ اس کی آنکھ، ہاتھ اور اس کے وجود پر حاوی آ جاتا اور پھر وہی کچھ ہوتا جو اس کا احساس چاہتا۔ اکثر اس کا بھی جی چاہا کہ ہاتھوں اور آنکھوں کی طرح وہ بھی گومڑ پر یقین نہ کرے۔ کچھ دیر وہ اس حالت میں رہا بھی لیکن احساس کی بے چینی اسے پھر گومڑ کی طرف واپس لے آئی۔

گومڑ نے اس کی شخصیت، مزاج اور صحت پر بھی خاصا اثر ڈالا۔ سماجی زندگی بہت محدود ہو گئی۔ اس نے کئی رنگوں اور ڈیزائنوں کی ٹوپیاں خرید لیں اور اس کی مناسبت سے لباس بنوا لیے۔ ٹوپی بس وہ اسی وقت اتارتا جب اپنے کمرے میں بند ہوتا اور کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند رہتے۔ کئی بار موسم کے لحاظ سے دوستوں نے اسے ٹوپی اتارنے کو کہا بھی لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گیا۔ اس پر ایک آدھ نے کہا کہ لگتا ہے تم اچانک گنجے ہو گئے ہو۔ تبھی تو ٹوپی نہیں اُتارتے۔ اس نے فوراً جواب دیا۔

''ارے نہیں یار، اب عادت کچھ ایسی پڑ گئی ہے کہ ٹوپی اتارنے کے تصور سے ہی ننگے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔''

ایک دو بار بے تکلف دوستوں نے اس کی ٹوپی اُچکنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن کمال ہوشیاری سے اپنے آپ کو بچالے گیا۔ وہ خاصا محتاط رہنے لگا اور بے تکلف دوستوں سے دور ہی بھاگنے لگا۔ اگر کبھی ان کے بیچ پھنس بھی جاتا تو ان کی دسترس سے دور بیٹھتا۔

کافی عرصہ تک جب وہ اپنے گومڑ پر قابو نہیں پا سکا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب ڈاکٹر سے رجوع کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ اس نے دیر تک اپنے گومڑ کو چھپائے رکھا تھا۔ اور بڑے بڑے جتن سے اس راز کی حفاظت کی تھی لیکن اب اس کا بوجھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ اس نے موٹی فیس دے کر ایک بڑے ڈاکٹر سے وقت طے کیا۔ ڈاکٹر نے تنہائی میں اسے وقت دیا، اس کے سر کا بغور معائنہ کیا۔ کئی طرح کی مشینوں سے تیز روشنی میں اس کا جائزہ لیا اور اپنا فیصلہ یوں سنایا۔

''آپ کے سر میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ حیرت زدہ ہو گیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ بالکل صحت مند ہیں۔''

''کمال کرتے ہیں ڈاکٹر آپ بھی۔ میں گومڑ کی تکلیف سے مر رہا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ۔۔۔''

''میں پھر کہوں گا یہ محض آپ کا وہم ہے اور وہم کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔''

''ایک بار تو اور دیکھ لیجیے پلیز۔''

دیکھئے، میرا وقت بہت قیمتی ہے اور میں فضول باتوں میں۔۔۔!''

ڈاکٹر کے ہاں سے وہ بہت مایوس لوٹا۔ ڈاکٹر کی بات کا اس کے پاس کیا علاج تھا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے پاس وہ علاج کے لیے گیا تھا، مذاق کرنے نہیں اور ڈاکٹر نے اس کے گومڑ کو وہم قرار دیا۔ ڈاکٹر کا رویہ اس پر بڑا اثر انداز ہوا۔ بھلا جس بات پر وہ اتنے عرصے سے یقین کرتا آ رہا تھا، جس پر اس کی ساری محنت لگی ہوئی تھی وہ ڈاکٹر کے محض ایک جملے سے کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے رویے کے خلاف اس نے داخلی طور پر احتجاج کیا تو اس کوشش میں بیمار پڑ گیا۔ کئی روز گھر پر چپ چاپ اور بند بند رہنے کے بعد جب وہ دفتر پہنچا تو اس کا کسی کام میں جی نہیں لگا لیکن کام تو بغیر جی کے بھی کرنا تھا۔ جب اس کے کام میں کوئی چمک پیدا نہیں ہو سکی تو اس کے افسرِ اعلیٰ نے اسے بلایا۔

''کیوں مسٹر۔۔۔ کچھ دنوں سے آپ کے کام میں وہ بات نہیں ہے۔''

''بات یہ ہے سر کہ کئی دنوں سے میں بیمار ہوں اور۔۔۔''

''کیا بیمار ہیں آپ۔۔۔؟''

وہ بوکھلا گیا۔ اس سوال کا تو اس کے پاس کوئی جواب ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو وہ کوئی سوال کا جواب نہیں تھا۔

''یہ تو میں آپ کو نہیں بتا سکوں گا سر، بس بیمار بیمار سا محسوس کرتا ہوں۔''

''دیکھئے آپ بیمار ویمار کچھ نہیں ہیں۔ آپ اچھے خاصے دکھائی دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ آپ اس وہم کو دُور کیجیے۔''

''سر، ڈاکٹر بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن میں کیسے مان لوں کہ یہ محض وہم ہے۔ مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ۔۔۔۔''

''کیا محسوس ہوتا ہے آپ۔۔۔؟''

افسرِ اعلیٰ چیخ اٹھا۔

''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ۔۔۔ نہیں سر، مجھے معاف کیجیے گا، میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکوں گا۔''

''آپ کو بتانا ہوگا، تبھی تو آپ کا علاج ہو سکتا ہے۔''

"میں کچھ جانتا ہی نہیں تو آپ کو کیا بتاؤں۔"

"ٹھیک ہے، کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا، جنہیں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پَر ان کا علاج ہوسکتا ہے۔ میرے ایک دوست مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ میں انہیں فون کر دیتا ہوں، آپ ان سے جا کر ملیے۔

"سر، میں آپ کی مہربانیوں کا۔۔۔"

"کوئی بات نہیں، یہ تو میرا فرض ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دفتر میں سب سے اچھا کام آپ کا ہوتا ہے۔ میں بورڈ کے سامنے آپ کی تعریف کر چکا ہوں۔ اب اگر آپ اچھا رزلٹ نہیں دیں گے تو خود سوچئے، میری کتنی سبکی ہوگی۔"

افسرِ اعلیٰ کے احسانوں سے چُور وہ ماہرِ نفسیات کے ہاں پہنچا جس کی افسرِ اعلیٰ سے فون پر باتیں ہو چکی تھیں۔ ماہرِ نفسیات نے گھنٹوں اس کا معائنہ کیا، کئی طرح سے سوالات کیے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"ہاں صاحب، گومڑ تو آپ کے سر میں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں، اس کا علاج ہو جائے گا۔"

اس نے کچھ ورزشیں بتائیں، سر پر مالش کے لیے ایک روغن دیا، سوچ اور فکر سے توبہ کرنے کو کہا۔

ماہرِ نفسیات کے منہ سے گومڑ کی بات سن کر اسے بڑا سکون ہوا۔ وہ اس راز کو یوں تو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن ماہرِ نفسیات نے کچھ یوں ہمدردی سے گفتگو کی اور باتوں میں اسے اس طرح اُلجھایا کہ اس سے یہ راز اُگلتے ہی بنی۔

ماہرِ نفسیات کی باتوں پر اس نے پابندی سے عمل کرنا شروع کیا۔ ورزش اور مالش سے کچھ ہی دنوں کے اندر اسے محسوس ہوا کہ اس کا گومڑ اب بتدریج کم ہوتا جارہا ہے۔ اسے بہت خوشی ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ ٹوپی پھینک کر ننگے سر وہ کھلی فضا کا خوب لطف لے۔ پھر اسے خیال آیا کہ جب تک گومڑ اچھی طرح ٹھیک نہیں ہو جاتا، اسے ٹوپی نہیں اتارنی چاہیے۔ ماہرِ نفسیات کی ہدایت کے مطابق وہ پندرہ روز کے بعد پھر اس کے ہاں پہنچا۔ ماہرِ نفسیات نے ہر طرح اس کا معائنہ کر کے فیصلہ صادر کر دیا۔

"اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کے گومڑ کا اب نام ونشان بھی نہیں ہے۔"

اس روز اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھُلکا محسوس کر رہا تھا۔ اُس روز برسوں کا ایک ایسا بوجھ اس پر سے اتر گیا تھا جس سے وہ گھُٹ گھُٹ کر جی رہا تھا۔ وہ لگ بھگ ختم ہی ہو چکا تھا لیکن افسرِ اعلیٰ اور ماہرِ نفسیات کی مہربانی تھی اور خود اس کی ہمت کہ وہ پھر جی اُٹھا تھا۔ خوب بن ٹھن کے اور تیار ہو کر اس نے باہر نکلنے کی ٹھانی۔

سب سے پہلے وہ حجام کے ہاں گیا تاکہ بال قرینے سے بنوالے۔ ٹوپی نے اس کے بالوں کی شکل بگاڑ ڈالی تھی۔ گومڑ کے سبب وہ انہیں ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ حجام سے گومڑ کے نہیں ہونے کی تصدیق بھی ہو جاتی۔ حجام نے سکون کے ساتھ اس کے بال بنا دیے اور گومڑ کا نام تک نہیں لیا۔ اس سے اس کے اندر اعتماد پیدا ہوا۔ وہ ٹوپی کے بغیر باہر نکل سکتا تھا۔

خوش خوش، نئے کپڑے پہنے، ٹوپی کے بغیر وہ باہر نکلا فوراً دفتر کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوگئی۔

"بہت خوش دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"بس یونہی، بیمار تھا نا۔ اچھا ہو گیا۔ چلو کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

"واہ، یہ تو بہت اچھا پروگرام ہے، لیکن یہ تمہارے سر کو کیا ہوا۔۔۔؟"

"کیا۔۔۔؟؟؟"

وہ بوکھلا گیا۔ کلیجہ اُچک کر حلق میں آتا محسوس ہوا۔

"کچھ گومڑ سا۔۔۔"

"مصور ناول نگار"

عبدالصمد کے ناول "شکست کی آواز" میں ایسی دھمک سنائی دیتی ہے جو رفتہ رفتہ مزید وسعت کے ساتھ ہمیں متاثر کرتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عبدالصمد نے اس ناول کو بغیر کسی بیجا مصلحت یا غیر فطری عمل کے ایک مصور کی طرح لفظی تصویروں کے ساتھ کینوس پر بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ ناول اپنی ضخامت کے باوجود قاری کو اپنے مختلف رنگوں سے اس طرح آشنا کرواتا ہے کہ ایک معمولی شخص بھی کسی نہ کسی جہت سے اپنا جڑاؤ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ناول ایک پھیلی ہوئی زندگی کا پچھور رہا ہوا کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں سے کئی کئی زندگی ابھرنے لگتی ہیں۔ موضوع کو ایک تنوع دینا اہم ہوسکتا ہے مگر اسے جاودانی عطا کرنا تخلیقی سطح پر جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

قاسم خورشید (بھارت)

بھیڑ میں اکیلا شخص

عبدالصمد

کلام حیدری ہمارے درمیان نہیں ہے۔

وہ ہمیشہ کے لیے یہ دنیا چھوڑ گئے۔

اس بات پر یقین کرنے کے لیے ہمیں اپنے دلوں پر کتنی کٹھور محنت کرنی پڑے گی، یہ ہم شاید خود بھی نہیں جانتے اور اس کی بھی گارنٹی نہیں کہ اس کے بعد ہمیں یقین آ ہی جائے گا۔۔۔اس قدر زندہ شخص مر بھی سکتا ہے؟

انہوں نے قدم قدم پر اپنے اس قدر نقش چھوڑے ہیں کہ جس محفل میں بھی نگاہیں اٹھیں گی، ان کا سایہ سا لہراتا ہوا نظر آئے گا۔ نگاہیں انہیں ڈھونڈیں گی اور جب وہ نہیں ملیں گے تب۔۔۔

تب پھر اپنے آپ پر قابو پانا کتنا مشکل ہوگا، اپنے آپ کو سمجھانا، اپنے دل کو یقین دلانا اور اس بات پر ایک بار پھر ایمان لانا کہ موت ایک زندہ حقیقت ہے، آج وہ گئے ہیں، کل ہم جائیں گے، پرسوں۔۔۔

لیکن نہیں، کلام حیدری تو بہت سی شخصیتوں کا نام تھا، اگر آپ کلام حیدری افسانہ نگار کو جانتے ہیں تو آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ پھر آپ کے لیے کوئی مشکل ہے ہی نہیں۔ مشکل تو ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایک کلام حیدری کے اندر بے شمار کلام حیدریوں کو جانتے ہیں۔ مشکل میں پڑنے والوں کی اس فہرست میں ایک نام میرا بھی لکھ لیجئے۔

بارہا ایسا ہوا کہ آپ کلام حیدری، افسانہ نگار سے باتیں کر رہے تھے، اچانک ان کے اندر سے ایک شخص اور برآمد ہوا، یہ کلام حیدری تاجر تھا، دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کلام حیدریوں میں زبردست جنگ شروع ہوگئی۔۔۔ افسانہ نگار کی پوری کوشش ہے کہ وہ تاجر کو شکست دے دے اور تاجر بھلا ایک افسانہ نگار سے کیوں ہار ماننے لگا۔۔۔جنگ جاری رہی۔ ۶۵ سال تک یہ جنگ جاری رہی۔ بالآخر شکست تاجر نے کھائی نہ کہ افسانہ نگار نے۔

ایک اور شخص کلام حیدری کے اندر سے نکلا، یہ صحافی کلام حیدری تھا جو ''تہذیب'' اور ''صبح نو'' کے اداروں میں باقاعدگی سے شامل رہا، اور بے قاعدگی کی فہرست تو بہت گڈمڈ ہے۔ گیا سے ہفتہ وار ''مورچہ'' نکالا جو صحافت، ادب اور سیاست کے میدان میں کل پیمانے پر اپنا جھنڈا گاڑ گیا۔ گیا سے ماہنامہ ''آہنگ'' نکالا جس کی ادبی خدمات کے طور پر ۱۹۷۰ء کے بعد کے بیشتر افسانہ نگاروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگا کہ صحافی کلام حیدری، افسانہ نگار اور تاجر پر حاوی ہو جائے گا، اور وہ دونوں آپس میں لڑتے ہی رہ جائیں گے۔ لیکن نہیں صاحب یہ صحافی افسانہ نگار کو تو نہیں ہرا سکا البتہ تاجر کو ڈوج دے کر نکل گیا۔ کاش کہ ایسا نہیں ہوتا ورنہ ''مورچہ'' اور ''آہنگ'' کبھی بند نہیں ہوتے۔ بس یہ ثابت ہوا کہ صحافی نے ایک تاجر کو بھی شکست دے دی۔

اچانک کلام حیدری کے اندر سے ایک اور شخص برآمد ہوا۔ یہ سیاست داں کلام حیدری تھا۔ یوں اس سیاست داں کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست داں تو بہت پہلے ہی جنم لے چکا تھا۔ مظاہرہ، جیل، بیل، جلسہ جلوس، اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور کمیونسٹ پارٹی کی تحریکیں، ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں۔۔۔اس سیاست داں نے تو آزاد جمہوری ہندوستان کا پہلا سورج بھی نہیں دیکھا۔ کچھ عرصہ کے لیے اس کا نام تلاش گمشدہ کے طور پر بھی سرفہرست رہا۔ کیوں کہ اس درمیان میں تاجر نے وقتی طور پر سب کو شکست دے دی تھی۔ حریفوں نے میدان ضرور چھوڑ دیا تھا لیکن شکست ہرگز نہیں مانی تھی۔ وہ تاک میں رہے کہ کب یہ تاجر ہارے، ست پڑے اور وہ چڑھ دوڑیں۔

کلام حیدری ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں کانگریس کی امیدواری کے لیے کوشاں۔ چینی حملے کے بعد کلام حیدری نے گیا سے ہفتہ وار ''مورچہ'' نکالا تاکہ ادبی اور صحافتی محاذ پر بھی یہ جنگ لڑی جاسکے۔

بودھ گیا میں مگدھ یونیورسٹی کا قیام ہوا، کلام حیدری اس کے بانیوں میں، مگدھ یونیورسٹی کے سینٹ اور دوسری اہم کمیٹیوں میں کلام حیدری کا نام اور ان کی سرگرمیاں۔

مگدھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کے لیے کلام حیدری آگے آگے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی الیکشن کے موقع پر گیا شہر کی دیواروں پر کلام حیدری کی طرف سے پرچے چسپاں۔۔۔ کیا آپ اس موقع پر اپنی زبان کی آواز سن رہے ہیں؟

کلام حیدری انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سیکریٹری منتخب۔ سیاست دراصل ایک زندہ شے ہے، اس کا خود غرضی، مفاد اور کرپشن سے (اصولی طور پر) کوئی واسطہ نہیں۔ آج بھی اگر سیاست میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہے تو پھر ہم ایک مہذب سماج میں زندہ رہنے کا تصور بھی چھوڑ دیں۔ ادب، سیاست، سماج، صحافت پر تقریریں کر کے بور ہونے سے کیا فائدہ۔

کلام حیدری کے اندر ایک ایسا دوست چھپا ہوا تھا جو دوستوں کے لیے ہر دم مستعد رہتا تھا۔ دوستوں کے لیے ان کا گھر تھا، ان کی میزبانی تھی، ان کے رسوخ تھے، ان کے وسائل تھے، ان کی گاڑی تھی، ان کا دل تھا اور۔۔۔اس زمرے کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کا صیغۂ راز میں رہنا بہتر ہے ورنہ افشائے راز سے ان کے چند دوستوں کے وقار کا خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ دوستوں کے لیے یہ اپنی حدود سے باہر (out of way) بھی جاسکتے تھے۔ شرط صرف یہ کہ انہیں یقین ہو کہ آپ ان کے دوست ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایسے آدمی سے تو ہر آدمی دوستی رکھنا پسند کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سچے دوستوں کی فہرست اتنی طویل نہیں

ہوسکتی۔البتہ کچھ دوستوں کے لیےانہوں نے سب کچھ معاف کر رکھا تھا۔ان کی گالیاں، ان کے غصے، ان کی بے وفائی، ان کی بے رحمی، ان کی بے رخی۔۔۔ میرے جیسے غیر دوستوں کے لیے اکثر یہ چیز کوفت کا باعث بنی ہے۔لیکن اس معاملے میں کلام حیدری کے اپنے Calculations تھے،انہیں کیا فائدہ نظرآ تا تھا،وہی جانیں،ہمیں تو بھیااس میں بڑا نقصان نظرآ تا تھا۔

ان کے اندر ایک دشمن بھی تھا۔لیکن اتنا کمزور کہ وار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔آپ ان سے کچھ بھی دشمنی کر جایئے، یہ جواب میں کچھ نہیں کریں گے،سوائے ایک چپ کے۔اگرچہ اس ایک چپ میں دشمنوں کے لیے بہت سے چھپے وار ہوتے تھے۔یہ اندر کی کاٹ کرتے، بظاہر کچھ نقصان نہیں پہنچاتے تھے،اگر آپ کو اندر کے کاٹ کی پرواہ نہیں تو پھر کوئی بات نہیں۔

دوستی اور دشمنی کی بات نکلی ہے تو میرے پچیس سالہ تجربے کا نچوڑ بھی سن لیجئے کہ میں آج تک ان کے دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر پایا۔دراصل دونوں میں اس قدر باریک لکیر کھینچی ہوئی تھی کہ اسے دیکھنے پہچاننے کے لیے آنکھوں پر بڑا زور دینا پڑتا تھا۔یوں کبھی کبھار تیز روشنی میں یہ لکیر نظر بھی آجاتی تھی۔میں نے بارہا دیکھا کہ جو صاحب ان کے پاس سے اٹھ کر گئے،ان کے ساتھ ہنس ہنس کر مزیدار گفتگو کر کے،منہ پر ان کی تعریفیں کر کے،مہربانیاں وصول کر کے۔۔۔ پیٹھ مڑتے ہی انہوں نے ان کی ایسی غیبت کی کہ بس خدا کی پناہ۔۔۔ پتہ نہیں یہ بدنصیبی کلام حیدری کی تھی یاان کے دوستوں کی۔

ان پر پتھر تو برستے تھے اور یہ پتھر زیادہ تر دوستوں کی کمیں گاہوں سے ہی آتے،لیکن وہ ان پتھروں کو پھول سمجھ کر چوما کرتے،شاید وہ اپنے لاکھ سجدوں کا یہی صلا پا کر بہت خوش ہوتے تھے۔لیکن اپنے دوستوں اور عزیزوں پر برسنے والے پتھروں کا وہ خوب حساب رکھتے تھے۔ایک بار مجھ سے کہا کہ یہ جو کچھ لوگ اتاؤلے ہور ہے ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟

میں نے جواب دیا کہ ان پتھروں اور گالیوں سے مجھے جو فائدے پہنچ رہے ہیں،ان سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں آپ مجھے؟

مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ان کے اندر ایک ایسا باپ بھی تھا جسے بجا طور پر اپنی بیٹی پر ناز تھا۔ اکلوتی بیٹی، ماں باپ کا بے اندازہ پیار، ہر طرح کی آسائش اور آرائش کی دستیابی۔۔۔ بگڑنے کے سبھی اسباب مہیا تھے۔لیکن وہ نہیں بگڑی۔وجہ ایک باپ کی ہوشیار اور چوکس نگاہیں ہر دم اس پر لگی ہوئی تھیں،اس میں وہ سختی کا دخل تھا،نہ کسی قسم کی تنبیہ کا۔جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں وہ ان کی بیٹی کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ اور سبھی معاملوں میں تو افسانہ نگار، تاجر، صحافی اور سیاست داں اور ان کے اندر سے نکلنے والی بہت سی شخصیتیں ایک دوسرے پر ٹوٹنے لگتی تھیں،لیکن اپنے اندر کے باپ کو انہوں نے سبھی شخصیتوں سے بچا کر بالکل الگ تھلگ رکھا،جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔بیٹی اور پھر بیٹی کی دونوں بچیوں میں منقسم ہو کر وہ پہلے سے زیادہ بھرپور ہو گئے تھے۔

دیکھنے، سننے، پہننے، اوڑھنے اور رہنے سہنے میں وہ بالکل ماڈرن تھے۔ ایک دم اکیسویں صدی میں جانے کے لیے تیار۔لیکن اندر سے وہ بہت پرانے آدمی تھے، پرانی تہذیب کے دلدادہ، پرانے کھانوں کے شوقین اور پرانے زمانے کو یاد کرنے والے۔ایک دن، دو دن، ہفتہ، دو ہفتہ کی بات بڑی آسانی سے بھلا دیتے۔لیکن آپ ان سے ان کے گاؤں میں پھلنے والی سبزیوں کے رنگ پوچھ لیجئے،جنہیں دیکھے ہوئے چالیس پچاس سال گزر چکے ہیں۔آپ ان سے گاؤں کے ایک ایک آدمی کی تعریف سن لیجئے۔شہر سے گاؤں تک پہنچنے میں جو دھول انہوں نے کھائی،اس کا مزہ انہیں ہمیشہ یاد رہا۔آپ نے اگر ان کے ساتھ کبھی سفر کیا ہو، آپ کو امید ہی نہیں،یقین کامل ہو کہ اگر چائے پان کی ضرورت ہوئی تو کم از کم ایک ہی اسٹار کے درشن ہو جائیں۔کلام حیدری تاجر اور ان کی فی بیٹ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا کوئی ایسا گناہ بھی نہیں ہوتا۔لیکن ہوا یہ کہ راستے میں ایک ڈھابہ نظر آ گیا اور گاڑی وہیں کھڑی ہو گئی۔اندر بیٹھنے تک کی جگہ نہیں۔یوں ہی ایک بے ڈھب سا اسٹول رکھا ہے۔آپ سوچتے ہی رہ گئے اور یہ اسٹول پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر پکوڑے اور چائے کی فرمائش بھی کر بیٹھے۔آپ نے ناک بھوں چڑھائی اور ان کا لیکچر شروع۔

''ارے کھاؤ میاں۔۔۔تکلف نے تم لوگوں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔''

دوسری طرف شہر اور صوبے سے باہر آپ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے نیچے درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔لیکن توجہ کیجئے فائیو اسٹار ہوٹلوں کو انہوں نے ڈھابہ بنا رکھا تھا۔آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور لوٹیں لگانا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔

کلام حیدری کا جب دوسرا مجموعہ ''صفر'' شائع ہوا تو انہوں نے اس میں ایک شعر لکھا:

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

یہ شعر گیا کے ساتھ ان کے تعلق اور بے تعلقی کا جیتا جاگتا اظہار ہے۔ انہوں نے مجموعے پر یہ شعر لکھتے ہوئے کرب کی کون سی سنگین وادیوں کی سیر کی یہ تو میں نہیں جانتا لیکن میں شعر پڑھ کر کانپ گیا تھا۔جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ شعر فوراً ذہن میں آ جاتا ہے۔

انہوں نے دونوں رسالے بند کر دئے، پریس فروخت کر ڈالا، بزنس بند کر دیا، اور ان کی قیام گاہ ''رینا ہاؤس'' پر جو بلاشبہ ایک تہذیبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا،اکثر تالے نظر آنے لگے۔دلی میں انہوں نے مکان بنا لیا تھا اور وہاں دل لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔دلی سے واپسی پر بظاہر وہ صحت مند نظر آئے لیکن اندر سے کس قدر ٹوٹ چکے تھے،اس کا اظہار ان کی مایوسی بھری باتوں

سے اکثر ہوتا تھا۔منصوبے اور پروگرام ان کے پاس ابھی بھی تھے لیکن اب ان میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

وہ سب سے بھاگ کر پھر گیا لوٹ آئے تھے اور بالآخر گیا کی سنگلاخ زمین نے اپنے سینے پر بیگانہ وضع رہنے والے اس شخص کو اپنی آغوش میں سمولیا۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آدمی کو پہچاننے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی۔ دوسروں کو اس غلط فہمی کا شکار کرنے میں کسی اور کا نہیں، قصور انہیں کا تھا۔ اتفاق سے میں ان کے، ان چند لمحات کا گواہ ہوں جب وہ افسانہ نگار تھے، نہ تاجر، نہ صحافی، نہ سیاست داں۔۔۔صرف کلام حیدری، اور تب یہ پتہ چلا کہ یہ شخص تو صرف کلام حیدری ہی رہنا چاہتا تھا، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اپنے اندر سے جو اتنی شخصیتیں انہوں نے برآمد کی تھیں وہ سب کی سب اصل کلام حیدری کو چھپانے کے لیے، کلام حیدری کو گم کرنے کے لیے تا کہ لوگ افسانہ نگار، تاجر، صحافی، سیاست داں وغیرہ وغیرہ میں الجھ جائیں اور اصل کلام حیدری تک نہ پہنچ سکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کلام حیدری تک بہت کم ہی لوگ پہنچ سکے۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس شخص کی انتھک کوششوں سے زندگی اسے دریافت نہیں کرسکی اسے موت نے دریافت کرلیا۔

کیا اسے زندگی پر موت کی فتح سمجھی جائے؟

مگر موت نے اس پر فتح حاصل کرکے اسے تو زندہ جاوداں بنادیا۔

کیا اس کے اور ہمارے درمیان مٹی کا پردہ ہو جانے سے دوری ہو گئی۔۔۔؟ نہیں۔۔۔ہرگز نہیں۔

وہ زندہ رہے گا ہمارے دلوں میں، ہمارے فن پاروں میں، ہمارے قلم میں، ہم اسے کبھی بھول نہیں پائیں گے۔

اور صرف ایسا کرکے ہی ہم موت کی سازش کو ناکام بنا سکیں گے۔

''یادرہ جانے والے کردار''

''سیاہ کاغذ کی دھجیاں'' کے تیرہ افسانوں میں اور خاص طور سے ان تین افسانوں میں جن پر کسی قدر تفصیل سے غور کیا گیا ہے بے جان کردار شاید ایک بھی نہیں، سب ہی خاصے جاندار ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی بھی ''زندۂ جاوید'' کردار نہیں۔ نئے افسانہ نگاروں سے اور اُن سے بھی جو کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے بعد افسانہ نگاری کے کاروبار شوق میں مصروف ہوئے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ان کے یہاں ایسے کردار کیوں نہیں ملتے۔ عبدالصمد سے یہ مطالعہ اور توقع کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کم سے کم ایسے دو چار کردار اردو کو دیں گے کچھ ایسا غلط بھی نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ انہوں نے اختر حسین، بی۔بی۔جی اور اجودھیا بابو ایسے کردار تخلیق کیے ہیں، یعنی انہیں یادوں کا پیچھا کرنے والے کردار تخلیق کرنا آتا ہے لیکن یہ سارے کردار ''دوگز زمین'' سے تعلق رکھتے ہیں جو کم وبیش تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ناول ہے اور زیرِ نظر افسانوی مجموعے سے تقریباً دگنی جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ دوسرے یہ کہ تہذیبی اور سیاسی عرصے اور بنگلہ دیش، شمالی ہندوستان اور پاکستان کو ذہن میں رکھا جائے تو ناول کا عرصہ کم وبیش سو برس اور مکانی بساط ہزاروں مربع میل قرار پائے گی۔ اس میں دو چار یادرہ جانے والے کردار نہ ہوتے تو حیرت کا مقام تھا۔ زندۂ جاوید کردار قائم کرنے کے لیے فیصلہ کن گھڑیوں کے علاوہ مستحکم لیکن متصادم اقدار کا نظم بھی ضروری ہوتا ہے۔

عابد سہیل (لاہور)

''شفاف بیانیہ''

شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانہ نگاروں سے واقعہ بیان کرنے کی مانگ کی تھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کی اس پکار پر سب سے زیادہ بھر پور طور پر لبیک کہنے والا افسانہ نگار عبدالصمد ہی ہے۔ اس کے پچانوے فیصد افسانوں میں واقعہ ہی بیان کیا جاتا ہے، ترقی پسندوں کی طرح کردار نگاری یا جدیدیت پسندوں کی طرح دروں بینی عبدالصمد کا شعار نہیں۔

عبدالصمد بنیادی طور پر شفاف بیانیے کے وارث ہیں مگر یہ وراثت صرف اور صرف کفن کی ہے یہ اس بیانیہ کی وارثت نہیں ہے جس کے نمونے علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے یہاں نظر آتے ہیں بلکہ کفن کے پوائنٹ سے بات شروع کی جائے تو حیات اللہ انصاری کی کہانی (آخری کوشش) کے اسلوب کی طرف بھی نگاہ اٹھ جاتی ہے۔

یہ شفاف بیانیہ (Transparent Description) کفن اور آخری کوشش تک آ کر رک نہیں جاتا، آگے بڑھتا ہے اور اس میں گاہے گاہے غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کو Cultivate کرنے کی خواہش بھی جھلکتی نظر آتی ہے جو منطقی طور پر عبدالصمد کے اس اسلوب کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے جس میں یہ شفاف بیانیہ استعارہ اور پیکر کے بجائے اک نشانی، آیت (Emblom) کے طور پر خود کو متعارف کراتا محسوس ہوتا ہے۔

حسین الحق (بھارت)

''منصورِعصر''

حمد باری تعالیٰ

خیال تیرا ہے خوابِ رواں بھی تیرا ہے
شعور و فکر کا حاصل جہاں بھی تیرا ہے

جو راس آئے کسی کو کبھی خلوصِ وضو
نماز تیری ہے وقتِ اذاں بھی تیرا ہے

جو تیرے قرب سے منصورِعصر ہو جائے
میں سوچتا ہوں وہی رازداں بھی تیرا ہے

حیات تیری حقیقت ہے موت تیرا ثبوت
ازل، ابد ہی نہیں درمیاں بھی تیرا ہے

یہ جسم و جاں کا تسلسل وجود مٹی کا
یہاں بھی تیرا نشاں ہے وہاں بھی تیرا ہے

شریکِ گردشِ لیل و نہار ہم ہیں مگر
زمیں بھی تیری، زمان و مکاں بھی تیرا ہے

مرے خدا! تیرا عرفاؔن رکھنے والا تک!
ہے جس کی چھاؤں میں وہ سائباں بھی تیرا ہے

غالب عرفان
(کراچی)

''نعت''

دُرودِ پاک پڑھ کر سوچتی ہوں
اسی برکت سے بہتر سوچتی ہوں
رسول پاکﷺ کے روضے پہ جاؤں
میں اُس لمحے کا منظر سوچتی ہوں
مرا محور وہی مکہ ، مدینہ
وہی عالم وہی در سوچتی ہوں
ثناء کیسے کروں شانِ نبیﷺ کی
میں اک خاکی ہوں کمتر سوچتی ہوں
نبیﷺ کی ذات اور آل نبیﷺ کو
زمانے بھر کا رہبر سوچتی ہوں
وہی حافظ وہی ناصر ہیں میرے
اُنہیں کو اپنا محور سوچتی ہوں
گناہوں سے بدن ہے چُور لیکن
میں کلمہ پڑھ کے محشر سوچتی ہوں
جہاں خطبے وہ نورانی دیے تھے
وہی محراب و مِنبرَ سوچتی ہوں
میں دیکھوں خواب میں جلوہ نبیﷺ کا
وضو کر کے یہ اکثر سوچتی ہوں
پڑھا صلی علیٰ جب سے سبیلہؔ
وہی مہتاب و انور سوچتی ہوں

سبیلہؔ انعام صدیقی
(کراچی)

افسانچے

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

''روزی کمانے کا طریقہ''

کامران اور آصف دونوں دوست آفس جانے کے لئے پوائنٹ کا انتظار کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔'' آج مسز جور جینا اسمتھ (Mrs Georgina Smith) ریٹائر ہو رہی ہیں''۔کامران نے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''ہاں یار! بہت برا لگ رہا ہے یہ سوچ کر کہ وہ کل سے آفس نہیں آئینگی۔'' آصف کے لہجے سے بھی دکھ جھلک رہا تھا۔

'' ہمارا ان کا پانچ سال کا ساتھ ہے ۔کتنی محبت سے پیش آتی تھیں،ہم سب۔۔۔'' ابھی کامران کا جملہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے دیکھا ایک نسوانی ہاتھ اس کے منہ کے آگے پھیلا ہوا تھا۔

''صاب جی! ناشتہ کرادو، بہت بھوک لگ رہی ہے۔۔۔صاب جی !بس پچاس روپئے دے دو،اللہ تمہارا بھلا کرے گا'' وہ مسلسل بولے جارہی تھی۔

کامران نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی، کالا لہنگا اس پر سرخ رنگ کی کرتی، جس میں شیشے جھلملا رہے تھے اور سرخ پر بڑے بڑے سے ڈوپٹے میں ملبوس ایک بیس، پچیس سال کی قبول صورت لڑکی کھڑی تھی۔کامران کھسک کر وہاں سے علیحدہ ہو گیا، آصف بھی کامران کے نزدیک آ گیا۔بات پھر وہیں سے شروع ہوئی ''مسز جور جینا اچھے اخلاق، محبت سے پیش آنے والی، اور ہر ایک کے کام آنے والی خاتون ہیں۔'' آصف نے کہا:

''ہاں یار! ابھی کامران کچھ کہتا کہ پھر وہی ہاتھ اسکے آگے پھیلا ہوا تھا۔''صاب جی! اللہ تمہیں خوش رکھے، تمہارے بال بچوں کو خوش رکھے، صاب جی! غریب کی مدد کر دو۔۔۔وہ اور اس کے نزدیک آ گئی۔

کامران نے محسوس کیا کہ یہ پیچھا نہیں چھوڑے گی۔اس نے جیب سے پرس نکالا، اس میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس Change نہیں ہے۔''

''صاب جی! چھٹا میں تم کو دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے لہنگے کے نیفے سے بندھی ہوئی ایک میلی سی تھیلی نکالی، تھیلی کھول کر پچاس کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی جو ربر بینڈ سے بندھی ہوئی تھی۔اس میں سے ایک پچاس کا نوٹ نکال کر کامران کے ہاتھ میں دیا اور اسکے ہاتھ سے سو کا نوٹ لیکر تہہ کر کے تھیلی میں رکھ دیا۔

'' تمہارے پاس تو اتنے سارے پیسے ہیں پھر تم کیوں پیسے مانگ رہی تھیں کہ ناشتہ کرادو، غریب کی مدد کر دو۔'' آصف نے اس سے پوچھا۔

اس نے تھیلی کو نیفے میں رکھتے ہوئے کہا:

''صاب جی! یہ تو ہمارا روزی کمانے کا طریقہ ہے۔''

اتنے میں پوائنٹ آ گیا اور کامران اور آصف دونوں پوائنٹ میں چڑھ گئے۔

''پروٹیکشن''

اس دن اسے جوب سے واپسی میں تھوڑی دیر ہو گئی۔جب وہ گھر پہنچی تو اس کے گھر کے باہر ایک مجمع لگا تھا، عورتوں اور مردوں کا چند ایک بچے بھی تھے۔وہ گھبرا گئی، سیدھی اپنی بچی کی طرف بھا گی ۔ بچی جو (Child protection Services) چائلڈ پروٹیکشن سروسز کی ایک خاتون رکن کے پاس تھی۔سوزن نے جلدی سے بچی کو اپنی گود میں لینا چاہا مگر بچی اسے نہیں دی گئی۔

سوزن نے بچی کو دیکھا جو اسے اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھ کر یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنی ماں کو پہچانتی ہے۔

''بچی کا نام کیا ہے۔؟'' اسی خاتون رکن نے پوچھا

''میری!'' سوزن نے جواب دیا

'' تم میری کی پرورش اور دیکھ بھال نہیں کر سکتی ہو اس لئے میری تمہیں نہیں ملے گی، اب یہ ہماری ذمہ داری ہے، یہ ہمارے پاس رہے گی''

اس خاتون رکن نے کہا۔

''میں سنگل مدر ہوں۔جوب نہیں کرونگی تو بچی کے اور اپنے اخراجات کیسے پورے کرونگی ۔ میں گھر کے سامنے گراسری اسٹور میں جوب کرتی ہوں ۔ درمیان میں آ کر بچی کو دیکھ کر جاتی ہوں اسکو دودھ پلاتی ہوں، اس کا ڈائپر تبدیل کرتی ہوں۔'' سوزن نے ملتجیانہ انداز میں اپنی مجبوری بتاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے ہمیں ۹۱۱ والوں نے یہاں بلایا۔اور ۹۱۱ والوں کو تمہارے پڑوسیوں نے ۔۔تمہاری بچی بلک بلک کر رو رہی تھی ۔اور بچی کو دیکھنے والا گھر میں کوئی نہ تھا۔ بچی کو کچھ بھی ہو سکتا تھا'' ۔۔۔تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر وہ بولا ''جس کا مطلب یہ ہے کہ تم بچی کو صحیح طریقے سے نہیں پال سکتی ہو، ہم قانون کے تحت مجبور ہیں اور بچی کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔'' پولیس یونیفارم میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والے ایک مرد نے آگے بڑھ کر کہا۔

سوزن بہت روئی، بہت بلکی، بہت منت کی، وعدہ بھی کیا کہ وہ اب کبھی میری کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔مگر ان لوگوں نے اس کی ایک نہ سنی اور میری کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ اب ''اکیلی ماں'' (Single Mother) نہیں رہی تھی۔وہ صرف اور صرف ''اکیلی عورت'' تھی۔ازلی اور ابدی اکیلی عورت جس کو تاریخ عالم میں جانے کتنی بار کتنی جنتوں سے نیچے زمین پر پھینکا جاتا رہا ہے، اور پھینکا جاتا رہے گا۔

''بے ڈھب''

عذرا اصغر
(کراچی)

مالک مکان سے چابی پکڑ ابھی میں نے تالے میں گھمائی بھی نہیں تھی کہ پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''باؤجی۔''

میں نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا۔ چابی کا ایک سرا تالے کے اندر تھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔

''باؤجی تم نے یہ کمرہ کرایہ پر لیا ہے؟''

''ہاں۔ مگر تمہیں کیا؟''

ادھیڑ عمر، فربہ اندام، میانہ قد، آنکھوں میں سرمے کی لمبی لمبی ڈوریاں، ڈھیلے بالوں کی چوٹی اور اس میں سرخ پراندہ، پان چباتی وہ مجھے بڑی چکر مکر سی لگی۔

''تمہیں کمرہ صاف کرانا ہوگا باؤجی۔ اسی لیے چلی آئی۔'' اس نے عجیب انداز سے آنکھیں نچا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

بادلِ نخواستہ میں نے ہاتھ مار کے دروازے کے پٹ کھول دئے۔ وہ بل کھاتی مسکراتی اندر چلی گئی۔ کمرہ پہلے ہی خالی پڑا تھا۔ اس نے بے یقینی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور شاید یقین کر لینے کے بعد کہ کمرہ واقعی خالی ہے اس نے میری موجودگی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بے تکلفی سے گلے میں پڑا لہرئے دار دوپٹہ اتارا اور اطمینان سے دیوار جھاڑنے لگی۔ میں بالکونی میں کھڑا بے نیازی سے سگریٹ پیتا رہا۔

یہ کمرہ جو میں نے اپنے ہفت روزہ کیلئے کرایہ پر لیا تھا۔ ایک پر رونق سڑک پر تعمیر شدہ بلڈنگ کے اوپر والے حصے میں تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ دوکانیں جگمگا اٹھی تھیں اور سڑک پر لگی بتیاں بھی ایک ایک کر کے جلتی جا رہی تھیں۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور خرید و فروخت کرنے والوں کی وجہ سے بازار میں گہما گہمی پیدا ہو چلی تھی۔ میں بالکونی میں کھڑا شاید تیسرا سگریٹ ختم کر رہا تھا اور میری آنکھیں سڑک پر جمی تھیں۔ رنگ برنگی ساڑھیاں، بیل باٹم اور لہراتے آنچل، گورے کالے سانولے بے شمار چہروں کا سیلاب رواں تھا۔ اور میں پتہ نہیں کہاں گم تھا۔ کن تصورات کے تانے بانے بننے میں محو تھا کہ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''باؤجی کہاں سے آئے ہو؟''

وہ بے نیازی سے میری پشت پر کھڑی اپنا دوپٹہ جھٹک رہی تھی۔

''تم سے مطلب؟''

''عجیب عورت ہے'' میں نے دل ہی دل میں جھنجھلا کر سوچا۔ نہ اپنی تنخواہ کی بات، نہ کام کی تفصیل۔ میرے بارے میں تجسس ہو رہا ہے۔ ''سبحان اللہ''

''ایسے ہی پوچھا تھا جی۔ تم تو بگڑتے ہو۔'' وہ دوپٹہ گلے میں جھلاتی فرش صاف کرنے لگی۔ مجھے ہنسی آ گئی اور گالی میرے ہونٹوں سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔ شاید اپنی جھنجھلاہٹ میں اسی طرح دور کر سکتا تھا۔ دوسرے روز میں فرنیچر لگوا رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ میں چونک پڑا۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ بنی ٹھنی تھی۔ میں نے میز کا زاویہ درست کر کے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ واقعی وہ غیر معمولی سج دھج سے آئی تھی۔

''باؤجی کیا میز پہ سویا کرو گے؟'' وہ کھل کھلا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ لکھنے کے لیے ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اور سونے کے لیے کیا ہے؟ منجی تو دکھائی نہیں دیتی!'' اس نے پھر سوال کیا۔

''اس کے لیے میرا گھر جو موجود ہے۔''

''تو تم رہو گے نہیں یہاں؟'' اس کے انداز میں مایوسی تھی۔

''بھئی تجھے میرے متعلق اتنی فکر کیوں ہے؟'' میں صوفے پر دم لینے کو بیٹھ گیا۔

''بس یونہی جی۔'' اس نے گویا شرما کر اپنا سر جھکا لیا۔ لمحہ بھر ٹھہر کر وہ پھر بولی۔

''باؤجی ایک بات پوچھوں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بیاہے ہوئے ہو جی!''

عجیب سوال تھا۔ میں جھلا کے رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

''بھئی تو اپنا کام کر۔ میری فکر چھوڑ۔'' نیم دراز ہو کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔

وہ روز کام کرنے آتی اور جب چاہتی بے تکلفی سے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیتی۔ اس کی بے تکلفی کے مظاہرے میرے لیے مصیبت بنتے جا رہے تھے۔

اس دن میں مہمان نوازی سے تنگ آ چکا تھا۔ صبح سے ہی دفتر میں لوگوں کا تانتا بندھا رہا تھا۔ بعض دن ایسا ہوتا ہے جیسے آنے والے باہمی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ آج فلاں شخص کی زندگی اجیرن کرنی ہے۔ اور پھر یکے بعد دیگرے آئے چلے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی ذی ہوش کی شکل دیکھنے کو طبیعت مچل اُٹھتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ کاروباری مسائل حل کر کے مہمان نوازی کا بوجھ اٹھا اٹھا کر میں چُور ہو چکا تھا۔ ذرا تازہ دم ہونے کے لیے میں آنکھیں موند کر صوفے پر لیٹ گیا تھا کہ یوں لگا جیسے مجھ پر کوئی جھکا ہوا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا بات ہے باؤجی؟ سر دبا دوں؟''

''اف! میرے خدا۔ کیا اس قدر بھی ذلیل ہونا تھا؟'' دونوں ہاتھ

باندھ کراس میں اس پر برس پڑا۔

''خدا کا واسطہ بی بی! میرے حال پر رحم کر۔ جو تیرا کام ہے کئے جا اور میری جان چھوڑ۔ وہ شاید سمجھ گئی یہ سب مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔ تبھی وہ دونوں وقت پابندی سے آتی تو ضرور مگر چپ چاپ کام کر کے چلی جاتی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا ''چلو کمبخت چپ تو ہوئی۔''

مگر اس کی خاموشی میں بڑا گمبھیر پن تھا۔ جیسے وہ میرا جائزہ لے رہی ہو۔ چپکے چپکے مجھے پرکھ رہی ہو۔ میں محسوس کرتا۔۔۔ الجھتا جھنجھلاتا۔۔۔ اور اسی طرح وقت گزرتا رہا۔۔۔ بڑھتا رہا۔۔۔ میرا کام ہی کچھ اس نوعیت کا تھا۔ تمام دن آنے جانے والوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔۔۔ لطیفے بازی ہوتی۔۔۔ ہلکے ہلکے شائستہ قسم کے مذاق۔۔۔ طنز و مزاح سے بھرپور جملے اچھلتے۔۔۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ گرما گرم چائے کے دور چلتے۔۔۔ ہم شاعر اور ادیبوں کے پاس لفاظی کے علاوہ اور دھرا بھی کیا ہے۔ اپنا فن بیچ کر جو پیسہ ملتا ہے وہ ضروریات کے لیے ہی ناکافی ہوتا ہے۔ عیاشی کرنے نکلیں بھی تو کس بل بوتے پر۔ وہ میرے پاس خواتین اور خصوصیت سے لڑکیوں کو بیٹھا دیکھتی تو کچھ تشویش۔۔۔ کچھ تجسس اور بھی اس کے چہرے پر پھٹکار بن کے برسنے لگتا۔ بہت دن چپ رہنے کے بعد ایک دن وہ تمام ضبط کی قوت کھو کر، صبر کی حدود پھلانگ کر قدرے بھنائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم جی آخر کرتے کیا ہو؟''

''جھک مارتا ہوں۔'' میں نے لاابالی پن سے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے تم یہاں بیٹھ کر کیا کرتے ہو؟'' وہ رسان کی لے میں مجھے سمجھانے لگی۔

''بھئی کام کرتا ہوں۔ اور کیا کرتا؟''

''کس قسم کا کام؟ میں تو جی بی بیوں کو ہی بیٹھا دیکھتی ہوں۔''

''تمہیں کچھ اعتراض ہے؟'' مجھے شوخی سوجھی۔

وہ شاید میرا مطلب نہیں سمجھی۔ اسی لیے پریشان لہجے میں بولی۔

''باؤ جی میرا مطلب ہے کہ تمہارا کاروبار کیا ہے؟''

''بی بی! روٹی کمانے کے سو دھندے ہیں۔ اب تجھے کیا بتاؤں؟''

''کیا تم جی فلموں کے گیت بناتے ہو؟''

''ہاں۔۔'' میں نے اسے ٹالنے کو اقرار کر لیا۔

''میری بیٹی کو بہت گیت آتے ہیں جی۔''

''اچھا۔۔'' میں اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

''ریڈیو پر سن سن کے بچے یاد کر لیتے ہیں۔''

''پہلی بات تو یہ جی کہ وہ بچی نہیں ہے۔ دسویں کر کے اب ٹائپ سیکھ رہی ہے۔''

''ٹائپ نہیں کمپیوٹر۔''

''ہاں وہی وہی۔''

''اچھا ہے۔'' مجھے حیرانی ہوئی۔ تبھی یہ ایسی بنی سنوری رہتی ہے۔ جمعدارنی لگتی ہی نہیں۔ گھر کا ماحول جو بدل گیا۔''

''ہاں جی۔ اس کام میں بھلا کہاں گزارہ ہے۔ آج کل بابو لوگ لکھی پڑھی لڑکیوں کے علاوہ کسی سے بات تک نہیں کرتے۔ کمر ٹوٹ گئی ہے اپنی تو۔ اب چھوکریاں کسی قابل ہوگئی ہیں تو ذرا دام ملے گا۔''

''کتنے بچے ہیں؟'' مجھے کچھ دلچسپی ہوئی۔ علم کی روشنی اس طبقے تک پہنچی تو۔''

''دو چھوکریاں ہیں جی۔ چھوٹی آٹھویں میں پڑھے ہے۔''

''لڑکا نہیں کوئی؟'' مجھے افسوس ہونے لگا۔

''کرنا بھی کیا ہے جی۔ مرن جوگا ہوتا تو باپ کی طرح ہمارے پر ہی پڑتا۔'' وہ اکتا کر بولی۔

مجھے کچھ ضروری خط لکھنے تھے۔ میں اسے نظر انداز کر کے لکھنے میں مشغول ہوگیا۔

''یہ تمہاری پڑوسن ہے نا جی۔ نواں بچہ ہونے والا ہے اس کے گھر۔''

اس نے مجھے پڑوسیوں کے حقوق یاد کرائے۔ جن کی طرف میں نے کبھی توجہ نہ دی تھی۔

''لاحول ولا۔۔۔ بھئی مجھے بھلا کیا۔ چاہے انیسواں ہو۔''

''میں نے کتنا کہا بی بی خاندانی منصوبہ بندی کے ہسپتال چلی جاؤ۔''

''بہت معمولات ہیں بھئی۔ میں اس سے چھپا کر دل ہی دل میں ہنسا۔''

''کہتی ہے آنیوالے کو کون روک سکتا ہے۔ مُلّے کی اولاد۔''

''کون؟'' میں چونکا۔

''وہی باؤ جی تمہاری پڑوسن۔''

''ہوگی۔ تمہیں کیا''

تیسرے یا دوسرے دن وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لائی۔ کلف سے اکڑی لٹھے کی شلوار۔ اونچی ایڑی کا سینڈل، مسکارہ لگی آنکھیں اور لال گہرے ہونٹ، تبت ٹالکم پاؤڈر کی مہک۔

''تو یہ ہے تمہاری بیٹی۔''

''جی! میری شازیہ'' وہ مسرت سے کھل اٹھی۔

''بیٹھو'' میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ اس کی دس جماعتوں کو کہا۔ اس کی ڈبل ریٹ پر دھلی سولہ ہزار کے لٹھے کی شلوار کو کرسی پیش کی۔ اب میں کرتا بھی اور کیا۔ وہ کرسی پر ٹک گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی شازیہ''

''ہاں شازیہ'' شازیہ کچھ لجائی، کچھ شرمائی اور اپنا نام بتاتے بتاتے پہلے سے کچھ اور زیادہ سمٹ گئی۔

باقی صفحہ ۱۰۳ پر ملاحظہ کیجیے

استخوانی پنجرہ

نیّراقبال علوی
(لاہور)

اوائیل مارچ کی بہاررُت سے مالامال۔۔۔ایک سہ پہر۔

شائق عالیشان رہائش گاہ کے ہرے بھرے بہشت نما لان میں چھتری کی چھاؤں تلے نیم دراز ہوشہرہ آفاق دانشور درمیانی رات Stephen Hawking کی کتاب''A brief History of Time''بغور پڑھنے میں مستغرق۔

دفعتاً۔۔اسے اپنے کاندھے پر انسانی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ چونکا۔گردن گھما کر دیکھا تو پشت پر مُرشد حسبِ معمول معنی خیر۔۔۔مگر جاذبِ نظر مسکان سجائے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

آؤ۔۔۔آؤ۔۔۔مُرشد آؤ۔

اس سے قبل کہ شائق مزید بولتا۔مُرشد زبان پہ یہ شکوہ لاتے ہوئے مقابل میں دھری بید کی کرسی کی جانب بڑھا۔ یار! کمال ہے یوں لگتا ہے سادھوؤں کی مانند سب کچھ تیاگ کر جنگلوں یا غاروں میں چھپے رہتے ہو۔ایسی بھی کیا بے اعتنائی کہ انسان اپنے مربیوں اور یاروں کو بھولنے لگ جائے؟

شائق اپنے قلبی فشار اور اندرونی بے کلی پر پردہ پوشی کرتے ہوئے جھوٹ موٹ مسکرایا اور پھر کہنے لگا۔لگ بھگ پندرہ ارب سال قبل بگ بینگ کے ذریعے وجود میں آنے والی کائنات میں انسان کی حیثیت دیت کے وسیع وعریض سمندر میں ایک حقیر ذرّے کی مانند ہے۔ پوری گلیکسی اربوں، کھربوں ٹنوں بوجھ اٹھائے پانچ سو کلومیٹر فی سیکنڈ کی برق رفتاری کے ساتھ اَن دیکھی منزل کی جانب اڑی جا رہی ہے۔ ایک طرف ایسا پُر پیچ وقید المعقول گورکھ دھندہ اور دوسری جانب فقط بیس گرام کا ہلکا پھلکا۔۔۔انسانی دماغ، جو شب و روز ان پُر اسرار گتھیوں کو سلجھانے میں ہمہ وقت مصروفِ کار اور اگر یہ نہ ہو تو کائنات کی ہر شے بے نام ونشان، غیر معروف، اکارت، بلا تعارف، رائیگاں، امتیاز و اہمیت کے بغیر۔۔۔مُرشد نے بھرپور قہقہہ لگایا لیکن۔۔۔شائق کو یہ ہنسنا، بلا مقصد و بے محل سا لگا۔ جبکہ مُرشد اپنے تئیں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے تو سماجی نوعیت کا معمولی سوال کیا تھا، مگر یہ کس سائنسی معمّے میں مجھے الجھا رہا ہے؟

تاہم۔۔۔مُرشد نے لقمہ دیتے ہوئے اپنے سے کم تجربہ کار اور قدرے نوعمر دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔شائق صاحب! بیس گرام تو دماغ کا وزن ہے جب کہ یہ سائز میں بہ مشکل تیرہ سے چودہ ملی میٹر۔۔۔اور اتنے حقیر حجم میں لگ بھگ چودہ ارب خلیے مصروفِ عمل۔ لہٰذا حضورِ والا ذرا سوچیے کہ یہ قدرت کا کتنا عظیم الشان کرشمہ ہے کہ اسے انسانی دماغ میں یہ استطاعت رکھ دی ہے کہ وہ لامحدود کائنات اور اس کے ان گنت اسرار و رموز کو حیطہ ادراک میں لا سکے۔ بہ الفاظ دیگر۔۔۔ یہ وسیع وعریض کائنات انسانی دماغ میں سما سکتی ہے۔

شائق دوست کی اس سائنسی سوجھ بوجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیوں کہ اس کی نظروں میں اس کا عمر رسیدہ دوست دراز و پریشاں زلفیں، لمبی داڑھی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے، ہاتھوں کی انگلیوں میں رنگ بہ رنگی پتھروں والی انگوٹھیاں پہنے کوئی ملنگ، سنت یا درویش کا روپ دھارے۔۔۔ ہر دم روحانیت کا درس دیتا دکھائی پڑتا۔اور یہی وجہ تھی جو شائق اپنے دوست راشد علی کو''مُرشد'' کہہ کر پکارتا۔

تم نے سوفی صد درست کہا۔۔۔مرشد۔لیکن میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ خارجی کائنات کے علاوہ ارضی زندگی میں، یعنی معاشرتی، ثقافتی، معاشی و تاریخی شکست وریخت، ردوبدل کے نتیجے میں ذہن پر اس قدر دباؤ بڑھ جاتا ہے کہ یہ شل ہو کر رہ جاتا ہے اور مجھ جیسا سوچ بچار کرنے والا دقیقت پسند شخص بھی خوش مزاجی، شگفتگی، خندہ پیشانی کا دامن چھوڑ کر درشتگی، تنک مزاجی اور باؤلے پن کا اسیر بن جاتا ہے۔لہٰذا میری اس ذہنی تبدیلی، بانجھ پن اور خلوت نشینی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کے تم ہی شاکی نہیں بلکہ۔۔۔نامور کو بھی کبھی کبھار میرے سڑیل پن اور نامعقول رویئے کی شکایت رہتی ہے۔

ملازمہ کی لائی ہوئی چائے میں وہ چمچ ہلا کر شائق کی بات کو بہ غور سننے میں محو۔۔۔پھر خامشی سے کپ کو ہونٹوں سے لگا کر خوش ذائقہ چائے کی چسکی بھری۔ خشمگیں نظروں سے دوست کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولا۔

یار! نہایت حیران کن امر ہے کہ تم جیسے ذہین فطین، بالغ النظر اور روشن خیال لوگ بھی جاہلوں اور زندگی کی رمق سے بے گانوں کی مانند ازدواجی اور خانگی جھمیلوں میں گرفتار ہوں؟ ضروریاتِ زندگی کی ہر کل پہ دسترس کے باوصف۔۔۔زندگی سے شکوہ؟ کم از کم۔۔۔تمہیں زیب نہیں دیتا۔حقائق کو بلا حیل وحجت تسلیم کرنے والے شائق عثمانی نے بلا تامل دوست کو آگاہی دلائی کہ تمام آسائشوں پر تصرف کے باوجود زندگی میں اک تناؤ، بے کیفی، بے قراری۔اور یہ کیفیت۔۔۔یوں بڑھے جا رہی ہے جیسے دور خلاء میں یہ کائنات تواتر کے ساتھ آہستہ آہستہ پھیلی چلی جا رہی ہے۔

شائق عثمانی اور نامور قیس کے بیٹے ہیں۔ اک دوجے کو ٹوٹ کر چاہنے والے۔ دورانِ تعلیم اسیرانِ محبت اور اختتامِ تعلیم پر شادی کے بندھن میں بندھے۔ دونوں فرسودہ رسم ورواج سے باغی، انسانیت ومحبت کے نقیب۔ روشن خیال، کشادہ دل، خوش مزاج، پُر امن سماج اور انسانوں کے شایانِ شان دنیا کے سپنے دیکھنے والے، علم وادب کے متوالے، اعلیٰ انسانی رویوں اور مفید عالمگیر اقدار کے ارتقا کے داعی، ظلم وجبر کے قلع قمع کے علمبردار، ایک پُر امن سادہ اور وحشت و اندوہ سے پاک زندگی بسر کرنے کے طالب۔

مُرشد کی نگاہیں گلاب و گیندے کے دلکش پھولوں کی کیاری میں محوِ رقص دو تتلیوں کے حیرت انگیز رقص کو دیکھ کر مسرور و مخمور۔ پھر اس نے سگریٹ سلگا کر دھواں بکھیرا، جو سلوموشن میں تتلیوں ہی کی مانند فضا میں اِدھر اُدھر ڈولنے لگا اور پھر۔۔۔تحلیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل۔

کیا دیکھے جا رہے ہو؟ شائق نے مستعجب ہو کر پوچھا۔

زندگی۔۔۔ اس نے مختصراً جواب دیا۔ چند ثانیوں کا سکوت اور ۔۔۔دوبارہ گویا ہوا۔

دیکھو شائق! حسابی کلیوں، سائنسی موشگافیوں اور فلسفیانہ معموں پر غور و فکر اور تفکر و تدبر تو تمہیں بہت مرغوب ہے تاہم۔۔۔ باطنی کیفیات اور روحانی نشیب و فراز سے تم سراسر بےزار یا دوسرے لفظوں میں الرجک ہو۔ کہیں تمہاری اندرونی پژمردگی یا باطنی خلاء کی اصل وجہ ان رجحانات سے اغماز برتنا تو نہیں؟

شائق ہنستے ہوئے بولا۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

وہ بھی ہنستے ہوئے جواباً کہنے لگا۔ میں تمہیں ہرگز سبز چولا اور کان پھڑوانے کا مشورہ نہیں دینا چاہتا۔ لیکن اتنا کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ دماغ۔۔۔ جسے تم جیسے مفکر و دانشور، سائنسدان اور فلسفی بہت اہمیت دیتے ہیں، بلا شبہ فطرت کی فقیدالمثال تخلیق ہے مگر اس سے بڑی اور کہیں حیرت انگیز شے ''دل'' بھی ہے جو اسرار و رموز، گہرائی اور ہمہ گیریت میں دماغ سے کہیں اہم اور زیادہ موثر و کارآمد، لیکن انسان اس کو کھوجنے میں ہنوز نامراد اور اسے بروئے کار لانے میں ابھی بہت ناکام ہے۔

شائق بڑبڑا اپنے دوست کو گھور رہا تھا۔ دنیا علم کے علاوہ، ایک روحانی علم بھی ہے۔ مُرشد کسی ماہر استاد کی مانند کہنے لگا اور تم اس حقیقت سے بھی انحراف نہیں کرو گے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو دنیاؤں کے متعلق بتایا ہے۔ ایک عالمِ شہادت اور دوسرا۔۔۔ عالمِ غیب۔ انسانوں کی بڑی اکثریت نے فقط عالمِ موجود یا محسوسات کی دنیا کو ڈھونڈا، اور وہ بھی۔۔۔ مکمل طور پر نہیں۔ جب کہ عالمِ غیب کا سراغ لگانا تو ۔۔۔ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ اس عالم کی شناوری کے واسطے انسان کو اپنے دماغ کے بجائے ''دل'' کی ضرورت ہے جو ابھی تک پتھر کی سِل کی طرح اس کے سینے میں بے حس و حرکت موجود ہے۔ جب محبت و حساسیت کی سان پہ صیقل ہو کر یہ زجاج کا روپ دھارے گا تب چشمِ انسانی کے سامنے عالمِ غیب مشہود ہونے لگے گا۔

لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ دماغ کے بجائے دل کو بھی بہ روئے کار لا کر دیکھو۔

تو گویا تم مجھے۔۔۔ اپنی طرح تصوف کے لبادے میں ملفوف دیکھنا چاہتے ہو؟ شائق نے بڑے بڑے نگوں والی انگشتریوں سے مروج۔۔۔ اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

نہیں نہیں۔۔۔ میں مروجہ تصوف پہ سو بار لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ تو نری دکانداری ہے۔ ویسے بھی کسی کو زبردستی کھینچ کر اس وادیِ پُراسرار میں نہیں لایا جا سکتا۔ بلکہ یہ تو روحانی و قلبی واردات ہے جس کا اطلاق منتخب انسانوں پہ خود بہ خود ہوتا ہے۔ اس نے نگاہوں کی تیز دھار برچھیاں جواں دوست کی متجسس آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

کیا تم وہ دریا پار کر گئے۔۔۔ جس میں کئی سال پہلے کودے تھے؟ دوست کی آنکھوں میں مضبوط و تابناک حصار سے نکلنے کے واسطے شائق نے دریافت کیا۔

اس دریا کی طغیانیوں میں جو لذتیں، اس کے گردابوں میں جو راحتیں اور اس کے زیر و بم میں جو نظارے پوشیدہ ہیں وہ۔۔۔ پار لگنے ہی نہیں دیتے، اس دریا کے غوطے مَن کی آنکھوں سے دیکھنا، پردوں کے پیچھے جھانکنا سکھاتے اور محبت کے آخری زینے پہ پہنچا کر، منزلِ عشق پانے میں راہنمائی کرتے ہیں۔ مُرشد نے کمال دھیرج اور حظ دروں اٹھاتے ہوئے کہا۔

ایک روز بغیر اطلاع کیے۔۔۔ وہ اپنے ہی حلیے اور اپنی ہی عمر کے اجنبی شخص کے ہمراہ چلا آیا۔ گرد آلود بالوں، کٹے پھٹے پیروں والا یوں دکھائی دیا جیسے وہ جنم جنم سے محوِ سفر رہا ہو۔ موسموں کی شدت اور زمانے کے تھپیڑوں نے اس کی جلد سیاہ چمڑے کی سی بنا ڈالی۔ اس کی شخصیت وقار، طنطنے یا وجاہت و حشمت سے سراسر عاری۔ تاہم آنکھوں کے جلال اور مقناطیسیت نے اسے کسی دوسرے کرے کی مخلوق بنا رکھا تھا۔ بدن خستہ و نیم عریاں، ہاتھ میں کشکول، نہایت کم گو۔ بولتا تو محسوس ہوتا جیسے۔۔۔ منمنا رہا ہو۔ اسے آسانی سے سمجھنا محال۔ زمان و مکان اور دنیا و مافیا سے قطعی طور پر بے نیاز۔ اپنی کھال میں کلی طور پر آسودہ و مخمور۔ البتہ اس کے ڈھانچہ نما بدن کی ایک کیفیت انتہائی فہم طلب اور حیرت انگیز۔ وہ یہ کہ اس کی بوسیدہ صدری کے نیچے برہنہ سینے میں دل ایسی بےتابی اور شدت کے ساتھ دھڑکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا گویا کوئی سرپھرا پکھیرو تواتر کے ساتھ باہر نکلنے کی خواہش میں استخوانی پنجرے کی دیوار کے ساتھ دیوانہ وار سر ٹکرا رہا ہو۔

مُرشد نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ اس کا اُستاد ہے۔ گرد کا گھن آلود پیکر، ہوش و حواس سے تہی دامن شخص کی شخصیت کی طرح بھی اس کے لیے متاثر کن نہ تھی۔ البتہ شائق عثمانی کی بیگم نے غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے اپنائیت اور تجسس کا اظہار کیا۔

اگلے روز۔۔۔ شائق کی غیر موجودگی میں وہ تنہا گھر چلا آیا۔ نامور نے شوہر کو دفتر سے لوٹنے پر بتایا۔ شوہر نے خاص نوٹس نہ لیا۔ نہ ہی۔۔۔ وہ اجنبی سے کسی طرح بھی خائف ہوا کیوں کہ مُرشد کسی غلط آدمی کو ہرگز اس کے گھر نہ لا سکتا تھا۔ بیوی نے شوہر کو بتایا کہ ''بابا'' تمام وقت خاموش رہا۔ البتہ ٹکٹکی باندھے ہمہ وقت اسے گھورتا رہا۔۔۔ چند نوں بعد۔۔۔ وہ پھر چلا آیا۔

اس دوران میں نامور کے مزاج میں خاطر خواہ تبدیلی رونما ہونے لگی۔ اس کی اکتاہٹ، متلون مزاجی اور شاکی رویے کے بجائے شگفتگی و شادابی اور گرمجوشی در آئی۔ اکثر و بیشتر وہ اس حواس باختہ بابے کے گُن گانے کے ساتھ

ساتھ شدت سے اس کی آمد کی منتظر رہتی۔

ایک شام۔۔۔غیر متوقع طور پر وہ اکیلا چلا آیا۔ یہ بات تعجب خیز کہ۔۔۔پہلی ملاقات کے بعد مُرشد کبھی اس کے ساتھ نظر نہ آیا۔ اس وقت شائق عثمانی کو اس کی آمد ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ اسے باہر نکالنے کا قصہ کرنے ہی والا تھا کہ اسے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی جب اس کی خوبرو رفیقہ حیات اس کی بانہوں میں جھول گئی۔ ایک عرصہ گزرا۔۔۔دونوں میاں بیوی کبھی اس طرح باہم نہ ملے تھے جس طرح وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دونوں کو شیر وشکر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ خاوند نے سخت برہمی اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھا جو اس کے سامنے ''راسپوتین'' کا روپ دھارے کھڑا تھا۔ لیکن۔۔۔اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ یک دم موم کی طرح پگھلنے لگا۔ سُرخ انگارے سی آنکھوں میں گویا سورج تیر رہے ہوں۔ اتنا جلال۔۔۔ایسی فیرگی، ایسی کاٹ دار نظروں کے سامنے وہ بتدریج ڈھیڑ ہوتا چلا گیا۔ جذبہ رقابت خس وخاشاک کی مانند بہنے لگا۔ بلکہ اس کی رگ غیرت بھی دم توڑنے لگی۔ اس کو یہ سوچنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اس خبیث کے بھیجے کو گولی سے اڑا دے۔ نہ ہی بیوی کی حرکات نے اس بات پر اکسایا کہ آئس پکس سے اس بے شرم کا پیٹ چھید ڈالے یا جلتے ہوئے سگریٹ سے اس کی فربہ وگداز چھاتیاں داغ دے۔ اس کے برعکس وہ حیرت وراحت سے یہ تماشا دیکھے جا رہا تھا۔ شائق نے البتہ یہ سربستہ راز جاننے کی کوشش کی کہ ناموروں جیسی صفائی پسند، پیروں فقیروں سے نالاں، فہم وفراست سے مالا مال خاتون اور۔۔۔کہاں یہ متعفن، جھریوں سے لبریز مخبوط الحواس بوڑھا۔۔۔اور یکا یک اسے۔۔۔بورنیو کے وہ چیمپنزی بندر یاد آ گئے جن سے اس وقت یہ دونوں بے حد مماثلت رکھتے تھے۔

ٹین ایجرز کی مانند۔۔۔دونوں دنیا ومافیا سے بے خبر۔۔۔فلرٹ کرنے میں مگن۔ تھوڑی دیر بعد شائق عثمانی اکتائے ہوئے تماشائی کی طرح تماشا چھوڑ کر اپنے سٹڈی روم میں چلا آیا۔ یہاں آکر وہ انسانی جذبات بارے غور وفکر کرنے لگا۔

کیا یہ وہی روحانی عمل ہے جس کی جانب مُرشد نے اشارہ کیا تھا؟ یا اس عقدے کا تعلق انسان کے جنسیاتی ارتقاء سے ہے؟ تاہم وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہا۔ کبھی کبھار نامور کا کھلکھلا کر ہنسنا، اس کی یکسوئی میں انتشار کا موجب بن جاتا، اسے ایسے لگتا جیسے دونوں ایک دوسرے کو گدگدا رہے ہوں۔ شائق نے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے کی ریخوں میں سے جھانکا تو دونوں ڈرائنگ روم میں بچھے غالیچے پر ایک دوسرے سے بچوں کی طرح گتھم گتھا ہو رہے تھے بوڑھا سادھو نامور کو۔۔۔بے تحاشہ پیار کر رہا تھا اور وہ معصوموں کی مانند، اس کے لمس، اس کے گداز، اس کی تپش سے انتہائی مسرور وشادمان ہو رہی تھی۔

قریباً نصف گھنٹا بعد وہ۔۔۔شوہر کے کمرے میں وارد ہوئی اور خجالت مٹانے کی غرض سے اس کے گلے میں اپنی کومل بانہیں حمائل کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

ڈارلنگ!

Don't Mind it please

He is just like my pet

شائق جواباً مسکرا دیا۔ پھر وہ اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ لیکن رسپانس نہ پا کر سرعت سے اس کی گود سے یہ کہہ کر اُٹھ گئی کہ میں کھانا بنانے جا رہی ہوں۔ تم ذرا ''باباجی'' کا سر دبا دو انہیں شدید درد ہے، اور ہاں! آج رات وہ ہمارے ہاں ہی قیام کریں گے۔ خاوند نے فراخ دلی سے کہا: کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔جیسے اس کی بھی یہی منشا ہو کہ وہ۔۔۔رات ان کے ہاں بسر کرے۔

وہ ڈرائنگ روم میں چلا آیا اور اپنی پیاری شریک حیات کی فرمائش پر اجنبی ہونق جس کے نام تک سے نا آشنا اور نہ ہی جاننے کا خواہاں۔ قالین پہ اوندھے منہ لیٹے ہوئے کا خامشی کے ساتھ سر دابنے لگا۔ اب شائق عثمانی کے دل میں ایک مرتبہ پھر نفرت وکراہت کی کونپل نے سر نکالا اور اس کا جی چاہا کہ بوڑھے کا کدو جیسا سر زور سے دبا کر اس کا بھیجا مَسل ڈالے مگر۔۔۔اس کی پختہ کھوپڑی اور شائق کے ہاتھوں کی نزاری۔۔۔آڑے آئیں۔ دفعتاً۔۔۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے موجودہ نسلِ انسانی کے اجداد Homosapines کا سر ہاتھوں میں لیے اسے سہلا رہا ہو۔ جس نے لاکھوں، کروڑوں برسوں پہ محیط ارتقائی منازل کے بے شمار مراحل طے کیے۔ یکا یک شائق عثمانی لاکھوں سالوں کا فاصلہ طے کر کے ماضی کے غیر مہذب اور تہذیب وتمدن سے عاری دور میں جا پہنچا۔ وقت بے وقت ہو کر باہم خلط ملط ہو گیا۔ پل بھر میں تہذیبِ نو اور جدید انسان کے علم و عرفان اور تدبر وتعقل کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو گئی۔

تہذیب وتمدن اور اخلاق واقدار۔۔۔سب کچھ بکواس دکھائی دیا۔ غاروں اور جنگلوں میں رہنے والے انسان اور اپنے ہم عصر انسانوں میں اسے کوئی امتیاز وانفرادیت نظر نہ آئی۔ وہ سوچنے لگا۔۔۔انسان آج بھی اتنا ہی سفاک، شقی القلب اور خونخوار ہے۔ جتنا کروڑوں سال قبل اس کا جدِ امجد تھا۔ انسان اب بھی اتنا ہی جاہل، گھٹیا اور بدترین مخلوق ہے، جیسے تاریخ کے ابتدائی ادوار میں تھا۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔

ایک نیم برہنہ، متعفن، آداب ومزاج سے نا آشنا ''راسپوتین'' ٹائپ شخص سے اپنے شوہر کی موجودگی میں جس کی دلکش وجاذب نظر، فیشن ایبل، متمول و مہذب بیوی ایسا سب کچھ کرتی ہے سوسائٹی جس کی اجازت نہیں دیتی۔ تو پھر۔۔۔ قدیم وجدید میں فرق کہاں ہے؟ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس غلیظ وجاہل آدمی کے پاس کون سی گیدڑ سنگھی ہے جس کے استعمال سے نامور کی خزاں رسیدہ شخصیت باغ وبہار ہو گئی؟ ایسا کون سا منتر تھا جسے استعمال کرنے میں وہ خود ناکام رہا؟

مگر مچھ جیسے قدیمی درندے کی مانند قالین سے چپٹے شخص کا سراپا دیکھتے ہوئے وہ حیرت کے وسیع وعریض بلیک ہول میں چکر کاٹنے لگا۔ اس کا بیس گرام وزنی دماغ بری طرح شل ہوئے جا رہا تھا۔

یکا یک فقیر نے کروٹ بدلی، اس کی انگارا آنکھوں کی تاب

برداشت سے باہر۔نحیف سینے میں بےطرح پھڑکنے والے دل نے شائق کے رگ وپے میں کہرام بپا کرڈالا۔

حق ۔۔۔اس کے حلق سے نکلی گرجدار کڑک، کمرے کے در و دیوار میں سرایت کرگئی۔پھر عالمِ بےخودی میں وہ گویا ہوا۔

دل دریا، سمندروں ڈونگے

کون دلاں دیاں جانے ہُو

اپنی سحرانگیز آنکھوں سے شائق کو گھورتے ہوئے وہ بولا: اس مرتبہ منمناہٹ کے بجائے اس کی آواز میں گرج اور ایک اچھوتے رعب کی آمیزش۔۔۔تم فریبِ نظر میں مبتلا ہو۔تمہاری کوتاہ نگہی اور مادیت پرستی تمہیں آگے بڑھنے کے راستے میں مخل ہو رہے ہیں۔تمہارا دماغ پراگندہ اور دل بے نور۔۔۔جب کہ باطنی کٹورے کو اچھی طرح مانجھنے کی ضرورت ہے۔

شائق کو اپنا جثہ۔۔۔سر سے پاؤں تک لرزتا ہوا محسوس ہوا۔

بے وقوف! ہزاروں، لاکھوں برسوں کا انسانی ارتقاء۔۔۔صرف جسمانی اور مادی ارتقاء ہے فقط مادہ۔۔۔زمان ومکان کے حصار میں ہے، جبکہ انسانی باطن یا روح زمان ومکاں کی حدود سے ماورا ہے۔لہٰذا باطن، خودی، کریکٹر یا روح ہنوز۔۔۔ارتقاء طلب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قدیم اور جدید، انسانوں کی دونوں صورتوں میں تمہیں کوئی خاطر خواہ تفاوت دکھائی نہیں دیتا۔وہ بھی حیوان تھا اور یہ بھی۔۔۔حیوان ہے۔اپنے دل میں اٹھنے والے بہ ظاہر پیچیدہ و گنجلک سوالوں کے جوابات اس جاہل بوڑھے کی زبان سے سن کر وہ مبہوت ہو گیا۔

وہ شائق عثمانی کو اپنے لبوں پہ مسکان سجائے دیکھ رہا تھا۔

پھر آہستہ سے منمنایا۔آج بھی سب کچھ وہی ہے جو۔۔۔ازلوں سے تھا۔مورکھ! کچھ نہیں بدلا۔بلکہ ہماری ہوس پرستی اور کج روی مزید بڑھتی جا رہی ہے۔ہم بھی ہو بہ ہو وہی کچھ کرنے کے متمنی ہیں جو ہمارے پرکھوں نے کیا۔ترقی علم کی نہیں بلکہ۔۔۔عقل کی ہوئی ہے جو سراسر نقصان دہ ہے اگر ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی ہوتی تو۔۔۔قدرے بہتر ہوتا۔عقلیت پسندی نے آدمی کو انسان کے بجائے شیطان بنا ڈالا۔آج وہ کہیں زیادہ بےرحمی اور بربریت سے اپنے ہم جنسوں کا خون کرتا ہے۔تہذیب وتمدن کے چمکتے دمکتے پُرفسوں پردوں کے نیچے سب کچھ قدیمی، غیر انسانی اور وحشیانہ ہے۔

تم ایک سوچ بچار کرنے والے انسان ہو لیکن۔۔۔مختلف زاویوں سے گھوم گھام کر صرف عقل و دماغ ہی کو بروئے کار لاتے ہو۔ضرورت اس امر کی ہے کہ روح کی پرتوں کو کھولو۔دل کی گہرائیوں میں اترو۔اگر تم نے اپنی شریک حیات کی جسمانی آسائشوں کا خیال رکھنے کے بجائے اس کے باطنی محاسن کو ٹٹولا ہوتا تو تمہاری زندگی۔۔۔ہرگز غیر متحرک اور اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتی۔

شائق کو اپنی آنکھیں نم آلود سی محسوس ہوئیں۔

نامور نے کھانا چننے کا اعلان کیا۔فقیر اپنی جگہ سے اُٹھ کر باورچی خانے میں گیا، کشکول کو پانی سے لبالب بھر کر واپس مڑا۔میز سے ایک روٹی اٹھائی اور لان میں جانے کا کہہ کر۔۔۔پھر کبھی اس گھر میں قدم نہ دھرا۔

میاں بیوی نہایت اُداس و دل گرفتہ ہوئے۔بہت عرصے بعد شائق عثمانی کی ملاقات اپنے عمر رسیدہ دوست راشد علی عرف ''مُرشد'' سے ہوئی۔جس نے باتوں باتوں میں دوست پر یہ اہم عقدہ افشا کیا کہ وہ نیم عریاں، مست ملنگ۔۔۔تمہارا اُسسر۔۔۔کیا بک رہے ہو؟

تمہارا مطلب ہے وہ۔۔۔وہ نامور کا باپ تھا؟

ہاں ہاں۔۔۔وہ تمہاری پیاری بیوی کا والد تھا۔

لیکن یار مُرشد! اس کو گذرے تو ایک طویل عرصہ بیت گیا۔

مُرشد کے منہ سے نکلے ہوئے گرجدار ''حق'' نے۔۔۔شائق عثمانی کو چونکا دیا۔وہی آواز، وہی تکلم، وہی اسراریت، یکا یک اس کی نگاہ مُرشد کے سینے پر جا مرکوز ہوئی۔جہاں مقید پنچھی۔۔۔استخوانی پنجرے کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔

اب کی بار شائق کو آنکھوں کے ساتھ اپنے گال بھی تر بہ تر محسوس ہوئے۔

مُرشد نے بڑی شفقت سے اپنے پیارے دوست کے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے ہولے سے کہا:

میں قربان تہاں تی باہُو

قبر جنہاں دی جیوے ہُو

راشد علی عرف مُرشد نے دوست کو زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچا اور اپنا منہ اس کے کان سے لگا کر منمناتے ہوئے کہا:

یہ دماغ کی نہیں بلکہ۔۔۔دل کی دنیا ہے۔

اور پھر کبھی نہ ملنے کے لیے شائق سے جُدا ہو کر چلا گیا۔

''پریشانی کا سبب''

بھارت کی ریاست آسام کی مشہور سبز چائے بنانے والی کمپنی نے امریکہ کی ری پبلیکن پارٹی کے صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ کو اپنی کمپنی کے چھ ہزار ٹی بیگ اس پیغام کے ساتھ ارسال کیے ہیں کہ خود کو راہِ راست پر لانے اور پاک صاف کرنے میں ابھی دیر نہیں ہوئی۔ہم آپ کو احترام کے ساتھ اس غرض سے بہت ساری سبز قدرتی چائے بھیج رہے ہیں جو آپ کے جسم میں موجود نقصان دہ ذرات سے لڑ کر آپ کی روح اور جسم کو پاک و صاف کرنے میں مدد کرے گی۔اس وقت آپ واحد شخص ہیں جو پوری دنیا کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ آپ کو آپ کے کسی عمل سے روک سکیں لیکن مثبت تبدیلی کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔

فرحت باجی

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

معمول کے مطابق رات کا کھانا کھانے اور خبرنامے سے خون کا دباؤ بڑھانے کے بعد دانت صاف کرنے کی غرض سے غسل خانے میں گئے تو اپنا ٹوتھ پیسٹ غائب دیکھ کر پہلے سے بڑھا ہوا خون کا دباؤ مزید شدت اختیار کر گیا۔ قبل اس کے کہ افرادِ خانہ کی شامت آتی ایک نئے رنگ اور قسم کا ٹوتھ پیسٹ سامنے پا کر کام چلانے کا ارادہ کر لیا۔ ہر چند ٹوتھ پیسٹ کا ذائقہ ہمارے حساس دانتوں کو بھلا نہ لگا مگر جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق وقتی طور پر مصالحت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سامنے کے دانتوں اور دائیں بائیں داڑھوں میں بے دلی سے برش گھمانے کے بعد جیسے ہی ہم نے اندرونی داڑھوں کی خیریت دریافت کرنا شروع کی تو گھر کی سب سے لاڈلی بیٹی ارفہ عرف اپّا کی آواز ہمارے کانوں میں گونجی:

''بڑے ابّو آپ کا فون بج رہا ہے''

ہم نے ''اوں ہوں'' کی آواز سے اپنی مصروفیت کی اطلاع دی تو اپّا نے بٹن دبا کر ہمارے سیل فون کا گلہ دبانے میں عافیت جانی۔ غسل خانے سے واپسی پر ہم نے یہ جاننے کی غرض سے کہ اس وقت کس کو ہماری یاد آئی ہے فون آن کیا تو سیما بھابھی کا نمبر دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ بھابھی سے ہمارا یہ خاموش معاہدہ ہے کہ دوسرے، تیسرے روز فون کر کے ہم اُن کی خیریت دریافت کریں گے وہ اس باب میں قطعی اسرافِ بے جا نہ کریں گی۔ کال بیک کے بٹن کو دبا کر جونہی ہم نے سیما بھابھی کے نمبر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تو دوسری طرف سے فوراً آواز آئی:

''کامران کیسے ہو؟''

''اللہ کا کرم بالکل ٹھیک ہوں''

جوں جوں بھابھی کی گفتگو آگے بڑھتی گئی وُوں وُوں ہمارے چہرے کا رنگ فق ہوتا گیا اور پہلے سے بڑھتا فشارِ خون رگوں میں مزید ہلچل پیدا کرنے لگا۔ وہ رات ہمارے لیے ایک تکلیف دہ رات تھی۔ دل اور دماغ کسی طور یکسو نہ ہو رہے تھے۔ سوچوں کا طویل سلسلہ قطار در قطار ہمیں مضطرب کرنے کے لیے اُمڈتا آ رہا تھا۔ پہلے سوچا نیند کی دوائی لے کر اعصاب کو پُرسکون کریں تو شاید ان سوچوں سے نجات مل جائے پھر یاد آیا کہ ایسے مواقعوں پر ہم نے جب جب دوائی کی مدد سے پُرسکون ہونے کی کوشش کی تب تب ہمیں مشکل کا سامنا رہا۔ اعصاب پُرسکون ہونے کے بجائے اور مضطرب ہو جاتے۔ نیند کی دوائی ہضم نہ ہونے کے باعث طبیعت میں اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی۔ بہتر طریقہ یہی تھا کہ ہم بستر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلیں اور گھر کے باغ میں جا کر چہل قدمی کے ساتھ لمبے لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کریں۔

ہر چند ہماری کوشش کسی قدر کامیاب رہی مگر نتائج توقع کے مطابق برآمد نہ ہو سکے۔ کم و بیش تین دہائیوں پر محیط یادوں کا سلسلہ بلکہ یوں کہیے خوشگوار یادوں کا سلسلہ مسلسل ہمارے دل و دماغ پر یلغار کیے جا رہا تھا۔ ہر واقعہ، ہر قصہ ایک ہجوم کی شکل پہلے میں پہلے کی ضد میں وارد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس زمانے کے رسوم و رواج اور روایات کے مطابق لڑکی کے والدین یا بزرگ اور رشتے دار لڑکے کو دیکھنے اور پوچھ پڑتال کے لیے آیا کرتے تھے۔ مگر یہاں تو قصہ ہی الٹ تھا۔ لڑکی خود چل کر لڑکا دیکھنے آ گئی تھی۔ نہایت شوخ چنچل، دھان پان، دراز قد، کِھلتا ہوا چہرہ اور کالی سیاہ روشن آنکھوں کے ساتھ بے تکلفانہ انداز دیکھ کر ہمارے حواس منتشر ہو گئے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ قبل اس کے ہم خود کو مجتمع کر کے محترمہ سے سوال و جواب کرتے کہ ایک پکی عمر اور فربہ جسم کے گورے چٹے فارغ البال شخص نے ڈیڑھ دو برس کے بچے کو خاتون مذکور کی گود میں تھماتے ہوئے کہا:

''لو بھئی اسے سنبھالو، ناک میں دم کر دیا اتنی سی دیر میں''

ہماری پریشانی باقاعدہ بدحواسی کا روپ دھار چکی تھی۔ بولنے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی تو آواز باہر نہ آ سکی۔ ہماری کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے خاتون نے نہایت بے تکلفی سے کہا:

''کیا بات ہے کامران بھائی، آپ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''نا، نہیں، نہیں تو''

''میں آپ کی سالی ہوں'' مترنم قہقہہ ہوا میں بکھر کر موتیوں کی شکل میں چٹ چٹ فرش پر گرنے لگا۔

''سالی؟؟؟''

''ارے بھائی ہونے والی۔۔۔ فرحت باجی۔ آپ مجھے اسی نام سے پکار سکتے ہیں'' ایک بار پھر مترنم قہقہے کے ساتھ موتی جیسے ہموار دانت بھی قہقہے کی موسیقی میں رنگ بھرنے لگے۔

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جو کراچی میں مقیم لڑکی کے والدین کی ہدایت پر کی گئی تھی۔ والدین کا خیال تھا کہ بڑی بہن اور بہنوئی لڑکے کو دیکھ لیں اور اپنی رائے دے دیں تو سلسلہ آگے بڑھایا جائے۔ اس ملاقات کے بعد ہمارے دل میں اُسی طرح کی سوچیں سر ابھارنے لگیں جس طرح عام طور پر ایسے مواقعوں پر ہوا کرتا ہے مثلاً یہ کہ کاش ہمارا رشتہ اس گھر میں کچھ برس پہلے کیوں نہ ہو گیا، کاش فرحت باجی شادی سے پہلے کیوں نہ ملیں۔ اب یہاں ہمارے دل نے ہمیں کچوکتے ہوئے کہا کہ باجی بھی کہہ رہے ہو اور عشق کا دم بھی بھر رہے ہو۔ ہم نے دل ہی دل میں **لاحول ولا** کا ورد کرتے ہوئے اپنی ہونے والی شریک حیات کی

بابت سوچنا شروع کر دیا۔ بزرگ کہتے ہیں کہ ہر آنے والی نسل پہلی نسل سے بہتر ہوا کرتی ہے۔ اگر بڑی بہن اتنی شوخ، چنچل اور خود اعتماد ہے تو چھوٹی۔۔۔

تصور کی دنیا سے باہر آنا ہمارے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ لفظ شادی جس قدر آسان ہے اس کے مراحل اُسی قدر دشوار۔ اس کے بارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ''مکان کہتا ہے مجھے ہاتھ لگا کے دیکھ اور شادی کہتی ہے مجھے رچا کے دیکھ'' سو ہم نے امّاں کے آگے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے لڑکی دیکھنے کی شرط واپس لے لی جو امّاں کے لیے حیران کُن تھی۔

''نا بھیا، میں ان چکروں میں نہیں پڑتی، کل کلاں کو تیرا دماغ پھر گیا اور تُو نے لڑکی ناپسند کر دی تو میں مفت میں ماری جاؤں گی۔''

''امّاں آپ بالکل بےفکر ہو جائیں میں جو آپ سے کہہ رہا ہوں یہ بالکل فائنل ہے۔''

''یہ فائنل وائنل کا چکر چھوڑو، خود لڑکی دیکھو، لڑکی والوں کو جانچو، پرکھو پھر رائے دو۔''

''آپ نے دیکھ لیا نا، بس''

''یہ بھی خوب رہی، اب یہ بھی میرے کھاتے میں ڈال دو، صاف کہو نا کہ لڑکی کی بہن پر لٹو ہو گئے ہو!''

''امّاں آپ جو بھی کہیں۔ میری طرف سے فائنل ہے آپ بات آگے بڑھائیں۔''

بس جناب شادی کی تاریخ کے بعد اُس وقت کے ریت رواج کے مطابق بری کے جوڑے سمیت گیارہ جوڑے، گلوبند، جھومر، پونچی اور چاندی کی پازیب کے ساتھ دیگر لوازمات یعنی سامانِ آرائش، سینڈل، موزے، شال، جرسی، چھوہارے وغیرہ سینیوں میں سجا کر مقررہ دن بارات روانہ ہوگئی۔ اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ عفیفہ نگہت افروز ہمارے عقد میں آ گئیں۔

لڑکی والوں کے گھر سے سہاگ رات کے مقررہ وقت تک ہمارے دل میں عجب طرح کا اشتیاق گدگدار ہا تھا۔ جب بھی ہم اپنی منکوحہ کا تصور ذہن میں لاتے تو فرحت باجی کا ہنستا، کھلکھلاتا روشن چہرہ ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ اور ہم فرحت باجی کے پیکر سے مشابہ ایک نیا پیکر تراشنے لگتے۔

یہ کہنا تو حقیقت کی نفی ہوگی کہ نگہت افروز خوبصورت نہ تھیں یا اُن کا شمار کسی طور بدصورت لوگوں میں کیا جاتا مگر اُن کی بڑی ہمشیرہ یعنی فرحت باجی سے تقابل میں نگہت افروز پوری نہ اترتی تھیں۔ فرحت باجی دراز قد اور چھریرے بدن کی مالک تھیں جبکہ نگہت افروز دبتے قد اور صحت مند جسم کے ساتھ گندمی رنگ کی حامل تھیں۔ وقتی طور پر ہمیں یہ تجربہ خوشگوار نہ لگا مگر کسی سے کہنا اپنے احساسات میں شریک کرنا اس لیے ممکن نہ تھا کہ فیصلہ خود ہمارا تھا وگرنہ امّاں نے تو ہمیں ہر بات کا پورا اختیار دیا تھا۔

شادی کی دوسری صبح روایت کے مطابق ناشتہ لڑکی والوں کے گھر سے آتا ہے۔ حسبِ روایت فرحت باجی کے شوہر کے ساتھ چند لڑکیوں کی ٹولی جس کی سربراہی فرحت باجی کر رہی تھیں لذیذ ناشتے، شوخ و چنچل گفتگو اور ذو معنی جملوں کے ساتھ ہمارے کمرے میں داخل ہوئیں۔ پہلا جملہ ہماری طرف اچھالتے ہوئے بولیں:

''کیسے ہیں دولہا بھائی؟''

ہم بےساختہ دونوں ہاتھ جوڑ کر فرحت باجی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''آپ چاہیں تو جان لے لیں مگر یہ دولہا بھائی ہٹا لیں''

''اب خالی دولہا کہنا بھی تو اچھا نہیں لگتا''

''کامران کہہ لیں''

''کامران بھائی چلے گا؟''

''جیسے آپ کی مرضی''

''اور سنائیں، دلہن پسند آئی؟''

''جی'' بادلِ نخواستہ ہمارے منہ سے نکل گیا۔

''یہ بہت بے زبان، صبر اور ہمت والی ہے۔ دیکھ لیجیے گا آپ اور آپ کے گھر والوں کا دل (چٹکی بجاتے ہوئے) یوں جیت لے گی۔''

شادی کے تیسرے، چوتھے یا شاید پانچویں دن فرحت باجی کے شوہر جلیل بھائی نے ہم سے مری جانے کی بابت دریافت کیا کہ وین یا بس کہاں سے ملتی ہے، کس وقت چلتی ہے، کرایہ کیا ہے، سفر کا دورانیہ کتنا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ قریب ہی بیٹھی فرحت باجی کے چہرے کا اشتیاق بتلا رہا تھا کہ وہ بھی مری دیکھنے کا شوق رکھتی ہیں۔ سو ہم نے اپنی روایتی فراخ دلی کے زیرِ اثر کراچی کے مہمانوں کو مری کی سیر کرانے کا ذمہ لے لیا۔ افراد کی گنتی شروع ہوئی تو وہ بیس سے تجاوز کر گئی۔ ہمارے دل میں خیال آیا اگر ہم اپنے سسرال والوں کو لے جائیں گے تو ہمارے گھر والوں نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ منہ دیکھتے رہیں یا ہمارے بارے میں زن مرید کی رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ سو اب گنتی تیس سے تجاوز کر گئی۔ لہٰذا راولپنڈی سے مری جانے والی ایک بس مقررہ روز کے لیے منصور بھائی کے تعاون سے کرائے پر لے لی گئی اور بس کی گنتی پوری کرنے کے لیے چند قریبی احباب کو بھی شاملِ تفریح کر لیا گیا۔

سارے معاملات طے ہونے کے بعد مسئلہ درپیش کھانے کا تھا۔ ایک تجویز یہ آئی کہ کھانا مری کے کسی ہوٹل میں کھایا جائے۔ مخالفت میں آنے والی رائے نے اس لیے سب کو قائل کر لیا کہ وہ تفریح، تفریح کیا ہوئی جب کھانا پینا ساتھ نہ ہو۔ دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ بریانی کی دیگ پکوا کر بس کی چھت پر رکھ لی جائے اور مری جا کر اُس سے لطف اندوز ہوا جائے۔ مخالف رائے اس لیے وزن کی حامل ٹھہری کہ مری پہنچ کر دیگ وہ بھی چاول کی گرم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔ اسی طرح کئی لوگوں نے اپنی اپنی آراء پیش کیں مگر کسی نہ کسی جواز کے سبب

قابل قبول نہ ٹھہریں۔ تمام تر گفتگو کے دوران فرحت باجی کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی سامنے والوں کو اشتیاق سے دیکھتی رہیں۔ جب کوئی رائے قابل قبول نہ ٹھہری تو وہ اپنے مخصوص انداز میں سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے جسے عرفِ عام میں خم ٹھوک کر کہا جاتا ہے میدان میں اتریں اور بآوازِ بلند اعلان کر ڈالا کہ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں کھانے کا ذمہ میرا۔

طے شدہ دن اور وقت کے مطابق تمام لوگ مقررہ جگہ پر اکٹھے ہو گئے اور باری باری سب نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ سب سے آخر میں فرحت باجی سفید شلوار پر ہلکے گلابی رنگ کی پھولدار قمیض اور آتشی گلابی رنگ کا دوپٹہ پہنے نمودار ہوئیں تو اُن کے پیچھے دو مزدور نما لڑکے جن میں سے ایک کے سر پہ بڑا سا گٹھڑ اور دوسرے کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے تھیلے تھے۔ کافی پیچ پیچ، زور دھکے اور کئی لوگوں کی مدد کے ساتھ لڑکے کے سر سے گٹھڑ اُتار کر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ رکھ دیا گیا اور اُس کے ساتھ والی سیٹ کے آگے دوسرے لڑکے کے ہاتھ سے دونوں تھیلے لے کر رکھ دیئے گئے۔ جوں ہی ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کی ’’ایک منٹ ایک منٹ‘‘ کہہ کر فرحت باجی نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا اور دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔ چند ساعت کے بعد وہ لڑکے لوٹے تو دونوں کے ہاتھ میں پانی کا ایک ایک کولر تھا۔

بس چلنے کے فوری بعد تمام بالغ افراد کو ایک ایک اور بچوں کو نصف نصف اُلٹی اور چکر سے محفوظ رہنے کی گولی آدھا گلاس پانی کے ساتھ کھلا دی گئی۔ اُس کے کچھ دیر بعد تھیلوں کے اندر سے جوس کی ایک ایک بوتل، چپس، بسکٹ تقسیم کر دیے گئے۔ قریب ایک گھنٹے بعد فرحت باجی پھر فرنٹ سیٹ پر رکھے تھیلوں سے چاکلیٹ، سپاری اور پان نکال کر لائیں جو بچوں اور بڑوں میں حسبِ خواہش تقسیم کر دیئے گئے۔

بلاشبہ یہ قافلہ مری کی سیر کے لیے نکلا تھا مگر ہم نے سوچا اگر اس تفریح میں مری کے ساتھ ایوبیہ بھی شامل کر لی جائے تو یہ تفریح یادگار ہو سکتی ہے۔ سو ہمارا پہلا پڑاؤ مری کے بجائے ایوبیہ میں ہوا۔ جہاں کی خنکی نے سب لوگوں کو اپنے ساتھ لائے گرم کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا۔ سرد موسم میں چائے کی طلب فطری بات تھی سو ہم نے سوچا کہ پورے قافلے کی گرم گرم چائے سے تواضع کی جائے۔ لہٰذا سامنے موجود ہوٹل کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے جب ہم ہوٹل کے اندر پہنچے تو وہاں پہلے سے موجود فرحت باجی ہمیں دیکھ کر گویا ہوئیں ’’چائے پینے آئے ہیں‘‘ ہم نے جواب میں کہا ’’پینے نہیں پلانے‘‘۔ فرحت باجی نے مخصوص قہقہے کو ہوا میں بکھیرتے ہوئے کہا ’’اُس کا آرڈر تو میں دے چکی ہوں‘‘۔ خفت مٹاتے ہوئے ہم نے کہا ’’میزبان تو ہم ہیں‘‘ فرحت باجی نے ہماری بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا ’’بے شک، میزبان آپ ہیں اور تواضع میرے ذمے‘‘ چاروناچار ہم خاموش ہو کر لوٹ آئے۔ ہر طرف رنگ برنگے غباروں کے بورڈ اور بندوق اٹھائے غریب لڑکے نشانہ بازی کی ترغیب دے رہے تھے۔ بہت سے ہمراہیوں کی پیروی میں ہم نے بھی زندگی میں پہلی بار نشانہ لگانے کی مشق شروع کر دی۔

پے در پے کئی نشانے لگانے کے بعد ہر نشانہ خطا گیا تو پیچھے سے فرحت باجی کی کھنک دار آواز آئی ’’ثابت ہو گیا کہ آپ اس معاملے میں بالکل کورے ہیں‘‘ ہم نے مڑ کر دیکھا تو فرحت باجی کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا تھا جس میں سے وہ مٹھیاں بھر بھر کے سب لوگوں کو مونگ پھلیاں دے رہی تھیں۔ جس وقت ہماری باری آئی تو تھیلا خالی ہو چکا تھا۔ آخری مونگ پھلی فرحت باجی اپنے دانتوں سے چٹخاتے ہوئے بولیں ’’آپ کو نہیں ملیں‘‘ ہم نے نفی میں سر ہلایا تو بے ساختہ وہی مونگ پھلی جو فرحت باجی اپنے دانتوں سے چٹخا رہی تھیں ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم نے بھی فوری طور پر اُس مونگ پھلی کو دانتوں میں دبا کر توڑ لیا۔ ہمارے اس عمل پر فرحت باجی کے چہرے پر حیا کی لالی آ گئی اور وہ شرماتی ہوئی دوسری جانب چل پڑیں۔

اس تمام سفر کے دوران احباب کی نظریں اور اشتیاق اُس گٹھڑ پر مرکوز رہا جو فرنٹ سیٹ کے ساتھ دائیں بائیں ڈولتا اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ جوں ہی اس خوشگوار سفر کا دوسرا پڑاؤ مری کے نزدیک سنی بنک پر ہوا تو سب سے پہلے بس سے اُتر کر فرحت باجی کے شوہر جلیل بھائی نے بس کے سامنے موجود ہوٹل پر جا کر ہاتھ کی انگلیوں پہ افراد شمار کرتے ہوئے سبز قہوے کا آرڈر دیا اُس کے بعد بس میں واپس آ کر یاور صاحب اور یحییٰ صاحب کی مدد سے گٹھڑ کھول کر فی کس ایک ایک لنچ بکس تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ جوں ہی ایک لنچ بکس ہماری طرف بڑھایا تو ہم نے کہا کہ ’’آپ نے ناحق اتنا تکلف کیا‘‘۔ فرحت باجی نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا ’’آپ نے بھی تو میرے لیے یعنی ہم سب کے لیے کتنا اہتمام کیا ہے‘‘۔

گتے کے لنچ بکس کے اندر شیرمال، فرائی قیمے کا پیکٹ، فرائی آلو کا پیکٹ، کیلا، سیب، بالوشاہی کے بعد سبز قہوہ نے سب لوگوں کو چھکا دیا۔

فرحت باجی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے۔ من موہنی صورت اور خاموش طبع نگہت افروز نے ہمارے گھر کے اُن افراد کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا جو ہماری اور نگہت افروز کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس رشتے کے حق میں نہ تھے۔ نگہت افروز کو اللہ نے اُن خوبیوں سے بھی نوازا تھا جو عام خواتین کے حصے میں کم کم آتی ہیں یا بالکل نہیں آتیں۔ لگتا تھا زبان تو منہ میں ہے ہی نہیں۔ کسی کے خلاف بولنا یا کسی کی عیب جوئی کرنا کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ اگر کوئی شخص اُن میں کوئی خامی نکالتا یا اُن کی کسی غلطی کی نشاندہی کرتا تو وہ بُرا ماننے یا جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کرتیں۔

ہم جیسے مجلسی آدمی جس کو ہاؤ ہو، شور شرابا، کھیلنا کودنا، کھانا پینا مرغوب تھا کی زندگی کو نگہت افروز نے معمولات کی ایسی لڑی میں پرو دیا کہ کبھی کبھی ہمیں خود پر حیرت ہوتی کہ ہم جیسا لاابالی شخص صبح اُٹھنا، واک پر جانا، وقت پر ناشتہ

کرنا، وقت پر دفتر جانا، وقت پر گھر لوٹنا اور فضولیات سے پرہیز کرنا کس طرح اپنا سکتا ہے۔

شادی کے چند سال بعد نگہت افروز کی تیسری بہن نسیم افروز کی شادی میں کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو مسئلہ درپیش یہ تھا کہ قیام کہاں کیا جائے۔ ہماری رائے ہوٹل کے حق میں جبکہ نگہت افروز کی رائے اپنے والدین کے گھر قیام کی تھی۔ بحث وتمحیث کے بعد طے یہ پایا کہ کراچی جا کر جیسی صورتحال درپیش ہوئی فیصلہ اُس کے مطابق کیا جائے گا۔ جونہی ہم لوگ کراچی سٹیشن سے باہر نکلے تو فرحت باجی اور اُن کے شوہر جلیل بھائی آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ملے۔ ہم نے رسماً کہا:

''آپ نے کیوں تکلیف کی''

فرحت باجی کے شوہر جلیل بھائی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا ہی چاہتے تھے کہ فرحت باجی نے نہایت بے باکی سے کہا:

''جناب! سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے''

اُن کے جملے پر ہماری رگِ ظرافت بہت گدگدائی۔ کئی جملے زبان پر آنے کے لیے مچلے بھی مگر وقت کی نزاکت کے تحت ہم نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

گھر پہنچ کر پہلے تو ہمارے تازہ دم ہونے کا اہتمام کیا گیا۔ اُس کے بعد ہمارا کمرہ دکھاتے ہوئے فرحت باجی بولیں ''یہ ہے آپ کا کمرہ، یاد رکھیے، اب آپ ہمارے بس میں ہیں، کھانا پینا، سونا جاگنا، آنا جانا، سب ہماری مرضی سے ہوگا۔ یوں سمجھ لیجیے یہاں آپ کی لگام نگہت کے نہیں میرے ہاتھ میں ہے''

''بھئی فرحت اتنا طویل سفر کر کے آئیں ہیں کھانے پینے کے بجائے آپ نے تو احکامات جاری کرنا شروع کردئے، کم از کم اتنا خیال کرو کہ یہ مہمان ہیں''

''مہمان، کون مہمان؟ کامران بھائی اور نگہت اپنے ہیں مہمان کیسے آپ دیکھئے میں ان کو کتنا بھگاتی ہوں''۔ دوسری صبح ابھی ہماری آنکھ بھی نہ کھلی تھی کہ فرحت باجی چائے کے دو کپ ہاتھ میں لیے آگئیں ''ارے ابھی تک سو رہے ہیں آپ؟'' ہم نے بیٹھتے ہوئے شرمندگی سے کہا ''جی تھکن زیادہ ہوگئی تھی'' فرحت باجی نے چائے کا ایک کپ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بیڈ ٹی پیجئے ساری تھکن دُور ہو جائے گی'' ہم نے کہا ''میں تو بیڈ ٹی نہیں پیتا'' فرحت باجی نے مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''یہ کراچی ہے اور یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ لہٰذا بیڈ ٹی تو پینی پڑے گی، گیارہ بجے جوس بھی اور شام کی چائے بھی''۔ چائے کا کپ تھامتے ہوئے ہم نے جلیل بھائی کے بارے دریافت کیا تو فرحت باجی بولیں ''ارے اُن کی نہ پوچھو، اچھے خاصے گھامڑ آدمی ہیں۔ لگے ہوں گے اپنی کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں۔''

کراچی میں ایک ہفتے کا قیام کافی تھکا دینے والا تھا۔ مہندی، مایوں، شادی، ولیمہ کے علاوہ سی پی کے لوگوں کے ہاں پہلا جمعہ بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے جسے وہ لوگ ''جمائیگی'' کا نام دیتے ہیں۔ اس دن لڑکے اور لڑکی کے خاندان کے قریبی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں جس میں کھانے کے ساتھ خوش گپیوں کا دور بھی چلتا ہے۔ اسے ایک طرح سے ہاتھ لگائی کی رسم بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے لیے جمائیگی کا یہ پہلا تجربہ خوشگوار رہا۔ شادی، جمائیگی اور عید کے ہنگام کو فرحت باجی نے اس قدر پُر تکلف بنا دیا تھا کہ وہ آج بھی ہماری زندگی کے سنہری ایام میں شامل ہوتا ہے۔

ہم اپنے گھر میں فضول خرچ تصور کیے جاتے ہیں اسی نسبت سے ہم نگہت افروز کے اہلِ خانہ کے لیے جب تحفے تحائف خرید کر لائے تو ہمیں اپنی امّاں کا یہ جملہ آج بھی یاد ہے ''کامران آج دوسری مرتبہ بُری بنا کر لے جا رہا ہے''۔ مگر جب ہم کراچی سے گھر واپس لوٹے تو ہماری امّاں کی آنکھیں نگہت افروز کے گھر والوں کے تحائف کے ساتھ فرحت باجی کے بیش قیمت تحائف دیکھ کر کھلی رہ گئیں مگر اُن کی زبان سے ستائش کا کوئی لفظ ادا نہ ہوا۔ شاید وہ بُری والے جملے پر دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھیں۔

زندگی کا پہیہ سُبک روی سے رواں دواں تھا۔ نگہت افروز نے ہماری زندگی کو اس قدر پُرسکون اور آرام دہ بنا دیا تھا کہ ہم گھر کی چار دیواری میں شہزادہ گلفام بن کر رہ گئے تھے۔ ہماری ہر جا اور بے جا خواہش پر نگہت افروز ایسے بے چین ہو جاتیں جیسے ماں اپنے بچے کے منہ سے نکلی خواہش پر ہو جاتی ہے۔

زندگی نے ہمیں دوبارہ کراچی جانے کی مہلت نہ دی مگر جب جب نگہت افروز کراچی گئیں یا فرحت باجی ہمارے گھر آئیں اُن کی محبت، اپنائیت اور گرمجوشی اُسی طرح برقرار رہی۔ اُن کے ملنے، تواضع کرنے اور تحائف دینے کا انداز بالکل جدا ہوتا۔ وہ تحائف دینے والے کی پسند کے ساتھ اُس کا معیار ہمیشہ پیش نظر رکھتیں۔ پیسہ خرچ کرنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اپنے لیے نہیں اپنوں کے لیے۔ اُنہیں کھانے سے زیادہ کھلانے اور لینے کے بجائے دینے میں لطف آتا تھا۔ یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ تین دہائیوں تک اُسی گرمجوشی، اپنائیت اور محبت سے جاری رہا۔

چند برس بعد قضائے الٰہی سے جلیل بھائی ایک حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو فرحت باجی کے قہقہے اور من موہنی مسکان ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ مُسکراتی وہ اس کے بعد بھی تھیں مگر اُس کے اندر خوشی کے بجائے افسردگی کا پہلو نمایاں ہوتا۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ جلیل بھائی کے جانے کے بعد چند برس ہی گزرے ہوں گے کہ نگہت افروز کینسر جیسے موذی مرض کے ہاتھوں تین مہینوں کے اندر چٹ پٹ ہو کر رہ گئیں۔ یہ حادثہ ہمارے لیے کسی سانحہ سے کم نہ تھا مگر ہمارے عزیز و اقارب، دوست احباب، محلے دار اور پڑوسیوں نے جس طرح ہماری غم گساری کی اُس نے ہمیں زندگی سے دوبارہ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا۔

پہلے شریک حیات اور پھر سگی بہن کی وفات نے فرحت باجی کو

نڈھال کر دیا مگر وہ اپنا غم بھول کر ہماری اور ہمارے بچوں کی دلجوئی میں اس طرح مصروف ہو گئیں کہ یہ غم ہمارا نہیں صرف اُن کا ہو گیا۔ پہلے مہینوں بعد اگر بات ہوتی تھی تو اب ہفتوں بعد ہونے لگی۔ اس سے قبل سال، دو سال بعد کوئی عزیز وا قارب، رشتے دار کراچی سے آتا تو فرحت باجی اُس کے ہمراہ کسی نہ کسی قسم کے تحائف ارسال کرتی تھیں۔ اب اُنہوں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ ماہ، دو ماہ، تین ماہ کے اندر کچھ نہ کچھ تحائف اور کھانے پینے کا سامان لازمی بھیجا کرتیں۔ جب ہم فون پر اُن سے گِلہ کرتے تو وہ ہمارے گلے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہتیں ’’آپ کو اچھے لگے کہ نہیں‘‘ ظاہر ہے ہمارا جواب اثبات میں ہوتا جسے سُن کر وہ خوش ہو جاتیں اور جواباً کہتیں ’’کہ یہ آپ کی خوشی کے لیے نہیں میں نے اپنی خوشی کے لیے بھیجا ہے۔‘‘ اس کے بعد ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ بچتا کیونکہ لفظ ’’شکریہ‘‘ سے فرحت باجی کو سخت چڑ تھی۔

رات بھر سخت دُکھ، پریشانی اور رنج میں گزارنے کے بعد ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم آزمائش کی اس گھڑی میں فرحت باجی کے لیے کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ کر اُن کے حق میں اپنے رب سے دعا پر اکتفا کرتے کہ وہ اُن کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ مگر دل کو کسی طور قرار نہ آتا تھا کہ ہم عملی آدمی ہیں۔ جب بھی ہمارا کوئی عزیز وا قارب کسی دُکھ یا تکلیف سے دوچار ہوا تو ہم دامے، درمے، سخنے حاضر ہو گئے۔ اُس شخص کے لیے نہیں جو مشکل میں گرفتار ہوا بلکہ اپنے قلبی اطمینان کے لیے کہ ہم زبانی جمع خرچ کے بجائے عملی طور پر اپنے عزیز کے دُکھ میں شامل ہوئے۔

دوسرا دن اور رات بھی اسی کرب میں گزرے کہ کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ ہم عملی طور پر فرحت باجی کے دکھ میں شریک ہو جائیں۔ خدا کے کاموں میں کوئی دخل دے سکتا ہے اور نہ دینا چاہیے مگر خدا کی دی ہوئی توفیقات کو اُس کے بندوں کے حق میں استعمال کرنا ہر انسان کا فرض بھی ہے اور قرض بھی۔ صبح صادق کے وقت ہم نے اپنے خدا سے لَو لگائی اور اُس سے صرف اتنا مانگا کہ اے میرے مالک و خالق مجھے کوئی ایسی تدبیر سُجھا کہ میں فرحت باجی کے دکھ میں عملی طور پر شریک ہو جاؤں، آزمائش کی گھڑی میں اُن کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں جس سے میرے قلب کو اطمینان نصیب ہو۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے ہماری آنکھ لگ گئی اور جب آنکھ کھلی تو قدرت کی جانب سے ہمارے دل اور دماغ میں روشنی کی کرن پھوٹ چکی تھی۔

بستر چھوڑتے ہی ہم نے فرحت باجی کو فون ملایا۔ بجائے اس کے ہم اُن کی بیماری کا ذکر کرتے اُن کی صحت کا احوال دریافت کرتے، اور حسبِ روایت کچھ احتیاط بتلاتے ہم نے بے ساختہ کہا ’’بھئی آج ہم نے فون آپ کو اس لیے کیا ہے کہ آپ سے معافی مانگنی ہے۔‘‘

’’معافی، کس بات کی؟‘‘

’’دیکھیئے نا، رشتے میں آپ بڑی سہی، عمر میں تو ہم سے چھوٹی ہیں اور پھر آپ جیسی خوبصورت، شوخ، چنچل لڑکی کو باجی کہنا جچتا نہیں، لہٰذا آج سے ہم آپ کو باجی نہیں صرف فرحت کہہ کر پکاریں گے۔‘‘ ہر چند پہلی سی توانائی نہ تھی مگر فرحت باجی نے جواب میں وہی روایتی قہقہہ لگا کر کہا:

’’جیسے آپ کی مرضی‘‘

اب یہ معمول بن گیا کہ ہم روزانہ یا ایک دن چھوڑ کر فرحت باجی کو فون کرتے اور اُن کی شخصیت، برتاؤ اور ہنسی کا ذکر ضرور کرتے۔ نا صرف ذکر کرتے بلکہ فرمائش کر کے اُن سے ہنسی اور قہقہہ سُنا کرتے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے پرانے قصّے، اُن کی شخصیت اور اُن کی تواضع کی تعریف کرتے تو اُن کا قہقہہ نسبتاً صحت مند ہو جاتا اور وہ دریافت کرتیں ’’آپ کو ابھی بھی یاد ہے‘‘ جواب میں جب ہم کہتے ’’ہمیں تو سب کچھ یاد ہے‘‘ تو وہ پھر زور سے ہنستیں اور قہقہہ لگا کر درمیان میں اکثر کامران بھائی کے بجائے ’’کامران‘‘ کہہ کر مخاطب کرتیں۔

جب فرحت باجی کو زندگی کے مختصر ایام کا اندازہ ہو چکا تو اُنہوں نے دیارِ حبیبؐ جانے کی فرمائش کی جسے اُن کے بیٹوں نے بخوشی پورا کیا۔ اس سارے عرصے میں نہ ہم نے کبھی اُن کی بیماری کا ذکر کیا نہ اُنہوں نے کبھی اپنی تکلیف ہم پر ظاہر کی۔ ٹیلی فون کا سلسلہ دیارِ حبیبؐ میں بھی جاری رہا۔ وہ اکثر کہتیں ’’کامران، آپ کیوں اتنا خرچ کرتے ہو‘‘ ہم جواب میں کہتے ’’آپ کی ہنسی سُننے کے لیے‘‘ اب ہم سالی بہنوئی کے بجائے اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھے کامران اور میں اُنہیں فرحت کہہ کر بُلاتا تھا۔ اور جب میں اُن سے ہنسی کی فرمائش کرتا تو وہ کہتیں ’’آپ جب مجھ سے ہنسنے کی فرمائش کرتے ہو تو میرے جسم میں توانائی دوڑ جاتی ہے۔ میں خود کو پہلے کی طرح صحت مند اور توانا محسوس کرنے لگتی ہوں۔‘‘

ایک دن ہم نے فون پر گفتگو کے دوران دریافت کیا کہ آپ کی پسند کی کوئی چیز بھیجوں۔ جواب میں فرحت باجی بولیں ’’ارے نہیں، اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘ ہم نے کہا ’’چلیں کراچی بھیج دیتا ہوں جب آپ آئیں گی تو آپ کو بیڈ کے ساتھ رکھا ہوا ملے گا آپ کا تحفہ‘‘ خوشی کے مارے وہی کھنکناتی ہنسی کے بعد بولیں ’’آپ بھی تو اپنی پسند بتائیں‘‘ کچھ دیر سوچنے کے بعد ہم نے کہا کہ ’’میں آپ کو اپنی پسند کا تحفہ بھیجوں گا اور آپ اپنی پسند کا بھیجیئے‘‘ جواب میں مخصوص ہنسی کے ساتھ ’’اچھا‘‘ کہہ کر فرحت باجی نے فون بند کر دیا۔

ہم نے اپنی پسند کے مطابق فرحت باجی کے لیے کچھ تحائف بھیج کر یہ سوچا کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے مگر فرحت باجی نے اُس وقت ہمیں شرمندگی سے دوچار کر دیا جب ہمارے علاوہ گھر کے ہر فرد کے لیے منفرد اور بیش قیمت تحائف ارسال کیے۔ فون پر ہم نے گلہ کرنا چاہا تو جواب میں بولیں ’’ہنسی نہیں سُنیں گے آج‘‘

فرحت باجی کے بیش قیمت تحائف کے بارے سے ہم اتنے شرمندہ ہوئے کہ فرحت باجی کی یاددہانی کے باوجود اُن سے ہنسی سننے کی فرمائش نہ کر سکے۔

باقی صفحہ ۷۸ پر ملاحظہ کیجیے

''قاتل مسیحا''

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

اثر چارہ گری کا ہو نہ جائے
ترا بیمار اچھا ہو نہ جائے

پکڑ کر ہاتھ میرا چلنے والا
ہتھیلی کا پھپھولا ہو نہ جائے

مبادا اس کے ہاتھوں سے شفا ہو
مرا قاتل مسیحا ہو نہ جائے

گناہوں کے کہیں کاغذ نہ کھولے
مرا ہمدم فرشتہ ہو نہ جائے

نکل آئیں نہ اس کے پر بھی اک دن
یہ دل آخر پرندہ ہو نہ جائے

دھواں چاروں طرف چھانے لگا ہے
چڑھے دن میں اندھیرا ہو نہ جائے

اُسے میں اجنبی سمجھوں تو ثاقبؔ
کہیں پھر دیکھا بھالا ہو نہ جائے

○

عبداللہ جاوید

(کینیڈا)

لفظ تھے ماورا بیاں سے بھی
حرف آگے گئے نشاں سے بھی

ہجرتیں ختم ہی نہیں ہو تیں
کوچ کر جائیں گے یہاں سے بھی

کچھ مصائب زمیں سے اگتے ہیں
کچھ برستے ہیں آسماں سے بھی

تیر کھانے پر ہی نہیں موقوف
لوگ مر جاتے ہیں کماں سے بھی

دل ہوا ہے دھواں دھواں کب کا
اب اٹھا چاہتا ہے جاں سے بھی

جانتا ہے وہ بے کہے سب کچھ
پھر بھی کچھ بولئے زباں سے بھی

○

غالب عرفان
(کراچی)

پہلے نقطہ پھر خط لا انتہا بنتا گیا
رفتہ رفتہ رابطے کا سلسلہ بنتا گیا

میری صورت آئینہ خانے سے نامانوس تھی
آئینہ در آئینہ چہرہ نیا بنتا گیا

فاصلہ سمٹا تو قربت پر عیاں جو کچھ ہوا
وہ مری فکر و نظر کا زاویہ بنتا گیا

میں مسیحا تھا نہ کوئی، پھر بھی میرے خون پر
ہاتھ پھیلے اور میں حرفِ دعا بنتا گیا

رنگ سی خوشبو ہوا میں منتشر ہوتی گئی
درد مہکا اور کربِ ماورا بنتا گیا

روشنی، سایہ، سفر، تنہائیاں اور حوصلے
دشتِ عرفانِ خودی میں راستہ بنتا گیا

❍

ولی عالم شاہین
(امریکہ)

نہ جانے دھیان ہے کس کا کہ ہم لگے ہوئے ہیں
حرم سے کتنے ہی بیت الصنم لگے ہوئے ہیں

ہو ابتدا تو کہاں سے، رہے تو شامل کون
اسی فسانے میں ہم بیش و کم لگے ہوئے ہیں

عجب نہیں جو کہیں اصلیت بدل جائے
بدن کی شاخ میں کیا کیا قلم لگے ہوئے ہیں

کہاں کا گھر کہ اب اپنا پتا نہیں معلوم
لگن سراب کی ہے اور قدم لگے ہوئے ہیں

سرور ہے نہ ہوا میں نہ شور چڑیوں کا
پھل اب کی بار درختوں میں کم لگے ہوئے ہیں

خلل تو گردشِ خوں میں ہے ایک مدت سے
مَرَض ہیں اور کئی، اور غم لگے ہوئے ہیں

چمن ہے گھر میں، شگفتہ ہیں پھول باہر بھی
عجیب شغل میں شاہیںؔ ہم لگے ہوئے ہیں

❍

محمود شام
(کراچی)

حرم و دیر کے حصار میں ہوں
میں کہاں اپنے اختیار میں ہوں

ہوں خزاں کے خمار کا عادی
خوار میخانہ بہار میں ہوں

ایک دلدادہء شعو ر و خرد
آج کل میں کہاں شمار میں ہوں

سوچ جن کی ازل سے تا بہ ابد
نکتہ دانوں کی اس قطار میں ہوں

ہر گھڑی خوف ہے بچھڑنے کا
جیسے کونجوں کی ایک ڈار میں ہوں

زندگی ٹی دی سیریل کی طرح
میں کہ ہر ایک اشتہار میں ہوں

ہر چورنگی پہ عاشقوں کے ہجوم
کس پری چہرہ کے دیار میں ہوں

گر رہے ہیں انا کے ریت محل
میں بھی ذرہ سا اس غبار میں ہوں

آنکھ سے لب لبوں سے حجلہ ء دل
عزتی کے اسی شعار میں ہوں

○

عرش صہبائی
(جموں،کشمیر)

میں بڑی معتبر کہانی ہوں
صورتِ رُوح غیر فانی ہوں

دو دلوں کو میں لاتا ہوں نزدیک
میں محبت ہوں جاودانی ہوں

جس کی پہچان تھی خلوص و وفا
میں اُسی دَور کی نشانی ہوں

گاہے چُپ ہوں میں صورتِ ساحل
گاہے طوفان کی روانی ہوں

کیسے ماحول سے ہُوں وابستہ
زندہ رہ کر بھی آنجہانی ہوں

جب سے کچھ ربط ہے سیاست سے
کتنے ہی مسئلوں کا بانی ہوں

دُھوپ پڑتے ہی سُوکھ جاؤں گا
مَیں کہ رستے میں بکھرا پانی ہوں

جب سے حاصل کسی کی قربت ہے
سر بہ سر شام اک سُہانی ہوں

عرشؔ دونوں میں ربط ہے گہرا
وہ ہے مطلع میں مطلع ثانی ہوں

○

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں،کشمیر)

گِراں ہے ذہن پہ گویا جو بار سا کیا ہے
کئی دنوں سے یہ سر پر سوار سا کیا ہے

کبھی ہم اپنی ہی سنتے تھے اپنی کرتے تھے
ہر بات بات پر اب انکسار سا کیا ہے

زمانے بھر سے تو بھاگے ہوئے ہیں ہم بے شک
خود اپنی ذات سے لیکن فرار سا کیا ہے

کھُلا ہُوا ہے وہ موسم نہ وہ کھِلی ہوئی دُھوپ
یہ آج شہر میں ہر سُو غبار سا کیا ہے

پڑا ہے جسم کہیں دل کہیں ہے ذہن کہیں
یہ زندگی ترے گھر میں کھلار سا کیا ہے

شکستہ کشتی ہے دریا بھی ہے تلاطم خیز
یہ پار اُترنے کا پھر اعتبار سا کیا ہے

ہمارا کیوں نہیں ہموار راستوں کا سفر
چڑھاؤ سا ہے یہ کیا یہ اُتار سا کیا ہے

خیر تو یہ ہے کہ رستے تمام ہیں مسدود
گمان و وہم یہ کچھ رہگذار سا کیا ہے

وہ روشنی کے جزیرے کہاں گئے بیتابؔ
چہار سمت یہ تاریک غار سا کیا ہے

○

نسیمِ سحر (راولپنڈی)
(نذیر احمد فراز)

شہر میں بھڑکی ہوئی آگ بُجھاتے جاتے
چاہے اِس سعی میں ہم ہاتھ جلاتے جاتے

گھر سے رخصت جو ہوئے تھے تو یہ کرتے احساں
اِن منڈیروں سے پرندے بھی اُڑاتے جاتے

دیکھ کر دل کے خرابے کو خیال آتا ہے
اِس کھنڈر پر جو نیا شہر بساتے جاتے !

سنگِ تعبیر سے ٹکرا لیا سر آخرِ کار
خود کو کب تک وہی اِک خواب دِکھاتے جاتے

اب تو محشر میں بھی ملنے کی نہیں ہے اُمّید
''سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے''

وہ تو کچھ اپنے جنوں پر ہی تھا قابو، ورنہ
شہر بھر کو تری تصویر دِکھاتے جاتے

ہمسفر چھاؤں میں تھے مجھ سے جو آگے، ان کا
بس نہ چلتا تھا کہ سب پیڑ گراتے جاتے

لے گئے نام کی تختی بھی جو دروازے سے
اِس جگہ وہ کوئی کتبہ ہی لگاتے جاتے

عین ممکن ہے کہ پیکر ذرا اچھا بنتا
اَور کچھ دیر اگر چاک گھُماتے جاتے

تیرگی میں بھی اُترتے ہوئے خواہش تھی یہی
لَو چراغوں کی ذرا اَور بڑھاتے جاتے

روشنی مانگ کے ہم کاش ستاروں سے نسیمؔ
اپنے اندر کی یہ تاریکی مٹاتے جاتے

○

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

جونہی اک آگ سی روشن ہوئی پڑاؤ کے ساتھ
مری کہانی بھی لو دے اُٹھی الاؤ کے ساتھ

نشے میں جھومتے دریا! تجھے خبر بھی ہے
کہ کتنے شہر تھے جو کٹ گئے کٹاؤ کے ساتھ

کبھی نہ آئے میرے نخلِ اختیار پہ پھول
سو کارِ حرف کیا عمر بھر دباؤ کے ساتھ

اے شہرِ چارہ گراں! دردمند ہیں ترے لوگ
کہ جی رہے ہیں سبھی اپنے اپنے گھاؤ کے ساتھ

ہماری آنکھوں کو حیرت سے تک رہے تھے لوگ
کہ دنیا گھوم کے آئے تھے ہم بھی ناؤ کے ساتھ

خلاء کے بحر میں بیڑے ہیں کہکشاؤں کے
رواں دواں ہیں کہیں ہم بھی اس بہاؤ کے ساتھ

نظر شناس! کبھی تُو نے یہ بھی دیکھا ہے
میں تجھ کو تکتا ہوں کیوں اس قدر لگاؤ کے ساتھ

وہ کل ملا تھا سرِ راہ ایک عمر کے بعد
مگر ملا کسی انجانے رکھ رکھاؤ کے ساتھ

جوازؔ جعفری ہم کس نگر میں آ پہنچے
ہر ایک آنکھ ہمیں دیکھتی ہے تاؤ کے ساتھ

○

اشرف جاوید

(لاہور)

انا کو طرّہَ دستار کرنے والا ہے
وہ اُس کے حکم کا انکار کرنے والا ہے

کوئی دنوں میں نکالے گا اپنے پَر پُرزے
پرندہ، سانپ سے پیکار کرنے والا ہے

اُٹھائے گا اُسی ملبے سے پھر عمارتِ نو
ابھی بنا ہُوا مسمار کرنے والا ہے

رُلائے رکھتا ہے سب کو ہنسی خوشی میں بھی
نشاطِ قلب کو آزار کرنے والا ہے

بلا کا شور اُٹھا دفعتاً کنارے پر
وہ اپنے بل پہ ندی پار کرنے والا ہے

کہانی لے کے چلے گا اب اپنی مرضی سے
کہانی کار بھی کردار کرنے والا ہے

اُسی کو رستہ بنا کے گزرتی ہے خلقت
وہ دَر کو راہ کی دیوار کرنے والا ہے

اُسی نے کھینچ کے مارا ہے پہلا پتھر بھی
وہی شجر کو ثمر بار کرنے والا ہے

اُسی کو زیب ہیں منصوبہ سازیاں ساری
اُسی کا دستِ ہُنر کار کرنے والا ہے

○

دو گز زمین بھی۔۔۔

(نیڈین گورڈیمر)

ترجمہ: ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

۱۹۹۴ء سے پہلے تک جنوبی افریقہ کی سفید فام نو آبادی میں نسلی تعصب کا جو انسانیت سوز، شرمناک اور ظالمانہ نظام قائم تھا اسکی مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔ سیاہ فام آبادی کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا وہ چند زندہ ضمیر لوگوں کے لئے نہایت تکلیف دہ تھا۔ نیڈین گورڈیمر (۱۹۲۳۔۲۰۱۴) ایسی ہی حساس قلم کار تھی اگرچہ وہ سفید فام اور طبقہء اشرافیہ کا حصہ تھی مگر اس نے اس ظلم کو اپنی تحریروں میں اجاگر کیا۔ اسے کئی دفعہ حکومت کی طرف سے تکلیفیں بھی جھیلنی پڑیں مگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔ اس نے نہ صرف قلم سے بلکہ عملی طور پر بھی اس تعصب کے خلاف جدو جہد کی۔ اسے ۱۹۹۱ کا ادبی نوبل انعام ملا۔ یہاں اس کی ایک بیحد متاثر کن کہانی پیش کی جا رہی ہے۔

☆

ہم کسی طرح بھی کاشت کار نہیں کہے جا سکتے۔ ہم نے تو شہر میں آنکھ کھولی تھی وہیں پلے بڑھے تھے اور اب کئی سال سے جوہانس برگ جیسے بڑے شہر میں رہ رہے تھے۔ میں ایک بڑی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور میری بیوی ''لیریش'' اداکار بننے کا خواب پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ویسے بھی بہت ہی جذباتی اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے شخصیت تھی۔ پھر نہ جانے کیا اور کیوں ہوا کہ اسے خیال آیا کہ ہم اس تیز رفتار شہر، اس ہنگامہ خیزی سے دور دیہاتی علاقے میں ایک فارم خرید لیں۔ یہ فارم شہر سے دور بھی نہ تھا۔ میں ہفتہ شہر میں گذارتا تھا اور ہفتے کے آخیر میں گھر چلا جاتا تھا۔ مجھ پر کچھ غیر یقینی کیفیت تھی کہ وہاں کیسے دل لگے گا مگر جب میں صبح اٹھتا تو تازہ ہوا، مٹی کی خوشبو اور ہمارے فارم پر پلنے والے جانوروں کی رنگا رنگ آوازیں مجھے ایک تازگی اور لذت سے ہم کنار کرتیں۔ ہمارے ملک کے مروجہ نظام کے تحت ہر کام کے لئے سیاہ فام ملازموں کی فوج تھی جو کھیت، فارمز اور جانوروں کی دیکھ بھال اور صفائی کرتے تھے۔ یہاں ایک گونہ اطمنان اور تحفظ کا احساس تھا اس لئے کہ جوہانس برگ میں جب سفید فام پریشانی اور اندرونی فکر کا ذکر کرتے ہیں تو انکا اشارہ شہری زندگی کی عام کشیدگی نہیں ہوتی تھی بلکہ سفید فام آبادی کا وہ خوف تھا جو انہیں سیاہ فام لوگوں سے تھا جس کی وجہ سے ہر شخص تکئے کے نیچے بندوق رکھتا ہے، شہر جاتے ہوئے بغل میں پستول ہوتی ہے اور کھڑکیوں پر فولادی جالیاں اور ہر دروازے پر تالے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سب کچھ نہ تھا کیونکہ شہر کی سیاہ فام آبادی میں جو خودسری آ رہی تھی وہ دیہات میں مفقود تھی اور یہاں نیگرو ملازم اپنے سفید مالک کے سامنے آتے ہی کپکپانے لگتے تھے۔ وہ اپنے سفید مالکان کے بڑے شکر گذار تھے کہ ان کی وجہ سے انکا رزق چلتا تھا حالانکہ انکو اس قدر کم تنخواہ ملتی تھی کہ شاید وہ بمشکل جانوروں کی طرح اپنا پیٹ ہی بھر سکتے تھے۔ ہم بہت امن وچین سے تھے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے نیگرو ملازم بھی اس لحاظ سے مزے میں تھے کہ انہیں پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ شہر میں پولیس ایسی آبادیوں پر بار بار چھاپے مارتی تھی اور ان میں دہشت پھیلاتی تھی۔ ہمارے ملازم اپنی جھگیوں میں بڑی حد تک آزاد تھے۔ وہ وہاں اپنی دیسی شراب کشید کرتے تھے، رات گئے موسیقی سنتے تھے اور بڑی بات یہ کہ میری بیوی انکے بچوں کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھی مگر پھر بھی ان لوگوں کی بیماریوں میں چٹ پٹ علاج کر دیا کرتی تھی۔ خود تو ماں نہیں بن سکی تھی مگر انکی عورتوں کو بچوں کے سلسلے میں ہر قسم کے مشورے دیتی تھی۔ وہ بالکل ڈاکٹروں کی طرح صبح صبح انکی جھگیوں کا ایسا ہی دورا کرتی تھی جیسے ڈاکٹر اپنا راوئنڈ کر رہے ہوں۔

ایک رات کم عمر نیگر ملازم البرٹ نے کوئی ایک بجے ہماری خواب گاہ کی کھڑکی پر دستک دی۔ میں اس رات لیریش سے کچھ ناراض تھا۔ ہم میں کھانے کے بعد کچھ کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ بستر شیئر کر کے اس کو یہ نہیں دکھانا چاہتا تھا کہ میں کم زور پڑ رہا ہوں اس لئے میں اپنی اسٹڈی میں ایک صوفے پر سو رہا تھا۔ وہ اپنی پوری ذمہ داری سے اٹھی جیسے سچ مچ میں کسی رات ڈاکٹر کو اٹھایا جائے۔ اس نے آ کر مجھے بھی اٹھایا۔ کہنے لگی ذرا تم جا کر دیکھو البرٹ کہہ رہا ہے کہ ایک کم عمر ملازم لڑکا سخت بیمار ہے۔ یقیناً بیماری شدید ہوگی ورنہ البرٹ اتنی رات گئے ہمیں نہ جگاتا۔ میں اب بھی نیند میں تھا میں نے غنودگی کے عالم میں پوچھا ''کیا بجا ہوگا؟'' اس نے جھنجلا کر کہا ''اس سے کیا مطلب ہے کہ کیا بجا ہوگا۔۔ تمہیں بہر حال جا کر اسے دیکھنا ہے۔ میں نے شب خوابی کے لباس پر سوئٹر اور پتلون چڑھائی اور بڑی حد تک لڑکھڑاتا ہوا البرٹ کے ساتھ نوکروں کی کھولی کی طرف چلا۔ میں نے چلتے ہوئے پوچھا ''کون'' البرٹ بولا وہ بہت بیمار ہے بہت ہی زیادہ۔۔ ''مگر کون، کیا فرانز؟'' مجھے یاد آیا پچھلے ہفتے فرانز کو سخت کھانسی ہو گئی تھی شاید وہی اب بڑھ گئی ہو۔ اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا بس میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میرے سیدھے ہاتھ میں ٹارچ تھی جسکی روشنی میرے آگے آگے گھاس پر دائرہ بناتی جاتی تھی۔ میں نے اسکی پر اسرار خاموشی پر، ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی، میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت شرمندہ ہے اور کچھ چھپانا چاہ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا میرا اس میں کوئی قصور نہیں مالک، مجھے تو پیٹرس نے آپ کو بلانے بھیجا تھا۔ میں ذرا جھنجلاتا ہوا جھگی کی طرف ہو لیا۔ وہاں ایک لوہے کے بوسیدہ پلنگ پر، جو اپنے چاروں کونوں سے اینٹوں پر کھڑا تھا میں نے دیکھا کہ ایک نو عمر لڑکا پڑا ہے۔۔ نو عمر لڑکا جو کب کا مردہ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر اب بھی ٹھنڈے پسینے کے کچھ قطرے جمع تھے اور اسکا جسم اب بھی گرم تھا۔ باقی ملازم اس کے چاروں طرف گردن لٹکائے سر جھکائے کھڑے تھے۔

میں نے بھی جنگ کے علاوہ کسی مردے کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے عجیب لگا، ایک وحشت سی، اسی کے ساتھ اپنے بیکار ہونے کا احساس، یعنی اب میں کیا کر سکتا ہوں، میں اس نو عمر لڑکے کے، جو اب اس دنیا میں نہیں، کسی کام نہیں آ سکتا۔ ایک نیگرو عورت اس کی پٹی کے پاس کھڑی تھی اس نے اپنا سینا بھینچ تے ہوئے اور سانس کی تکلیف کی اداکاری کرتے ہوئے مجھے اشاروں میں بتایا کہ اسطرح اس کی موت ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یقیناً نمونیا سے مر گیا ہے۔ میرے لئے وہ قطعئی اجنبی تھا، میں نے پیٹرس سے پوچھا یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا تھا۔ پیٹرس ایک کونے میں کچی زمین پر بیٹھا تھا، موم بتی کی ٹمٹماتی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا وہ رو رہا ہے۔ میں اسے لیکر جھونپڑی سے باہر آیا''کون تھا یہ؟'' میں نے پھر پوچھا۔ وہ اب بھی جواب دینے سے کترا رہا تھا۔'' پیٹرس، جلد بتاؤ یہ کون تھا'' میں نے ذرا سختی سے پوچھا وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا''باس۔۔یہ میرا بھائی تھا'' یہ'' روڈھی سیا'' سے یہاں نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔

یہ کہانی ہمارے لئے کوئی بہت زیادہ حیران کن نہ تھی۔ یہ لڑکا پڑوسی ملک سے جو ہانس برگ، کوئی تین سو میل پیدل چل کر آیا تھا۔ راتوں کو جنگل میں آسمان کے نیچے سویا تھا، بارش میں بھیگا تھا اور روکھی سوکھی کھائی تھی۔ پھر اسے پولس کا بھی خوف تھا۔ کھانسی اور بخار میں مبتلا مشکل سے تین دن پہلے اپنے بھائی کی جھونپڑی تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے چھپالیا تھا وہ خوف زدہ تھے کہ کہیں ہمیں اسکی خبر نہ مل جائے کہ یہ سب کچھ جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کے لئے غیر قانونی تھا۔ اس کے باوجود ہر سال کامیابی سے کئی سو نیگرو روڈھی سیا سے ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں جو ہانس برگ آتے تھے اور کہیں نہ کہیں نوکری میں کھپ جاتے تھے۔ پیٹرس کا بھائی ان خوش قسمتوں میں نہ تھا۔

لیریش یہ خبر سن کر بہت جذباتی ہوگئی۔ وہ اس قسم کے مسلے کچلے لوگوں کے لئے نہ صرف بہت ہی دردمند دل رکھتی تھی بلکہ ان کی وکالت کے لئے کھڑی ہو جاتی تھی۔ وہ ایک خاص انداز سے، جیسے میرے سامنے سینہ سپر ہو، کھڑی ہوگئی اور مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھنے لگی۔ رات کے دو بجے میں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا میں نے اتنا ہی کہا کہ ایک غیر متوقع موت پر اب جو مشکل اور پریشان کن فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ تو مجھے ہی بھگتنی پڑینگی۔ لیرش اب بھی مجھے اپنی چمکیلی سبز آنکھوں سے تک رہی تھی وہ نظریں جن میں میرے لئے غصہ تھا۔ اسے شاید میرا یہ جملہ پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا'' یہ تو حقیقت ہے نا کہ وہ اسے ایک چھکڑے میں ڈال کر قریبی کھیت میں تو دفن نہیں کر سکتے۔ مجھے پولس کو اور محکمہ صحت کو اطلاع دینی پڑیگی۔

صبح ہی صبح میں نے اپنی کار نکالی اور شہر کی طرف چلا۔ سرکاری محکموں میں مجھے سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ مجھ سے درجنوں سوال پوچھے گئے کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے۔ کیوں میں اپنے نیگرو ملازمین پر گہری نظر نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ کیا کوئی اور بھی آیا تھا، ایسا ہے تو میں کیوں چھپا رہا ہوں۔ پولس سارجنٹ ایسا ہی تھا جیسا مجھے توقع تھی اسکی گردن اکڑی تھی مگر اسکا بھیجا خالی تھا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے چھٹکارا ملا۔ گھر آ کر میں نے پیٹرس کو بتایا کہ یہ قانونی طور پر ضروری ہے کہ محکمہ صحت والے اس کی لاش لے جائینگے اور جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اس کی بیماری کسی قسم کی چھوت کی بیماری نہیں تھی اور اسکی موت کسی کے مجرمانہ فعل کے نتیجے میں نہیں ہوئی ہے، لاش دفن کے لئے واپس کردی جائیگی۔ پیٹرس کا چہرہ اداسی سے دھواں دھواں ہوگیا۔

محکمہء صحت والے اسکی لاش لے گئے مگر کچھ دن گذرنے کے بعد بھی محکمہ صحت سے کوئی فون نہیں آیا۔ جب میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ اسکی موت واقعئی نمونیا سے ہوئی ہے اور محکمہ صحت نے اسکی لاش مناسب طریقے سے ٹھکانے لگادی ہے۔ میں جب پیٹرس کو یہ بتانے کے لئے باہر گیا تو وہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہیں فکر کی ضرورت نہیں وہ قدرتی موت مرا ہے۔ اس پر پیٹرس نے پوچھا مالک ہم کب جا کر اسے واپس لا سکتے ہیں۔۔۔''واپس'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔''ہاں واپس۔ مالک کیا آپ انہیں فون کرکے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم کب اسے واپس لینے آسکتے ہیں تا کہ ہم اسے اپنے رواج کے مطابق دفن کر سکیں''...یہ سن کر تو میرے ہوش گم ہوگئے، میں کوئی جواب نہ دے سکا اور اسی میں بہتری سمجھی کہ اسکی سوالیہ نظروں سے بچ کر گھر میں گھس جاؤں۔ مگر وہاں ہال میں لیریش کھڑی تھی۔ میں نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس سے کہا''تم بتاؤ میں پیٹرس کو کیا جواب دوں۔ وہ تو کہتا ہے اسکی لاش واپس کی جائے تا کہ ہم اسے دفن کر سکیں'' لیریش نے مجھے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا''تو تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی لاش تو ٹھکانے لگادی گئی ہے؟؟''میں شرمندہ شرمندہ کسی چور کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پھر زور دے کر کہنے لگی جاؤ اسے بتاؤ، ہمت کرو، یہ جاننا اسکا حق ہے۔ میں پھر باہر آیا اور کہا''دیکھو پیٹرس، اب تم اس کی لاش واپس نہیں لے سکتے اس لئے کہ محکمہ صحت نے اسے اپنے طور پر دفن کردیا ہے، وہ دفن ہو چکا ہے، سمجھا۔۔وہ دفن ہو چکا ہے۔

''مگر مالک۔۔کہاں، کہاں دفن کیا ہے اسے'' مجھے معلوم تھا کہ ایک گمنام کم عمر نیگرو کو جو غیر قانونی بھی تھا اتنی اہمیت نہ تھی کہ اسکی قبر نشان زدہ ہو۔ میں نے پیٹرس سے یہی کچھ کہا مگر وہ تو جیسے پتھر کا بت بن گیا تھا۔ اس کے مٹی میں آلودہ ہاتھ دانہ ڈالنا بھول گئے تھے اور چہرہ جذبات سے عاری تھا جیسے منجمد ہوگیا ہو۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ یہ سب کچھ سمجھ ہی نہ سکا ہو۔ وہ پھر کہنے لگا مگر مالک۔۔آپ ضرور انہیں فون کریں۔ اس وقت میں اسکی نفسیات سمجھ رہا تھا۔ سیاہ فام آبادی کو اسکا یقین تھا کی سفید فام لوگ ہر چیز کے مالک ہیں، انکا ہر ایک پر حکم چلتا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو! اسکے چہرے پر مایوسی طاری تھی وہ سوچ رہا تھا میں یہ کرنا ہی نہیں چاہتا، میں اس کے بھائی کی لاش کی بازیابی میں کوئی مدد کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میں نے اسے سمجھانے کے لئے کہا لیکن پیٹرس میں کیسے اسکی

لاش کی واپسی کرواسکتا ہوں وہ دفن ہو چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے مگر میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر میں اسے وہیں چھوڑ کر گھر کی طرف چلدیا۔

مگر۔۔۔کھانے کی میز پر بیٹھ کر لیریش نے پہلا نوالا توڑنے سے پہلے مجھ سے کہا کم ازکم تم فون تو کر سکتے تھے، پھر جو بھی ہوتا۔ میں اب سچ مچ جھنجلا گیا۔ میں نے کہا لیریش کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو، تم مجھے کیا سمجھ رہی ہو، کیا میں یسوع مسیح ہوں جو مردوں کو زندہ کردوں۔

''نہیں'' وہ بولی'' میں یہ توقع نہیں کر رہی مگر تم محکمہ صحت کو فون تو کر سکتے ہوتا کہ پیٹرس کو صاف اور کھلے ضمیر کے ساتھ بتا سکو کہ تم نے کوشش کی تھی۔ چلو اب ایک اچھے انسان کی طرح انہیں فون کرو'' یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر واپس آ گئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ اسکا باپ'' روڈھی سیا'' سے آ رہا ہے۔ اس کے پاس پرمٹ اور قانونی کاغذات ہیں۔ وہ صرف اپنے بیٹے کی تدفین کے لئے آ رہا ہے۔ وہ آخر کار باپ ہے شاید اسکو اسی طرح تسکین حاصل ہو۔ صبح میں لیریش کی نظروں کا سامنا نہ کر سکا اور میں نے فون کیا۔ میں کچھ حیران ہوا جب محکمہ صحت کے کارکن نے کہا کہ اگرچہ یہ غیر معمولی درخواست ہے مگر چونکہ محکمہ صحت کے سارے تقاضے پورے ہو چکے ہیں اس لئے قبر کشائی ممکن ہے اس لئے تابوت کو نکالا جا سکتا ہے مگر لاش کو نکالنے کی اجازت نہ ہوگی اس لئے کہ اب اس کی موت کو دو ہفتے ہو چکے ہیں اور اسکے عزیز واقارب اسے دیکھنا برداشت نہ کر سکیں گے۔ لیکن اس پورے کام میں بیس پاؤنڈ خرچ ہو نگے۔ میں اس تمام جھگڑے سے پہلے ہی بہت چڑ چڑا گیا تھا، بیس پاؤنڈ سن کر مجھے ایک عجیب خوشی ہوئی، یعنی بیس پاؤنڈ!! تو اب یہ معاملہ خود ہی ختم ہو جائیگا۔ پیٹرس جو پانچ پاؤنڈ مہینہ کماتا ہے اور اس میں بمشکل اپنے کنبے کا پیٹ بھرتا ہے کہیں سے بھی اتنی بڑی رقم نہیں لا سکتا۔ اتنی بڑی رقم میں تو اسکے کنبے کا پورے سال کا خرچہ چلتا ہے۔ اور میں، میں اسے ہرگز اتنے پیسے نہیں دونگا۔ اس لئے بھی کہ یہ اب اس کے بھائی کے کوئی کام نہیں آئینگے۔ ہاں اگر مرنے سے پہلے مجھے اسکے علاج یا داکٹروں کی فیس کے لئے اتنے روپے خرچ کرنے ہوتے تو شائد میں ایسا کر بھی دیتا مگر اب جبکہ وہ مر چکا ہے یہ سراسر حماقت ہوگی۔ میں نے بڑے سپاٹ لہجے میں اسے بتایا کہ لاش واپس مل سکتی ہے مگر تمہیں اس کے لئے بیس پاؤنڈ دینے پڑینگے۔ اس نے کچھ حیرت سے کہا'' بیس پاؤنڈ!!'' میں نے روکھے لہجے میں کہا:

''ہاں بیس پاؤنڈ۔۔۔سوچ لو'' اور اسے وہیں چھوڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔

دوسری صبح جب میں شہر جانے والا تھا پیٹرس آیا۔ اس نے کہا'' مالک۔۔'' وہ اور کچھ نہیں کہہ سکا اور مڑے تڑے گندے میلے نوٹوں کی گڈی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔ دراصل یہ نیگرو اس قدر غریب ہیں کہ ان کی زندگی میں ایسا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے سکیں اور وہ بھی ایک سفید فام کو، ان کم بختوں کو یہ آتا ہی نہیں کہ کسی سفید فام کو کیسے نوٹوں کی گڈی دی جاتی ہے۔

مگر میرے ہاتھوں میں بیس پاؤنڈ کے نوٹ تھے۔ کچھ بھیگے اور سیلے ہوئے، کچھ گندے، کچھ دھبے لگے اور کچھ کونوں سے پھٹے، چند ایک پاؤنڈ کچھ آدھے پاؤنڈ اور کچھ ریزگاری۔ کس کس نے دئے تھے، فرانز نے، البرٹ نے، ڈوراباورچن نے اور کچھ بوڑھے دربان نے، شاید اس میں مالی جس کی کمر جھک چکی ہے کی بھی کمائی شامل تھی۔ اور خدا جانے کون کون، شاید قریبی فارمز میں بھی کام کرنے والوں نے اپنا حصہ ڈالا ہو۔ میں اس سے متاثر ہونے کے بجائے اور چڑ چڑا گیا۔ کیسے بے وقوف لوگ ہیں کہ اپنی نہایت محنت کی کمائی اس طرح ایک جذباتی بات کے لئے ضائع کر رہے ہیں۔ زندگی میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے اور موت کے بعد مرنے والے کو اعزاز اور عزت دینے کے لئے اپنی بچت کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ انہیں ہمارا، سفید فام لوگوں کا فلسفہ کبھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ بھئی یہی زندگی ہے اس میں عیش کرو جب مر گئے تو مر گئے سب کچھ ختم۔۔۔

سینیچر کے دن ملازمین کام نہیں کرتے اس لئے تدفین کے لئے یہی دن رکھا گیا۔ پیٹرس نے ہماری گدھا گاڑی ادھار مانگی تا کہ تابوت کو شہر سے واپس لا سکے۔ جب واپس آیا تو اس نے کچھ طمانیت سے لیریش کو بتایا کہ سب کام مناسب طور پر ہوا، تابوت تیار تھا۔ اس کو بہت اچھی طرح کئی میخوں سے سیل کیا گیا تھا تا کہ اسے کھولا نہ جا سکے کیونکہ دو ڈھائی ہفتوں کی وجہ سے ناگوار بو کا سامنا ہو سکتا تھا۔ تابوت کو پیٹرس کی جھگی میں رکھ دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تدفین کا جلوس نکلا، انہیں فارم کے مشرقی کنارے تک جانا تھا جہاں سیاہ فاموں کا چھوٹا سا قبرستان تھا۔

اتفاق سے میں اس وقت قریب ہی گالف کی پریکٹس کر رہا تھا۔ جلوس جنگلے کے پاس سے گذرا۔ تابوت ایک گدھا گاڑی پر رکھا تھا۔ گدھا سر جھکائے گاڑی کو کھینچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مکھیوں سے تنگ آ کر اپنے کان ہلاتا ورنہ اس کی نظریں زمین پر گڑی تھیں۔ شرکاء بڑی تنظیم سے اس کے پیچھے قطار میں چل رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر جب قبرستان کی سرحد شروع ہوگئی گدھا گاڑی رک گئی۔ چار آدمیوں نے مل کر تابوت اتارا۔ اس میں البرٹ، پیٹرس، فرانز اور مرحوم کا باپ شامل تھے پھر انہوں نے چاروں کونوں سے تابوت کو کنڈوں سے پکڑا اور نہایت تعظیم سے اسے کھدی قبر کی جانب لے کر چلے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں انہیں نظر انداز کر کے اپنی گولف کی پریکٹس کرتا رہوں یا کچھ دیر ٹھہر کر اسکا نظارہ کروں۔ جب یہ لوگ میرے پاس سے گذرے تو مجھے انکی تیز تیز سانسوں کی آواز اور بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں ٹھٹک کر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر نہ جانے کیوں، جلوس جو بڑے منظّم طریقے سے چل رہا تھا اچانک رک گیا، پیچھے چلنے والے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ میں نے دیکھا تابوت کا وہ کونا جو اسکے باپ نے پکڑا ہے زمین کی طرف جھک رہا ہے۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ تابوت کو اٹھائے مگر جیسے یہ اسکے بس میں نہ تھا۔ اسکا سانس پھول رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ تابوت زمین پر گر جائے اس نے تابوت زمین پر رکھ دیا۔ جلوس کے سرے پر تابوت کو زمین پر رکھ

دینے کے بعد اسکا باپ زور زور اور کچھ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔اس سے تابوت کا
وزن نہیں اٹھایا جار ہا تھا، اسکا سانس پھولا ہوا تھا۔جلوس کے افراد ایک دوسرے کو
دھکے مارتے اپنا تجسس مٹانے آگے کی طرف جار ہے تھے، میں بھی بے ارادہ اسی
طرف دوڑا جہاں اور لوگ جار ہے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو بوڑھا میری طرف
دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے لگا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بہت
ناراض اور غم و غصے میں مبتلا ہے۔میں اسکی زبان نہیں سمجھتا مگر مجھے لگا کہ کوئی بہت
ہی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔میں نے پیٹرس سے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔

پیٹرس تو خود بہت ہی الجھا ہوا تھا وہ بار بار اپنا سر جھٹکتا تھا۔وہ دونوں
ہاتھ بغیر کسی مقصد کے ادھر ادھر چلا رہا تھا اور اسکی آنکھوں میں بڑی وحشت تھی۔ میں
نے پھر پوچھا کیا ہوا۔وہ کہنے لگا میرا باپ کہہ رہا ہے "میرا بیٹا اس قدر بھاری نہیں تھا"
میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا وہ گہری گہری اور تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔آخر جب
اسکا سانس تھوڑا بہتر ہوا تو وہ ٹوٹے پھوٹے انگریزی لہجے میں کہنے لگا۔"میرا بیٹا کم عمر
اور دبلا پتلا تھا وہ اتنا بھاری نہیں تھا" وہ پھر چیخ چیخ کر نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔لوگوں کو
اسکا یقین نہیں تھا مگر اس وقت کچھ ایسی صورتحال ہو گئی تھی کہ اسکی بات کو ٹالنا ممکن نہیں
تھا۔ چہرے کی جھریاں اسکے کئی ٹوٹے دانت اسکی داڑھی اور مونچھوں کے سفید بال
زندگی میں اس کے تجربے کی گواہی دے رہے تھے۔وہ تجربہ جو عمر گذرنے کے ساتھ ہی
حاصل ہو سکتا ہے۔اس نے جرأت مندی سے خود اپنے ہاتھوں سے تابوت کی میخیں
اکھاڑنی شروع کیں، پھر اسکے ساتھ کچھ اور جوان لگ گئے۔ ڈھکنا کھلا ایک بدبو کا
جھونکا آیا، چادر ہٹائی گئی، تمام لوگ دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارنے لگے
اور اپنی گردنیں آگے بڑھانے لگے۔۔تابوت میں ایک ادھیڑ عمر کا بھاری جسم کا نگرو
جس کے سر پر ایک بڑے زخم کا نشان تھا لیٹا ہوا تھا۔ظاہر تھا کہ یہ اس کا بیٹا نہیں تھا۔

اس کے بعد میں محکمہ صحت کے افسران سے کئی ہفتے جھگڑتا رہا، کوئی
دن نہیں جاتا تھا جب میں وہاں نہیں جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنی اس غلطی پر وہ
شرمندہ ہونگے اور سنجیدگی سے اس کا ازالہ کرینگے مگر انکے لئے یہ معمولی بات تھی۔
مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے مردہ خانے میں لے جائیں گے اور ایک کم عمر لڑکے کی
لاش حوالے کر دیں گے اور یہ کہ میں اس معاملے میں ان کا ساتھ دوں گا کیونکہ انکا
خیال تھا کہ میں انکا اس معاملے میں ہم خیال ہوں۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے،
انکی نظر میں اور شاید تمام سفید فام لوگوں کی نظر میں بھی، سارے سیاہ فام چہرے
ایک ہی جیسے ہوتے ہیں بے وقعت۔

میں شام کے کھانے پر بیٹھتے ہوئے لیریش سے کہتا میرا آدھا دن
اس معاملے کی نذر ہوتا ہے مگر حکام کے لئے یہ کوئی بہت اہم معاملہ نہیں ادھر ہر
شام پیٹرس دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا ہوتا اور مجھے سے سوال کرتا"
باس۔۔کوئی خبر" ہاں ہاں پیٹرس میں کوشش میں لگا ہوں، میں صرف یہی کہہ سکتا
تھا۔اسی کے ساتھ لیریش بھی ہر شام مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی۔اگرچہ میرے
پاس کوئی نئی خبر نہ ہوتی مگر میں اس معاملے میں بہت سنجیدہ تھا اور میرے اندر حکام
کے لئے بہت زیادہ غصہ تھا۔وہ نہ صرف اس معاملے میں کوئی قدم اٹھانے کے
لئے تیار نہیں تھے بلکہ انہوں نے پیٹرس کی درخواست پر بیس پاؤنڈ بھی واپس کر
نے سے معذرت کر لی تھی۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگی تم اس معاملے کے لئے اس قدر سنجیدہ
کیوں ہو گئے ہو۔تو میں نے اسے جواب دیا کہ مجھے محکمے کی بے حسی پر غصہ ہے۔
وہ اس معاملے سے کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔یوں تو میں اب بھی ہر شام پیٹرس
سے یہی کہتا تھا کہ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارا بھائی تمہیں واپس دلا دوں
مگر وقت کے ساتھ میری آواز اور اسکی پختگی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ مجھے بھی اسکا
یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ ممکن نہیں کیونکہ کس کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے، کسی بے نام
قبر میں، شاید کسی نئی ہاؤسنگ سکیم میں جہاں اب اس پر مکان تعمیر ہو چکے ہونگے،
شاید کسی کھیت میں جہاں اب گنوں کی کاشت ہوتی ہوگی یا کسی میڈیکل کالج کی
اناٹومی کی ٹیبل پر جہاں پر جوش طلبہ اسکی رگوں کے جال کی چیر پھاڑ کر کے انکا
مطالعہ کر رہے ہونگے۔صرف خدا ہی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے، مگر اس سے فرق
بھی کیا پڑتا ہے، جب وہ زندہ تھا تو بھی اسکی کوئی شناخت یا پہچان نہ تھا اور
اب۔۔اب تو وہ مر چکا ہے۔

- بقیہ -

فرحت باجی

شاید اُنہیں اپنے بلاوے کا غیبی اشارہ ہو چکا تھا جس کا ہمیں تو کیا اُن
کے گھر کے کسی فرد کو اندازہ نہ تھا۔

موت کا بے رحم ہاتھ چند یوم کے اندر فرحت باجی کو اُن کے
آخری سفر پر لے گیا تو ہمیں اُن کے آخری الفاظ "ہنسی نہیں سُنیں
گے آج" شدت سے یاد آئے۔ یہ حادثہ فرحت باجی کی اولاد بھائی
بہن اور اہلِ خانہ کے لیے کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔نہ جانے کیوں،
کوشش اور خواہش کے باوجود ہم اُن سے تعزیت کا ایک لفظ تک ادا
نہ کر سکے۔

اس سانحہ کو گذرے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے مگر اکثر شبِ
تنہائی میں ہماری کھڑکی، روشن دان یا جھرکوں سے فرحت باجی کے
قہقہے کی آواز کے ساتھ چٹ چٹ کرتے موتی فرش پر گرنے لگتے
ہیں جس کے بعد نہایت مترنم آواز میں یہ سرگوشی سُنائی دیتی ہے:

"شکریہ کامران،
بہت شکریہ،
تم نے میری موت کو زندگی سے زیادہ حسین بنا دیا۔"

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (نیویارک)

قسط......۳

کل سے یہ بات مجھے مسلسل پریشان کر رہی تھی کہ لوگوں نے میرے ایک معمولی سے فعل کو آخر اتنا غیر معمولی کیوں بنا دیا ہے۔ رام داس کی معصوم سی بات نے میرے دل کے اندر کی وہ گرد ایسے صاف کر دی تھی جیسے بارش کے بعد فضا سے آندھی کی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ مجھے کتابوں میں پڑھا ہوا وہ واقعہ یاد آیا۔ واقعے کے مطابق سوسروں والے کالیا نامی ایک سانپ نے دریائے گنگا کے پانی کو زہریلا کر دیا، جس کی وجہ سے دریا میں نہانے اور دریا کا پانی پینے والے تمام انسان اور جانور مرنا شروع ہو گئے۔ علاقے کے لوگوں نے کرشن مہاراج سے شکایت کی۔ کرشن مہاراج نے ایک لڑائی میں کالیا کو شکست دے کر دریائے گنگا کا پانی انسانوں اور جانوروں کے لیے دوبارہ قابلِ استعمال بنایا۔ میں اب رام داس کو کیسے بتاتا کہ جسے وہ میرا کرشمہ سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا علم تھا۔ رام داس نے اور جھیل پر موجود باقی لوگوں نے میرے کرشمے کو دیکھ کر مجھے کرشن سمجھا تھا۔ حالانکہ رام داس جسے میری انگلی کا اشارہ کہہ رہا تھا وہ میری سانپ کی نبض شناسی اور تربیت تھی۔ جھیل پر موجود تمام عینی شاہدوں نے بھی یہ تماشا رام داس کے زاویۂ نظر سے دیکھا ہوگا۔

انسان ازل سے کرشمے دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔ یہ تجربہ اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اور وہ اپنے ذہن پر کرشمے کی انمٹ چھاپ بسا کر ساری دنیا میں اپنی گواہی کا اعلان کرتا پھرتا ہے۔ باپو ٹھیک کہتے تھے، مجھے راموہی رہنا تھا اسی لیے میں نے رام داس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ سکول کا باقی راستہ ہم نے خاموشی سے کاٹا۔ سکول پہنچا تو چاچو کو اپنا منتظر پایا۔ وہ مجھے سیدھا اپنے دفتر لے گئے، دفتر کا دروازہ بند کر کے میرا حال پوچھا۔ پھر مجھے کہنے لگے، اگر کوئی تم سے ایسی ویسی بات کرے تو مجھے بتانا۔ آدھی چھٹی کے وقت میرے کوارٹر آ جانا۔ اگر دورانِ سکول طبیعت ناساز ہو جائے تو بھی میرے کوارٹر میں چلے آنا۔ پھر انہوں نے دفتر کا دروازہ کھول کر مجھے اپنی کلاس میں جانے دیا۔

میں سکول کے لڑکوں کے بارے میں ویسے بھی فکر مند نہیں تھا۔ سکول میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ میں فطری طور پر دوسرے لڑکوں سے مختلف ہوں۔ میرے کھلونے سانپ اور بین تھے جبکہ باقی لڑکوں کے کھلونے گلی ڈنڈا، کرکٹ، فٹبال اور کبڈی وغیرہ تھے۔ سکول کے کھیلوں سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں سکول کے بین الجماعتی کھیلوں کے مقابلوں کے دنوں میں سکول آنا بند کر دیتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے میں نے اپنے سکول اور اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے نہ دوستی کی تھی اور نہ ہی کسی نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے سکول میں بھی ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ رام داس کے ساتھ آتا، اپنی کلاس میں بیٹھتا، پڑھائی کی طرف توجہ دیتا، رام داس کے ساتھ واپس گھر لوٹ جاتا اور بس۔ پڑھائی سے مجھے سکول کا کام یاد آیا۔ کل کے واقعہ نے مجھے سکول کا کام بالکل بھلا دیا تھا۔ سکول کا کام کئے بنا سکول آنے کا یہ میری سکول کی نو سالہ زندگی کا پہلا دن تھا جس کی وجہ سے میں خاصا گھبرا گیا۔ میں کلاس سے نکل کر چاچو کے دفتر جا کر انہیں بتانے کے خیال سے اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ آنند صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔

آنند صاحب ہمارے فارماسٹر تھے۔ وہ نئے نئے استاد بھرتی ہو کر آئے تھے۔ عام طور پر کُرتہ اور شلوار پہنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کُرتے کے ساتھ پاجامہ بھی پہن کر آتے تھے۔ ان کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی اس لیے وہ بڑے چمک دمک کر سکول آتے تھے۔ طلباء سے سختی سے پیش آتے تھے۔ ہم نے انہیں ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ کلاس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے تمام طلباء کی حاضری لگاتے، اس کے بعد اسکول کا کام دیکھتے۔ کام نہ کرنے والوں کو کلاس کے ایک کونے میں کچھ دیر کے لیے کان پکڑواتے پھر انہیں سکول کا کام کرنے کے فوائد پر لیکچر پلاتے۔ اس کے ساتھ میرے بلاناغہ کام کرنے کو سب کے سامنے مثال کے طور پر پیش کرتے۔ پھر دوسرے دن کا کام سونپ کر باقی دن کی پڑھائی کا آغاز کرتے۔ میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ اچانک آنند صاب نے میرا نام پکارا تو میں نے زور سے حاضر جناب کا نعرہ لگایا۔ میں سمجھا تھا وہ حاضری لگا رہے ہیں۔

میرے اس ردِّعمل سے آنند صاب کے ساتھ تمام کلاس کے لڑکے ہنس پڑے تھے۔ جس کی وجہ سے میں خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ آنند صاب مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ میں سکول کا کام نہ کرنے کے خوف سے کچھ زیادہ پریشان ہو گیا اور اسی پریشانی کے عالم میں ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا، میرے کچھ رشتہ دار کل والے واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ مجھے آپ کا استاد ہونے پر فخر ہے۔ آنند صاب زندگی میں پہلی بار مجھے آپ کہہ کر مخاطب تھے۔ میں نے کچھ اور کہنے کے بجائے انہیں بتایا کہ کل والے واقعے کی وجہ سے میں سکول کا کام کر کے نہیں لا سکا۔ کہنے لگے، آج کے بعد آپ اپنے سکول کے کام کی فکر نہ کیا کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے اپنی جگہ بیٹھنے کی درخواست کی۔ میں اپنی جگہ آ کر بیٹھا تو انہوں نے حسبِ معمول پڑھائی شروع کر دی۔

دس بجے کے قریب سکول کے باہر سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی آ کر رکی۔ جس سے کوچوان نکل کر ہیڈ ماسٹر کے دفتر گیا۔ اس کے بعد وہ چاچو کی معیت میں میری کلاس میں داخل ہوا۔ چاچو نے بتایا کہ بلبیر سنگھ نے بتاشوں کا ایک چھابہ سکول کے بچوں میں بانٹنے کو بھجوایا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ چھابے سے سب سے پہلا

بتاشہ میں اُٹھا کر کھاؤں اور میں ہی اپنے ہاتھ سے بتاشے بچوں میں بانٹوں۔ کوچوان گھوڑا گاڑی سے ایک بڑا چھابہ اٹھا کر لایا اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے چھابے سے اٹھا کر پہلا بتاشہ آنند صاب کو دے دیا۔ انہوں نے بڑی عقیدت سے بتاشہ میرے ہاتھ سے لے کر اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی کلاس کے ہر طالبعلم کو بتاشے دیئے۔ پھر ہم نے ہر کلاس میں جا کر بتاشے تقسیم کیے۔ سکول کے طلباء کے بعد بتاشے استادوں میں بھی تقسیم کیے۔ خالی چھابہ لے کر کوچوان مجھے کورنش بجاتا ہوا چلا گیا اور ہم ایک بار پھر پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میرے ہم جماعت بھی مجھے عقیدت اور رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

سکول کی چھٹی کے وقت صبح والی گھوڑا گاڑی ایک بار پھر سکول کے سامنے آ کر رکی، اس میں وہی کوچوان نکل کر سیدھا میری کلاس میں آیا اور مجھے بتایا کہ وہ مجھے لینے آیا ہے۔ لیکن میں تو رام داس کے ساتھ سائیکل پر گھر جاتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ رام داس کو ہم سائیکل سمیت تانگے پر اپنے ہمراہ لے جائیں گے، کوچوان نے جواب دیا۔ ایسے میں رام داس اپنی سائیکل سنبھالتا ہوا پہنچ گیا۔ تانگے پر سائیکل لادنے کی بات سن کر اس نے اپنی سائیکل اٹھا کر تانگے کی پچھلی طرف رکھی اور خود بھی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ رام داس تانگے پر کچھ ایسی جلدی میں بیٹھا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ کہیں کوچوان اپنی رائے نہ بدل دے۔ رام داس کو اس اطمینان سے تانگے پر بیٹھا دیکھ کر میں بھی تانگے پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھا۔ کوچوان نے بڑی عقیدت سے کورنش بجالاتے ہوئے مجھے تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ میں نے زندگی میں تانگے دیکھے ضرور تھے لیکن تانگے پر بیٹھنے کا یہ میری زندگی کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔ ہمارے علاقے کی جغرافیائی نوعیت کی وجہ سے کرائے والے تانگے عام شہروں کی نسبت کم نظر آتے ہیں۔ یہ تانگے میلی کچیلی اور پھٹی ہوئی سیٹوں کے ساتھ لاغر گھوڑوں سے چلتے ہیں۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ یہ گھوڑے کوچوان کی لچی کے ڈر کے زیر اثر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو بھی غلط نہ ہوگا۔ لیکن اس تانگے کی شان ہی علیحدہ تھی۔ تانگہ گاڑی جیسے ابھی ابھی کسی فیکٹری سے بن کر نکلی تھی۔ اس پر روغنی پھول بوٹے بنے تھے۔ سیٹوں کے نرم گدوں پر شنیل کا غلاف چڑھا تھا۔ اس گاڑی کو کھینچنے والا کالا گھوڑا صحتمند اور تازہ دم لگ رہا تھا۔ یہ گھوڑا اکڑ اکڑ کر چل کر دیکھنے اولوں پر اپنے مالک کی امارت اور خوشحالی کا رعب ڈال رہا تھا۔ گھوڑے کے پاؤں میں گھنگھروں کی پائل تھی۔ جب گھوڑے نے صاف سڑک پر دوڑنا شروع کیا تو ایسے لگا جیسے وہ دوڑنے کی بجائے کسی موسیقی کی تال پر رقص کر رہا ہو بلکہ خود ہی موسیقی بکھیر رہا ہو۔ نہ صرف گھوڑا یا گاڑی بلکہ سوار اور سارا ماحول گھوڑے کی مستانی تال پر رقص کناں ہوا جا رہا تھا۔ یہ موسیقی سڑک پر چلنے والی سواریوں، پیادوں اور سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے خوانچہ فروشوں کی توجہ کا مرکز بھی بن رہی تھی جس کے دو فائدے ہو رہے تھے۔ پہلا فائدہ لوگوں کو سواری کی طرف متوجہ کر کے راستے سے ہٹانا اور دوسرا مالک کی امارت کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا۔ ایسی سواریاں کم از کم ہمارے علاقے کے گنے چنے لوگ ہی رکھ سکتے تھے۔

مجھے اپنے خیالات سے کوچوان کی آواز نے نکالا۔ جو مجھے بتا رہا تھا کہ جھیل کے کنارے پر جہاں کل آپ نے بلبیر جی کو مورکھ سانپ کی جکڑ سے بچایا تھا، وہاں پر انہوں نے آج زردے کی پانچ دیگوں کی پرسات نکالی (پرشاد چڑھائی) ہے اور ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ لیکن میں گھر جاؤں گا۔ میرے باپو تو گھر پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے، میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کوچوان سے کہا۔ کوچوان نے مجھے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ شان جی کو وہ پہلے ہی جھیل کے کنارے لے آیا تھا اور شان جی کے حکم کے مطابق وہ مجھے بھی وہاں لے کر جا رہا تھا۔ باپو کے بارے میں جان کر مجھے بھی جھیل پر جانے میں کوئی عار نہیں تھی۔ میں نے اپنا جسم تانگے کی سیٹ پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کوچوان کہنے لگا، سرکار آپ کو مناسہ دیوی کی شکتی حاصل ہے۔ وہ جسے چاہے مہان کر دے۔ میرے لیے آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر جانے میں بڑا مان اور کوئی نہیں ہے۔

مناسہ دیوی کے بارے میں مَیں بہت کچھ جانتا تھا۔ مناسہ سانپوں کی دیوی ہے۔ ساری دنیا کے سانپ اس دیوی کی امان میں رہتے ہیں۔ سانپ اس کے حکم سے کاٹتے ہیں اور اس کے حکم سے سانپ کاٹے کی شفا ملتی ہے۔ وہ جس کو چاہے سانپوں کا گیان دان کرتی ہے۔ اس کی روح کی ایک شیش ناگن میں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے سانپوں کو عمومی طور پر اور شیش ناگنوں کو خصوصی طور پر پوجا جاتا ہے۔ مناسہ ہر تین سو سال بعد انسانی روپ میں آتی ہے۔ وہ جس کو چاہے اپنے درشن دیتی ہے۔ ویسے آج تک اُس کے درشن کا دعویدار فی زمانہ کوئی نہیں ہے۔ کسی کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ آخری بار اُس کے درشن کب اور کس نے کئے ہیں۔ دنیا بھر کے جوگی، سنیاسی، سپیرے اور شمان اس کے ایک درشن کے لیے اپنا جیون تیاگ دیتے ہیں۔ ساون کی ناگ پنچمی میں آنے والے سنیاسی، جوگی سپیرے اور شمان اس امید پر ناگ پنچمی میں شرکت کرتے ہیں کہ شاید انہیں مناسہ کے درشن نصیب ہو جائیں۔ شیش ناگنیں اس میلے میں اسی سبب سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔

میرے خیالات کا دھارا تانگے کی تان کے ساتھ ہی اچانک رُک گیا۔ ہم جھیل پر پہنچ چکے تھے۔ جھیل کے کنارے پر کل اور آج کے منظر میں بڑا فرق تھا۔ کل والے مقام پر آج شامیانے لگائے گئے تھے اور شامیانوں کے نیچے دریاں بچھائی گئیں تھیں اور دریوں پر ایک طرف قالین بچھے تھے۔ جہاں ایک مسند نما جگہ پر گاؤ تکیے رکھے تھے۔ باپو کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مسند پر بیٹھے تھے۔ جبکہ دریوں پر بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ شامیانوں کی غربی جانب اینٹوں سے بنائے گئے چولہوں پر پانچ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چولہوں میں آگ کی بجائے دہکتے انگارے اور دیگوں کے ڈھکے ہوئے منہ پر اس بات کی دلیل تھے کہ دیگوں کے چاول دم پر ہیں۔

تانگہ رُکتے ہی کئی لوگ ہماری طرف بڑھے۔ بلبیر ان سب میں پیش پیش تھا۔ بلبیر نے مجھے اپنے ہاتھوں کے سہارے تانگے سے اترنے میں مدد دی۔

پھر مجھے بڑے احترام سے اپنے آگے چلنے کی درخواست کی۔ مجھ سے بات کرتے وقت الفاظ بلبیر کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے مسند کی طرف چلنا شروع کیا تو شامیانوں میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ فرطِ عقیدت سے نہ صرف ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے بلکہ میرے لیے مسند کی جانب راستہ بھی بنانے لگے۔ مسند پر باپو پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ پگڑی پہنے ایک اور صاب بھی بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ مسند پر بلبیر کے خاندان کی کئی مختلف عمر کی عورتیں بھی موجود تھیں۔ باپو اپنی جگہ پر بیٹھے رہے لیکن پگڑی والے صاب اپنی جگہ پر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی سفید داڑھی، بھاری جسامت، لمبے قد پر سفید کرتا اور پاجامہ ان کی شخصیت کو کچھ زیادہ ہی جاذب بنائے ہوئے تھے۔ میں جونہی ان کے قریب پہنچا، انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا کر مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گھمبیر آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ خالص پنجابی میں بول رہے تھے۔ میں تمہیں پر بھو کہوں یا پُتر۔ تو دیکھنے میں کل کا منڈا لگتا ہے پر تو نے کام پر بھوؤں جیسا کیا ہے۔ جو کام گرو نے تم سے کروایا ہے وہ مہان لوگ سالوں کی تپسیا کرنے کے بعد بھی نہیں کر سکتے۔ تو نے اتنی چھوٹی سی عمر میں میرے خاندان پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں چاہوں بھی تو اس کا اتارہ نہیں کر سکتا۔ اوے پُتر! تیرے بلے بلے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھر آئی اور وہ کچھ کہے بغیر بے تحاشہ میرا ماتھا چومنے لگا۔ پھر اسی جذباتی انداز میں اس نے مجھے اپنے اور باپو کے درمیان بٹھا دیا لیکن میرا ہاتھ تھامے رکھا۔ یہ بزرگ بلبیر کے والد جسونت سنگھ تھے۔ جسونت سنگھ کے بعد بلبیر کے گھر کی خواتین نے ایک ایک کر کے ہاتھ جوڑ کر مجھے ست سری اکہا۔

ہمارے بیٹھتے ہی پکانے والوں نے ایک دیگ کا منہ کھولا، اور زردے کی ایک پلیٹ بھر چاول نکال کر میری جانب بڑھا دئے۔ باپو نے مجھے آہستہ سے بتایا کہ میں تھوڑے سے چاول اس پلیٹ سے کھا کر اور باقی چاولوں پر اپنا ہاتھ پھیر کر اپنی جوٹھن پلیٹ لانے والے کو واپس کر دوں۔ میں نے گرم گرم زردے کی پلیٹ سے چند دانے منہ میں ڈال کر پلیٹ کے چاولوں پر اپنا ہاتھ پھیرا اور پلیٹ لانے والے کو واپس کر دی۔ وہ میرے ہاتھوں سے پلیٹ لے کر دیگوں کی طرف واپس گیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے تمام دیگوں کے منہ کھول کر میری جوٹھن تھوڑی تھوڑی کر کے دیگوں میں ڈال کر تمام دیگوں کے چاول اچھی طرح ملا دئے۔ اس کے بعد پہلی دیگ سے زردے کا پہلا تھال نکال کر ہمارے سامنے رکھا جو بلبیر، جسونت، باپو اور میرے لیے تھا اور دوسرا تھال بلبیر کے گھر والوں کے لیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی عام پرشاد تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لوگ قطار میں لگے اپنے ہاتھوں میں طرح طرح کے برتنوں میں چاول لیتے۔ کچھ تو شامیانے کے نیچے بیٹھ کر کھاتے اور کچھ اپنے ساتھ شاید اپنے گھروں کو لے کر چلے جاتے۔ جن لوگوں کے پاس برتن نہیں تھے وہ اپنی جھولی یا پگڑی کے پلو میں چاول لیتے۔ میٹھے چاول کھانے کا یہ میرا پہلا دن تھا۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ زردہ میری پسند کا کھانا نہیں ہے۔ اس کے باوجود بلبیر اور جسونت کا دل رکھنے کے لیے کچھ کھایا۔ باپو کو بھی میٹھے چاول کم پسند تھے اس لیے وہ بھی میری طرح زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم چاول کھانے کی کوشش میں تھے۔ جسونت نے میری طرف دیکھ کر باپو سے کہا، شان جی آپ کا بچہ بولنا بھی جانتا ہے یا نہیں۔ یہ جب سے آیا ہے اس نے ایک بار بھی منہ نہیں کھولا۔ باپو نے جواب دیا، اسے کم بولنے کی عادت ہے۔ یہ گھر میں بھی بہت کم بولتا ہے۔ ہاں کم بولنا پر بھوؤں کا شیوہ ہے، جسونت نے جواب دیا۔

زردہ کھانے کے بعد جانے سے پہلے لوگ میرے سامنے آتے اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے۔ معلوم نہیں یہ سب کچھ کتنی دیر تک چلتا اگر باپو اچانک کھڑے ہو کر جسونت اور بلبیر سے جانے کی اجازت نہ مانگتے۔ باپو کے کھڑا ہوتے ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہمارے کھڑے ہونے کے ساتھ میزبان خواتین اور مرد بھی کھڑے ہو گئے۔ میزبانوں میں سے کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید باپو کے ساتھ ان کی بات پہلے سے طے شدہ تھی۔ میں باپو کو اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ پہلے تو کسی کے ہاں سرے سے نہیں جاتے۔ اگر جائیں تو واپسی کا وقت جانے سے پہلے طے کر کے جاتے ہیں۔ جاتے جاتے جسونت نے مجھے کہا، میرے نال گُج تے گل کر پُترا، خورے کدے تیری اواج سناں گا وی یا نیں۔ (میرے ساتھ کچھ تو بات کر و بیٹے۔ پتہ نہیں کبھی میں تمہاری آواز سنوں گا بھی یا نہیں) میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی آہستگی سے کہا، بابا جی ست سری ا۔ وہ تو جیسے کِھل اٹھا۔ اس نے بڑی شدت سے گلے لگاتے ہوئے مجھے کہا، اگر مجھے بابا کہا ہے تو اس رشتے کی لاج بھی رکھنا پُتر۔ تو میرے لیے میرے بلبیر سے بھی بڑھ کر ہے۔ آج میرا بلبیر تمہارے کرموں زندہ ہے۔ اس کے بعد بلبیر نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا، بلبیر کی ماں نے میرا ماتھا چوما۔ پھر بلبیر کے گھر والوں نے میری قدم بوسی کی اور ہمیں تانگے پر بیٹھنے میں مدد دی۔ بلبیر، جسونت اور ان کے گھر والوں نے بار بار باپو کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا تانگہ روانہ ہوا۔ سب لوگ ہمیں اتنی دیر تک جاتا ہوا دیکھتے رہے جب تک تانگہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔

باپو اور میں نے جھونپڑی تک کا سفر تانگے میں بڑی خاموشی سے طے کیا تھا۔ جھونپڑی کی ناہموار اونچائی کی وجہ سے تانگہ آگے جانے سے قاصر تھا، اس لیے اس کے دامن میں رک گیا۔ کوچوان نے ہمیں تانگے سے اترنے میں مدد دی اور پرنام کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ ہم جھونپڑی کی طرف جانے والی اونچائی چڑھنے لگے۔ سورج مغرب کی آخری حد میں دن کو الوداع کہتا ہوا کل تک کے لیے رخصت ہو رہا تھا۔ سندر بن کے باسی بھی شاید ہماری طرح تھک ہار کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا رہے تھے۔ میں جھونپڑی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کالی میرے بستر پر دھرنا مارے بیٹھی تھی۔ جب سے میں نے سکول جانا شروع کیا تھا میری عادت تھی کہ سکول سے واپسی پر گھر کے اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے کالی کو پیار کرتا۔ آج بھی اگر میں سکول سے سیدھا گھر آتا تو اب سے کم از کم تین گھنٹے پہلے پہنچ چکا ہوتا۔ کالی کو شاید وقت کا اندازہ تھا۔ آج میرے دیر سے آنے کی

وجہ سے کالی بے چین تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر کالی نے میرے بستر سے ایک لمبی زقند مجھ تک لگائی اور ہوا میں لہراتی ہوئی میرے کندھوں پر آ پڑی۔ میں نے اسے ہاتھ سے سہلایا اس کا منہ چوما اور اسے کسی مفلر کی طرح اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ کالی نے اپنا منہ اپنی زبان میرے گال پر رکھ دی۔

باپو نے جسونت سنگھ کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق جے پور سے ہے۔ وہ ہیروں کے سوداگر ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے کئی مہنگے ہوٹلوں میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہندوستان کے ہر خوبصورت علاقے میں ان کا کم از کم ایک بنگلہ ضرور ہے۔ پاہیرالہ میں ان کا چھٹیاں گزارنے کا بھی ایک بنگلہ ہے۔ وہ ہر سال بہار کی چھٹیاں گزارنے یہاں آتے تھے۔ امسال بھی پتا کے علاوہ سارا خاندان آیا تھا۔ بلبیر کا پتا، جسونت سنگھ، حادثے کی خبر سن کر دلی سے آیا تھا۔ بلبیر ان کا تین بہنوں کے بعد اکلوتا لڑکا ہے۔ بلبیر کی پیدائش تین بہنوں کے بعد بڑی منتیں ماننے کے بعد ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش کے وقت ایک جوتشی کو بلا کر بلبیر کی زندگی کی فال نکلوائی گئی تھی۔ جوتشی نے انہیں بتایا تھا کہ بلبیر کی ساری زندگی بہت اچھی اور آرام وسکون سے گزرے گی۔ صرف جوانی کے دنوں ایک بار میں اس کی زندگی کو ایک بہت بڑے مورکھ سے خطرہ لاحق ہوگا۔ لیکن ایک پر بھواس مورکھ سے بلبیر کو بچائیں گے۔ بلبیر کے گھر والوں کو اس بات کا یقین تھا کہ جوتشی نے بلبیر کی پیدائش پر کل کے واقعہ کی پیش گوئی کی تھی اور میں ہی وہی پر بھو ہوں جس نے بلبیر کو مورکھ ناگ سے بچایا تھا۔ قانون کی ڈگری کا طالبعلم ہونے کے ساتھ ساتھ بلبیر اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شامل تھا۔

باپو بھی اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے، تمہارے جھیل پر آنے سے پہلے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں تمہاری کسی بچگانہ حرکت پر مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ میں ابتدا میں تمہارے بارے میں خوفزدہ بھی تھا کہ شاید تم اپنی کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری نبھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے لیکن تم نے میری لاج رکھی۔ تم نے کوئی ایسی چھچھوری حرکت نہیں کی جس سے تمہارا عکس دوسروں کی نظروں میں پامال ہوتا۔ تمہاری آمد سے پہلے وہاں پر موجود لوگوں کا تمہارے بارے میں جتنا عمدہ خیال تھا تمہارے آنے کے بعد وہ عمدہ ترین ہو گیا۔ آج میں نے تم میں ایک پُر وقار مرد کو دیکھا ہے۔ لگتا ہے کل اور آج کے درمیان تمہارے ذہن نے کئی دہائیوں کی مسافت طے کی ہے۔ میں اب بھی تمہارے چہرے پر وہی سنجیدگی دیکھ رہا ہوں جو ایک پُر وقار مرد کا خاصا ہوتی ہے۔ تمہارے آج کے ردِعمل نے مجھے فطرت کی اداؤں کا زیادہ قائل کر دیا ہے کہ فطرت اور وقت نے تم پر جو ذمہ داری اس کم عمری میں ڈالی ہے تم اس کے لیے تیار ہو۔

وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا اور اس عرصہ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے دسویں کے بورڈ کا امتحان شروع ہو گیا۔ نتیجہ آنے تک میں فارغ تھا اور اس دوران آگے پڑھنے یا نہ پڑھنے کے بارے میں بھی سوچنا تھا۔ اس سوچ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گاؤں میں صرف ہائی سکول تھا اور کالج پاہیرالہ میں تھا جو ہمارے گاؤں سے پندرہ میل دور تھا۔ تیس میل کا یہ دوطرفہ راستہ روزانہ اکیلے آنے اور جانے کا تھا اور نہ ہی کسی اور کے ساتھ۔ میرے کالج میں داخلے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ میں وہاں ہاسٹل میں رہوں اور یا پھر امی کے میکے میں۔ ہاسٹل میں دوسرے طلباء کے ساتھ رہنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا اور اس کی وجہ بھی کوئی اور نہیں میں ہی تھا۔ میں نہ ہی لڑکوں سے دوستی رکھتا تھا اور نہ ہی مجھے ان کی عادات سے کوئی لگاؤ تھا۔ دوسرے الفاظ میں آپ مجھے غیر سوشل بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہاسٹل میں یا کسی اور کے ساتھ رہنے کی جھجک کی دوسری بڑی وجہ کالی تھی۔ ہم دونوں نے اب تک ایک دن بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزارا تھا اور میں ایک لمبے عرصے کے لیے اس کے بغیر کہیں جانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جب میں نے سکول جانا شروع کیا تھا تو ابتدائی دنوں میں کالی صبح میری گردن سے ایسے لپٹ جاتی تھی جیسے وہ مجھے الوداع کہنے کی بجائے میرے ساتھ جانا چاہتی ہو یا مجھے جانے سے منع کرنا چاہتی ہو۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد اسے میرے سکول سے واپس آنے کے وقت کا اندازہ ہو گیا تھا تو وہ مجھے روزانہ بخوشی جانے دیتی تھی۔ جہاں تک امی کے میکے رہنے کا تعلق ہے تو وہ بھی کسی طور مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ لوگ مجھے جانتے ضرور تھے لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں ان کے ساتھ دو سال کا طویل عرصہ رہ سکوں۔ ایک شیش ناگ کے ساتھ ہاسٹل میں یا کسی کے گھر میں رہنے کا مطلب دوسروں کی زندگی کے ساتھ ساتھ کالی کی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ میں نے اپنے خدشات کا ذکر باپو سے کیا تو انہوں نے جواب دیا، میرے بچے، زندگی میں انسان کو اپنے کئے ہوئے ہر فیصلے کی کچھ نہ کچھ قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔ حصولِ علم کی قیمت کالی سے جدائی ہوگی اور کالی کی رفاقت سے علم ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تم کونسی قیمت دینے کے لیے تیار ہو؟ میں اس سلسلے میں تمہیں راستہ دکھا سکتا ہوں، تمہاری انگلی پکڑ کر راستے پر چلا نہیں سکتا۔

اساڑھ کا مہینہ جہاں گرمی اور حبس کا پیش خیمہ ہوتا ہے وہاں سانپ کاٹے کے مریضوں کی تعداد میں اضافے کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس ماہ ایک طرف تو سانپ اپنے اپنے جوڑوں کی تلاش میں اپنی اپنی بلوں سے نکلتے ہیں اور دوسری طرف سیاح اپنے اپنے گھروں سے نکل کر سندر بن کا رُخ کرتے ہیں۔ اسی لیے سانپ اور انسان ایک دوسرے سے اس ماہ سب سے زیادہ ٹکراتے ہیں۔ ہمارے ہاں سانپ کے کاٹے کے مریضوں کا سب سے زیادہ رش بھی اسی ماہ ہوتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا، باپو اور میں اپنی جھونپڑی میں حسبِ معمول سانپ کے مریضوں میں گھرے ہوئے تھے۔ باپو ایک نوعمر مریض کی کاٹ پر جھکے ہوئے تھے اور میں ایک سیاح خاتون کی کاٹ سے منکا ہٹا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ جھونپڑی کے باہر شور سن کر باہر جھانکا تو پانچ غیر ملکی گورے سیاحوں کی ایک ٹولی پر نظر پڑی جن میں دو عورتیں اور تین مرد تھے۔ یہ لوگ اپنی جیپ سے اتر کر جھونپڑی کی ڈھلان چڑھ کر ہماری طرف آ رہے تھے۔

میں تجسس کے عالم میں جھونپڑی سے نکل کر ان کی جانب بڑھا۔ سب سے آگے آنے والی ایک جواں سال پریشان حال لڑکی تھی۔ لڑکی بیس بائیس کے پیٹے میں ہوگی اور اس کے کالے اور شانوں تک لمبے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ انگریزی لہجے میں ہندی بولتے ہوئے کہنے لگی، شمان جی کنڈر ہے۔ میرے ڈیڈی کو سانپ کاٹا ہے۔ لیک پر لوگ بولا ہے کہ شمان جی سانپ ٹھیک کرتا ہے۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہوئی انگریزی میں اسکو بتایا کہ میں شمان کا بیٹا ہوں۔ پھر اس سے پوچھا کہ مریض کہاں ہے؟ پیچھے آنے والی بڑی عمر کی عورت نے میری انگریزی سے متاثر ہوئے بغیر کہا، ٹم بچہ لوگ ہے، ٹم اس کا علاج کرے گا؟ اسی دوران باقی تین سیاح بھی ہمارے قریب آ چکے تھے۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم، گنجے سر والے گورے نے موٹے شیشوں کی عینک لگائی تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی پر رکھا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں سانپ کی کاٹ کا خوف اور درد کا عکس صاف عیاں تھا اور اسے چلنے میں بھی خاصی دقّت ہو رہی تھی۔ میں اس کی جانب بڑھا اور اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ زخم سے ہٹا کر دیکھا اور پوچھا، آپ کو کوبرے نے کب کاٹا تھا؟ بوڑھے نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو اس کے منہ سے آواز کی بجائے جھاگ نکلنے لگی اور جس پر ایک جھرجھری طاری ہوگئی۔ ساتھ ہی اس کے گھٹنے ایسے مڑنے لگے جیسے گھٹنے اس کے بدن کا بوجھ سہارنے سے انکار کر رہے ہوں۔ اس کا بدن اس کے گھٹنوں کے ساتھ زمین کی طرف جھکنے لگا تو میں نے اسے اپنے سہارے پر کھڑا رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا بھاری جسم میرے ہاتھ سے پھسلتا ہوا زمین بوس ہونے لگا۔ اس کے ساتھ آنے والوں نے اسے سہارا دینے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ڈھلکتا ہوا ہمارے سامنے زمین پر لیٹ گیا۔ مریض کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ساتھ آنے والوں نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

اس سے پہلے کہ سب مل کر اسے اٹھاتے، میں نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا، اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ جھونپڑی کے اندر لے جانے میں وقت ضائع ہوگا۔ پھر میں نے اپنا پہلا سوال چاروں روتے ہوئے سیاحوں سے مخاطب ہو کر دوبارہ پوچھا، اس کو کوبرے نے کب کاٹا تھا؟ ساتھ آنے والے نوجوان نے روتی ہوئی آواز میں اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے جواب دیا، کوئی ڈس پندرہ منٹ پہلے۔ اسے شاید اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے کاٹ دیکھ کر سانپ کا نام کیسے بتا دیا تھا۔ یہ وقت کسی کی حیرت دور کرنے کا بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ کاٹ ابھی تازہ ہے اس لیے مریض کے بچنے کے امکان کچھ زیادہ ہیں۔ کوبرے کا زہر انسان کو کاٹ کے آدھ گھنٹے کے اندر ختم کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کاٹ کلائی کی پشت پر تھی جہاں گوشت اور رگیں کم اور ہڈیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے سانپ کے دانت زیادہ گہرے نہیں جا سکے ہونگے۔ سانپ کو زہر بنانے میں کافی توانائی صرف کرنا پڑتی ہے اسی لیے سانپ اپنا زہر غیر ضروری طور پر استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے اور اسے صرف اور صرف اپنے شکار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جس طرح سانپ کاٹ میں زہر داخل کرتا ہے، وہ زہر واپس چوس بھی سکتا ہے۔ کھانے کے دوران اکثر سانپ اپنے شکار سے باقی ماندہ زہر واپس چوس لیتے ہیں۔

میں نے زمین پر لیٹے ہوئے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر کاٹ کا زخم دیکھا تو مجھے اور بھی تسلی ہوگئی۔ کاٹ کا زخم گہرا نہیں تھا لیکن لمبا ضرور تھا۔ اگرچہ گہرے زخم میں زیادہ زہر داخل ہوتا ہے درد کے باوجود اس پر منکا آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور گہرے زخم سے زہر چوس کر نکالنا بھی قدرے آسان ہے۔ لمبے زخم پر منکا نہیں ٹکتا اور لمبا زخم چوس کر زہر نکالنے کے لیے ناموزوں ہوتا ہے۔ لمبے زخم سے زہر نکالنے کے لیے سانپ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ڈسنے والے سانپ یا اسی خاندان کے سانپ کا استعمال یا کاٹنے والے سانپ سے زیادہ زہریلے سانپ کا استعمال بہت ضروری ہوتا ہے۔ کم زہر والے سانپ اگر یہ زہر چوس لیں تو مر جائیں۔ سانپ سدھائی جانے والی بلا نہیں اس لیے یہ طریقۂ علاج تقریباً موقوف ہو چکا ہے۔

چونکہ اس مریض کو کوبرے نے کاٹا تھا اس لیے کوئی کوبرا ہی یہ زہر واپس چوس سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر کالی کسی طرح زہر زخم سے چوس لے تو کیسا رہے گا؟ لیکن میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ سچ ہے کالی سے میرا جذباتی لگاؤ تھا۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے اس کے باوجود کالی ایک سانپ ہے اور سانپ کی فطرت کاٹنا ہے۔ اگر کالی نے مریض کے زخم سے زہر چوسنے کی بجائے کاٹ لیا تو مریض کے بچنے کے جو آثار اب تک تھے وہ بھی نہ رہیں گے۔ میں نے اپنے تمام خدشات کا اظہار باقی ماندہ سیاحوں کے سامنے کر دیا اور انہیں وہاں ٹھہرنے کا کہہ کر جھونپڑی کے اندر جا کر کالی کو اپنے گلے میں کسی گلوبند کی طرح ڈالا اور ان کے قریب لے آیا۔ اس سے میری مراد مریض کے لواحقین سے کالی کا تعارف کروانا تھا۔ لڑکی نے میرے گلے میں کالی کو دیکھا تو خوف سے چیخ مار کر لمبے اور پتلے آدمی کے پیچھے جا چھپی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا ان کی جانب بڑھا اور ان سے کالی کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ لڑکی نے مرد کے پیچھے سے گردن نکال کر پہلے مجھے اور پھر کالی کو دیکھا۔ پھر متجسس نظروں سے میری زبان سے کالی کا تعارف بڑے غور سے سننے لگی۔

میں نے ان سے کالی کا تعارف کراتے ہوئے کہا، اس دنیا میں میرا کالی کے علاوہ کوئی اور دوست نہیں اور میں کالی پر اتنا ہی بھروسہ کرتا ہوں جتنا کوئی اپنی ماں پر کرتا ہے۔ مریض کا اس وقت صرف اور صرف یہی طریقۂ علاج ہے کہ کالی مریض کی کاٹ پر منہ رکھ کر اس میں داخل ہونے والا زہر واپس چوس لے اور یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ میں یہ علاج کروں یا نہ کروں۔ کیوں کہ تمہارے مریض کے پاس وقت بہت کم ہے، اس لیے یہ فیصلہ تمہیں اگلے چند لمحوں میں ہی کرنا ہوگا۔ ساتھ آنے والی بوڑھی عورت نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو جلدی سے کر لو۔ میں مزید وقت ضائع کیے بغیر زمین پر لیٹے ہوئے مریض کے قریب کالی کو اپنی گردن میں لئے زمین پر بیٹھا اور مریض کا داہنا ہاتھ

ہتھیلی کے بل اس کے پیٹ پر رکھا جس سے کاٹ کا زخم اور زیادہ واضح ہو گیا۔

باقی چاروں سیاح ہم پر جھکے میری ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں روشنی کے لیے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہونے کو کہا، کالی کا منہ چوما اور اسے کاٹ کا زخم دکھاتے ہوئے کہا، کالی جی اس آدمی کو کسی کوبرے نے کاٹا ہے تم اس کا زہر چوس کر اسے تکلیف سے بچاؤ۔ اس کے ساتھ ہی کالی کا منہ سانپ کی کاٹ پر رکھ دیا۔ کالی نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زخم پر منہ رکھا اور سرپ سرپ کی آواز کے ساتھ زخم چوسنے لگی۔ زخم چوسنے سے سرپ سرپ کی آواز بالکل ایسے نکلتی ہے جیسے گرم گرم چائے پینے والے آواز نکالتے ہیں۔ آواز سن کر مجھے اتنی تسلی ضرور ہوئی کہ کالی کم از کم اسے کاٹ نہیں رہی تھی۔ جس وقت کالی اپنے کام میں مصروف تھی میں نے چاروں سیاحوں کی طرف دیکھا جو اپنی بھیگی پلکوں سے یہ حیران کن منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا، مجھے یقین ہے کہ کالی مریض کی رگوں سے زہر چوس رہی ہے اس لیے مریض کو اپنی رگوں میں خون ٹھہرتا ہوا محسوس ہو رہا ہوگا۔ بس آپ اپنا حوصلہ برقرار رکھیں۔ چاروں کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے اس لیے کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر میں مریض کے چہرے کی نیلاہٹ سرخی میں تبدیل ہونے لگی۔ بوڑھے نے پہلے ہلکی آواز سے کراہنا شروع کیا پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے زمین پر لیٹنے کا احساس ہوا۔ اس نے غیر ارادی طور پر زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنا چاہی تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں لیٹے رہنے کی تاکید کی۔ اس نے میری بات مان تو لی لیکن وہ اپنی اس حالت پر حیرت زدہ لگ رہا تھا۔ ایک منٹ میں کالی نے اپنا منہ زخم سے ہٹا دیا اور اچھل کر میری گردن میں جھولنے لگی۔ میں نے کالی کو ایک طرف چھوڑ دیا۔ میرے ہاتھوں سے نکل کر کالی نے اپنی بل کی راہ لی۔ میں نے مریض کو سہارا دیتے ہوئے اٹھنے کو کہا تو وہ اپنی کلائی کے زخم کو دوسرے ہاتھ سے مسلتا ہوا آہستگی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے اسے دوسری طرف سے سہارا دے کر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ ساتھ آنے والی عورت نے آگے بڑھ کر اس کے کپڑے جھاڑنا شروع کر دئے اور لڑکی اپنے رومال سے اس کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پونچھنے لگی۔ ان چاروں کی آنکھوں میں آنسو تھے، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔

Fascinating, Amazing, Interesting

مریض کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ہم سب کو دیکھا جیسے وہ بھی سب کچھ جاننا چاہتا ہو کہ بے ہوشی کے دوران اس پر کیا بیتی تھی۔ لیکن اس پر توجہ دینے کی بجائے، اس کے چاروں ہمراہی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ سیاحوں کی آنکھیں پھٹی تھیں اور منہ حیرت کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ لمبے اور پتلے آدمی کے منہ سے نکلا،

This was the most fascinating experience of my life. "I have seen, heard and witnessed snakebites, but i have never seen or heard that snakes can suck backvenom from victims.

میں نے انہیں جھونپڑی کے اندر آ کر بیٹھنے کو کہا۔ اندر آ کر لڑکی اور عورت باپو کے بستر پر بیٹھ گئے اور نوجوان پاس پڑے ہوئے ایک تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ باپو اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھے تھے۔ مریض اور لمبا آدمی باپو کے پاس رکھے ہوئے ایک تخت پوش پر جا بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی لمبے آدمی نے مریض کو اس کے بے ہوش ہونے کے بعد سے اب تک کی روداد سنائی تو اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثر کو دیکھ کر پختہ عمر کی عورت کہنے لگی، اگر ہم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو ہم کبھی بھی اس بات پر یقین نہ کرتے۔ پانچوں سیاح سانپ کی کاٹ اور کاٹ کے زخم کو بھول کر اب تک محوِ حیرت تھے۔

ان میں ایک جواں سال لڑکا بولا، کیا میں تمہاری عمر پوچھ سکتا ہوں؟ میں نے جواب دیا، میں سترہ سال کا ہوں۔ تم انگریزی بھی جانتے ہو، ساتھ آنے والی بوڑھی عورت نے کہا، تمہیں یہ سب کچھ کس نے سکھایا ہے؟ پکی عمر کے گنجے اور پتلے مرد نے سوال کیا؟ اور تم نے یہ سب کچھ اس اعتماد سے کیا جیسے کوئی معمولی سی بات ہو، نوعمر لڑکی بولی۔ وہ میرا جواب سنے بغیر سوال پر سوال کئے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کس کو پہلے جواب دوں کہ مریض نے میری مشکل آسان کر دی۔ کہنے لگا لڑکے ہمیں معاف کرو۔ ہم تم پر سوالات کی بوچھاڑ کرتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے طریقہ علاج نے ہمیں تقریباً گنگ کر دیا ہے۔ چند منٹ پہلے میں اپنی زندگی کے آخری سانس برقرار رکھنے کی بمشکل کوشش کر رہا تھا۔ اور اب میں تمہارے سامنے ایسے بیٹھا ہوں جیسے چند لمحوں پہلے والا کوئی خوفناک سا خواب تھا۔ وہ سانس لینے کے لیے چند لمحوں کے لیے رکا اور مجھے اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا، چلو پہلے ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں باقی باتیں بعد میں کریں گے۔

مریض نے سب سے پہلے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا، میرا نام ٹام ہے۔ میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں کیمیا کا پروفیسر ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی ڈانا ہے، اس نے ادھیڑ عمر کی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا۔ اس کے بعد اس نے بیٹی جینا سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ لنڈن کالج میں فلسفے کی طالبہ ہے۔ وہ نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، یہ میرا بیٹا مائیکل ہے۔ یہ لنڈن میں قانون کا طالبعلم ہے۔ یہ میرا بھائی رچرڈ ہے، ٹام نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے گنجے اور لمبے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رچرڈ پاہیرالہ میں رہتا ہے۔ ہم برطانیہ سے چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں اور میرا بھائی ہمیں سندر بن لے کر آیا تھا۔ ہم لوگ سیر کرتے پھر رہے تھے کہ مجھے ایک خوبصورت جنگلی پھول دکھائی دیا، میں نے تجسس میں بڑھ کر پھول کو ابھی ہاتھ ہی

لگایا تھا کہ ایک کوبرے نے میری کلائی پر کاٹا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ظالم کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے ہمیں یہاں آنے کو کہا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہارے سامنے ہوا۔ اب تم اپنا تعارف کراؤ۔

میرا نام رامو ہے اور وہ میرا باپو ہے، میں نے باپو کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتایا۔ اور ہم دونوں یہاں رہتے ہیں۔ میں اپنا مختصر تعارف کرا کے چپ ہو گیا۔ بس اتنا مختصر سا تعارف؟ تم نے ہمیں اتنا متاثر کیا ہے لڑکے، کہ نہ صرف میں بلکہ ہم تمام تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ اچھا ہم لوگ ایک ایک کر کے سوال کرتے ہیں اور تم اس کا جواب دیتے جاؤ، ڈانا نے کہا، تم نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا ہے؟

باپو سے، میں نے سامنے بیٹھے ہوئے باپو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تم بہت کم بولتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے انگریزی بولنا کہاں سے سیکھا ہے، رچرڈ نے پوچھا؟

سکول سے انگریزی لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھا ہے۔

تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو، جینا نے سوال کیا؟

میں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا ہوا ہے، نتیجہ ابھی نہیں نکلا۔

تم نے اور تمہاری کالی نے میری جان بچائی ہے اور تم اب بھی ایسے بیٹھے ہو جیسے تم نے معمولی کام کیا ہو، ٹام نے کہا۔

میں نے آپ کی زندگی نہیں بچائی۔ اگر آج آپ نے مرنا ہوتا تو میں تو کیا، دنیا بھر کے لوگ کوشش کے باوجود بھی آپ کو نہ بچا سکتے۔ ہر انسان اس دنیا میں اپنا اپنا دانہ پانی لے کر آتا ہے۔ آپ کا وقت نہیں آیا تھا اس لیے آپ کے بچنے کی سبیل کالی اور میرے ہاتھوں سے ہوئی اور بس، میں نے جواب دیا۔

ارے تم تو فلسفی بھی ہو، ٹام کی بجائے جینا بولی۔

باپو اس وقت دور بیٹھے خاموشی سے ہماری باتیں ہی سن رہے تھے۔ انہوں نے اب تک ہماری کسی بات میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ باپو اس وقت تک کسی سے بات نہ کرتے تھے جب تک کوئی انہیں مخاطب نہ کرتا۔ باپو سے ہی میں نے، مت بولو جب تک تم سے کوئی نہ بولے، والا محاورہ سیکھا تھا۔ ٹام نے باپو سے پوچھا، شان جی آپ نے اپنے بچے کی حیرت انگیز حد تک اچھی تربیت کی ہے۔ اس دور دراز کے غیر ترقی یافتہ دیہات میں رہ کر آپ نے اس بچے کو کسی بھی بڑے ملک میں رہنے والے باپ سے بھی بہت زیادہ سکھایا ہے۔ اس تربیت میں میرے رامو کا زیادہ دخل ہے، ٹام بابو۔ یہ ہر کام بڑی لگن اور ذمہ داری سے کرتا ہے، باپو نے بڑے فخر سے اسے جواب دیا۔

ٹام کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ڈانا اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹام کے قریب آ کر ہولے سے اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر واپس جا کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ ٹام نے اپنا سر ایسے ہلایا جیسے اس نے ڈانا کی بات سمجھ لی ہو۔ پھر وہ باپو سے کہنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں علاج کی فیس دینا بھول جاؤں، آپ مجھے اپنی فیس بتا دیں۔ ہم اپنے کام کی کسی سے کوئی فیس نہیں لیتے، باپو نے کہا۔ ٹام کے ساتھ باقیوں کے چہروں پر حیرت کے آثار پہلے سے کچھ اور سوا ہو گئے۔ اگر تم کسی سے فیس نہیں لیتے تو تمہارا گزارا کیسے چلتا ہے؟ رچرڈ نے حیرت سے پوچھا۔

باپو بولے، سندر بن ہمیں کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے اور جہاں تک پہننے کا تعلق ہے تو قریب کے گاؤں والے ہمیں کبھی کبھار کپڑے دے جاتے ہیں۔ ان تین چیزوں کے علاوہ باقی اخراجات بھی تو ہیں، وہ خرچ کیسے پورے ہوتے ہیں؟ جینا باپو کے قریب جا کر بولی۔ میری بچی، انسان اپنی چادر جتنی چاہے پھیلا دے اور جتنی چاہے تنگ کر دے۔ ہم نے اپنی ضروریات کا دائرہ بہت ہی محدود رکھا ہے، باپو نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ اس بوڑھے نے کیسی سچی بات کہی ہے، واقعی ہم لوگوں نے اپنی ضروریات کو خود ہی لامحدود کیا ہوا ہے۔ ڈانا حیرت سے بڑبڑائی، لیکن اس کی حیرت بھری بڑبڑاہٹ صاف سنی جا سکتی تھی۔
مجھے بتاؤ کہ سانپ کی کاٹ دیکھ کر تم نے کاٹنے والے سانپ کا نام کیسے بتا دیا؟ مائیکل نے میرے کاندھے کو ہلا کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جس طرح انسانوں کے دانت مختلف ہوتے ہیں اس طرح سانپوں کے دانت بھی جداگانہ ہوتے ہیں، میں نے جواب دیا۔ ڈانا بے ساختہ بولی How Interesting

رچرڈ کہنے لگا، ہم اتنی ترقی یافتہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی کس قدر انجان ہیں۔ آج سے پہلے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہر سانپ کی کاٹ کسی انسانی کی انگلیوں کی چھاپ (Finger Prints) کی طرح اہوتی ہے۔ اور یہ زہر واپس چوسنے کا عمل بھی ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سانپ اپنا زہر واپس چوسنے کی بھی اتنی ہی قدرت رکھتا ہے جتنی قدرت زہر داخل کرنے کی۔ میں نے جواب دیا، بالکل ہم ایسے جیسے ہم سانس لیتے اور نکالتے ہیں یا ہم کچھ کھا کر قے کر کے نکالتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ میں نے سانپ کے اس عمل کے بارے میں آج تک کسی کتاب میں کیوں نہیں پڑھا؟ ٹام نے باپو سے سوال کیا۔ باپو بولے، سانپ کا دماغ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور یہ سدھایا بھی نہیں جا سکتا اس لیے یہ طریقۂ علاج کتابوں میں لکھا ہوا نہیں ملتا۔ اگر ایسی بات ہے تو آپ نے اس سانپ کو کیسے سکھایا؟ تمہارے سانپ نے ہماری موجودگی میں میرے ڈیڈی کا زہر واپس چوسا تھا، مائیکل نے کالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باپو سے پوچھا۔ کالی اس وقت اپنی بل سے سر نکالے ہم سب کو دیکھ رہی تھی۔ مائیکل نے یہ سوال چونکہ باپو سے کیا تھا اس لیے میں نے جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ کالی کا رامو سے ایک خصوصی رشتہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ کالی نے رامو کو کسی ماں کی طرح پالا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اگر تم کالی سے وہی کہو جو رامو نے کہا ہے تو کیا کالی تمہارا کہنا بھی اسی طرح مانے گی؟ ڈانا نے باپو سے سوال کیا۔ مجھے نہیں معلوم بی بی، باپو نے جواب دیا۔

ٹام کہنے لگا، دیسی لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ یہ

لوگ اپنے بارے میں بڑی بڑی بڑکیں مارتے ہیں۔لیکن اس کے برعکس تم دونوں حیرت انگیز طور پر صاف گو ہو۔ میں نے تمہارے کسی بھی جواب سے کوئی غرور اور تکبر محسوس نہیں کیا۔تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کوئی بڑ بھی نہیں ماری۔اور معاف کرنا دیسی لوگوں کی دوسری یہ بات بھی مجھے ناپسند ہے کہ اگر محفل میں بیٹھے چار دیسی لوگوں میں سے کسی ایک سے کوئی سوال کیا جائے تو چاروں کے چاروں جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے برعکس یہاں ہم جس سے سوال کرتے ہیں وہی جواب دیتا ہے دوسرا خاموشی سے سنتا ہے اور تمہارا ہر جواب مختصر اور مدلل ہوتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا،اس کم عمری میں اتنی فراست میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔تم میں بہت کچھ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔اچھا یہ بتاؤ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میں بڑا ہو کر صرف ایک انسان بننا چاہتا ہوں، میں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ڈانا نے میرے جواب کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے کہا،لڑکے تم نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ ہم لوگ ڈاکٹر، وکیل، سائنسدان، سیاست دان اور نہ جانے کیا کیا بن کر بھی انسانیت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

تم نے اتنی اچھی باتیں کرنا کہاں سے سیکھا ہے؟ جینا نے مجھ سے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ کتابوں سے اور باپو سے، میں نے اپنی گردن سے باپو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔اس جنگل میں تمہیں پڑھنے کے لیے کتابیں کہاں سے میسر آتی ہیں؟ رچڑ ڈ بولا۔ میں نے جواب دیا، اپنے سکول کی لائبریری سے۔ ٹام نے باپو سے مخاطب ہو کر کہا، اور آپ نے یہ سب کچھ کس سے سیکھا ہے شان جی؟ باپو ایک لمبی سانس لے کر بولے، عمرِ رفتہ سے بہتر کوئی کتاب اس دنیا میں نہیں ہے صاب۔ ہمارے آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں، بائیں یہ کتاب ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ اگر اسے پڑھنے والا ہو تو یہ کتاب زندگی کے ہر پہلو کا سبق دیتی ہے۔تم نے سچ کہا ہے شان جی، تجرباتِ روز و شب سے بہتر کوئی کتاب نہیں، رچڑ ڈ نے باپو کی تائید کرتے ہوئے کہا۔لیکن اس کتاب کو پڑھتا کون ہے؟ ہم سب اس کتاب کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ دوسروں کے لیے ہے۔ تجربے کی کتاب کو آنکھوں سے نہیں دل اور دماغ کی آنکھ سے پڑھا جاتا ہے بابا۔انسان دل و دماغ کا استعمال کرتا ہی کہاں ہے؟ باپو بولے۔کیا بات کہی آپ نے شان جی، ڈانا جذباتی لہجے میں بولی۔ مائیکل باپو سے کہنے لگا۔ آپ کی مثبت سوچ پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ باپو نے دروازے سے باہر ہرے بھرے پودوں کو دیکھ کر کہا، چند ماہ پہلے یہ پتے زرد تھے اور پودے مردہ، لیکن آج یہ سرسبز ہیں۔ خزاں ایک طرف گلستاں کی بربادی کا پیغام لاتی ہے اور دوسری طرف نئی بہار کی نوید۔ یہ سوچنا انسان کا کام ہے کہ وہ عارضی خزاں کو دیکھ کر غمگین ہوتا ہے یا آنے والی بہار کو خوش آمدید کہنے کی تیاری کرتا ہے۔ واہ واہ شان جی، کیا بات کہی، ٹام باپو کے جواب سے گویا تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔

مائیکل نے ہاتھ کے اشارے سے باپو کی توجہ شیشے کے جاروں کی طرف مبذول کراتے ہوئے پوچھا، آپ اور کس کس بیماری کا علاج کرتے ہیں؟ باپو بولے، میں کوئی طبیب و بیب نہیں ہوں بچے۔ ان جاروں میں سانپوں کے منکے ہیں۔ ہم یہاں صرف اور صرف سانپوں کی کاٹ کا علاج کرتے ہیں۔ اور بس۔ وہ منکوں کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ باپو نے اسے کچھ دیر تک منکوں پر لیکچر دیا۔اس کے بعد رچڑ ڈ نے زہر بجھے کانٹوں کے بارے میں پوچھا تو باپو نے اس کے بارے میں بھی تھوڑی سی روشنی ڈالی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سانپ کے زہر سے اپنے جسم کو Immune یعنی عادی کرتے ہو تب جا کر سانپوں کی کاٹ کا علاج کرتے ہو؟ ڈانا نے پوچھا۔ ہاں بی بی ان بے پیر سانپوں کا کھیل کوئی آسان تھوری ہے، باپو بولے۔ تمہارا جسم بھی اس زہر کا عادی ہے اور اگر کوئی سانپ تمہیں کاٹے تو اس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا؟ مائیکل نے مجھ سے پوچھا۔ جی ہاں، میں نے اپنا جواب مختصر ہی رکھا۔

اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہارے سانپ کو ہاتھ لگاؤں تو یہ مجھے کاٹے گا تو نہیں؟ میں نے آج تک کبھی کسی سانپ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کسی سانپ کو ہاتھ میں لے کر پیار سے سہلانا میری زندگی کی کئی خواہشوں میں سے ایک خواہش ہے، جینا نے قریب بیٹھی ہوئی کالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں نے کالی کی طرف دیکھ کر تالی بجائی، تو کالی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک لمبی زقند لگائی اور تقریباً اُڑتی ہوئی میری گردن پر جھول گئی۔ میں نے جینا سے کہا، اب تم اس کو ہاتھ لگا سکتی ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کالی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو کالی نے اپنا منہ اٹھا کر جینا کی طرف دیکھا۔ جینا نے ڈر کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ سانپ اسے کہیں کاٹ نہ لے۔ کالی نے اپنا رُخ جینا کی طرف کیا جیسے اس کے پاس جانا چاہتی ہو لیکن جینا ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں کالی کو جانتا ہوں، یہ اس کا اندازِ محبت تھا۔ وہ میری طرف بھی ایسی ہی نظروں سے دیکھتی تھی۔ جینا پیچھے ہٹی تو کالی نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، اب تم ہی اس کا ڈر دور کرو۔

میں نے کچھ نہ سوچتے ہوئے کالی کو اپنے گلے سے اتار کر جینا کے گلے میں ڈال دیا۔ اپنے گلے میں سانپ دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے گویا سن ہو گئی اور اس کا رنگ فق ہو گیا۔ کالی نے اپنا منہ اُٹھا کر جینا کے گال پر رکھ دیا اور اپنی زبان نکال کر بار بار جینا کے منہ پر پھیرنا شروع کر دی جیسے اسے پیار کر رہی ہو۔ کالی کی اس ادا نے نہ صرف جینا کو موم کر دیا بلکہ اس کو توانائی بھی دے دی اور اس کا خوف بھی قدرے کم کر دیا۔ اس نے جھجکتے جھجکتے اپنا بایاں ہاتھ کالی کی پیٹھ پر رکھا تو کالی نے الٹ کر اپنا پیٹ جینا کے آگے کر دیا جیسے کہہ رہی ہو کہ میرا پیٹ سہلا دو۔ جینا کسی ایسی بچی کی طرح جس کو کھیلنے کے لیے اچانک اپنی پسند کا کھلونا مل گیا ہو، کالی کے بدن کو سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ پھر اس نے کالی کو سر سے پکڑا اور کالی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے اور پھر جذباتی لہجے میں اپنے ماں باپ سے مخاطب ہو کر کہا، ممی، ڈیڈی دیکھا! میں نے سانپ کو کیسے چوما ہے؟

وہ جذبات کی رو میں یہ بھول گئی تھی کہ گھر والے اسے سانپ چومتے

ہوئے دیکھ رہے تھے۔اس کے والدین کے علاوہ اس کا بھائی اور چچا بھی اس کی ایک ایک ادا کو عجیب سی طمانت سے دیکھ رہے تھے۔کالی کبھی جینا کے بدن کا گھیراؤ کرتی تو کبھی ٹانگوں کا،کبھی وہ اس کے سر پر چڑھ کر اپنا سر مارتی اور کبھی وہ ہار کی طرح اس کی گردن سے جھولنے لگتی۔ جینا کی آنکھیں، ہاتھ،منہ، ہونٹ،اور پورا جسم گویا کالی کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوگیا اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر کالی سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔کالی بھی اس کے ساتھ کھیل رہی تھی جیسے یہ دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں اور یہ کھیل نہ جانے کب تک جاری رہتا اگر ہمارے ہاں سانپ کاٹے کا ایک اور مریض نہ آ جاتا۔مریض کو آتا دیکھ کر ان لوگوں کو شاید اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ وہ ہمارا وقت ضائع کر رہے تھے۔

ٹام نے نئے مریض کو آتا دیکھ کر کہا۔ہم نے ان شریف لوگوں کا کافی وقت لے لیا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہمیں اب جانا چاہیے۔لیکن جانے سے پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں جب بھی اس ملک میں آؤں گا آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔میں اپنی زندگی میں کسی سے اتنی تھوڑی دیر میں اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا جتنا تم دونوں سے ہوا ہوں۔تم دونوں حیرت انگیز خوبیوں کے مالک ہو۔میں تم سے بار بار ملاقات کرنا چاہوں گا۔ہمارے دروازے کسی کے لیے بھی کبھی بند نہیں ہوئے بابا۔آپ جب بھی چاہیں بغیر کسی اطلاع کے یا بغیر کوئی وقت لیے ہمارے پاس آ جائیں، باپو نے جواب دیا۔

ٹام نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، میں تم لوگوں کے رویے سے،تم لوگوں کے کام سے اور تم لوگوں کی بے لوث خدمتِ خلق سے کچھ اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔میں نے تم جیسے بے غرض لوگوں کے بارے میں اب تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا، اب میں ان سے ملنے کا مان بھی رکھتا ہوں۔پھر وہ میری طرف رُخ کر کے بولا، اور لڑکے،تم عمر میں ہم سب سے چھوٹے ہو لیکن میں تم میں کسی بڑے بوڑھے کا تدبر دیکھ رہا ہوں۔تم نے نہ صرف مجھ پر بلکہ میرے خاندان پر جو احسان کیا ہے یہ کبھی نہیں بھلایا جائے گا۔میں ابھی سانپ سے کھیلتے ہوئے اپنی بیٹی کا تمتماتا ہوا چہرہ پڑھ رہا تھا۔تم نے اسے جتنی خوشی ایک لمحے میں دی ہے، اتنی خوشی تو میں اس کا باپ ہوتے ہوئے اس کی بیس سالہ زندگی میں بھی نہیں دے سکا۔وہ عمر میں تم سے صرف تین سال بڑی ہے لیکن آج وہ تمہارے سامنے کسی ایک نومولود بچی کی طرح محوِ حیرت کھڑی ہے۔اس کے بعد ٹام نے بڑے جذباتی انداز سے مجھے گلے لگایا۔پھر ڈانا نے، رچرڈ نے اور مائیکل نے بڑی گرمجوشی سے باری باری مجھ سے اور باپو سے سرگرم قسم کا الوداعی مصافحہ کیا۔

جینا نے کالی کو اپنے گلے سے اتار کر اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا:

You not only saved my dad's life, you also stole my heart. Thank you. I will always remember you and I will come bake to visit you.

اس نے کالی کو ایک لمبا سا بوسہ دیا اور پھر میرے قریب آ کر اس نے کالی کو میری گردن میں ڈال کر اپنی گردن کے گرد ایسے لپیٹا جیسے ایک ڈور سے دو چیزوں کو باندھا جاتا ہے۔اس کی سانسوں کی مہک مجھے اپنے سانس میں محسوس ہونے لگی۔اس کی ناک میری ناک سے ٹکرا رہی تھی، اس کی پلکیں میری پلکوں سے، اور اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب رقص کرنے لگے تو اس نے ہولے سے کہا۔

’’وہ تو باکمال تھے!‘‘

(پی۔ٹی۔وی کے لیجنڈ، کثیرالجہات شخصیت جناب کمال احمد رضوی)

شگفتہ نازلی (لاہور)

تخلیقی آب و تاب کے وہ گلستان تھے۔۔۔
وہ تو خود اپنی ذات سے اک دبستان تھے۔۔۔
اور اپنے آپ میں کئی پہلو چھپائے تھے۔۔۔
تھے دیکھنے میں تنہا، سب خود میں سمائے تھے۔۔۔
اُن کا وسیع مطالعہ تھا، تحریروں کا نکھار۔۔۔
اور ہوتا دل نشین و سادہ طرز میں شمار۔۔۔
تصنیف اور تالیف کے تھے سلسلے رہے۔۔۔
انگریزی کتابوں کے تراجم بھی تھے کئے۔۔۔
طنز و مزاح کو اک نیا اسلوب تھا دیا۔۔۔
برجستہ اداکاری سے مسحور تھا کیا۔۔۔
’’اَلّن‘‘ بنے تھے خود اور ننھا رفیع خاور تھے۔۔۔
در پردہ جیتے جاگتے کردار تھے کئے۔۔۔
ٹی۔وی سے ’’سلسلہ جو الف نُون‘‘ کا چلا۔۔۔
تادیر دیکھنے میں وہ مقبول تھا رہا۔۔۔
اخلاص تھا سٹیج سے سو ڈرامے بھی لکھے۔۔۔
لکھتے رہے اور سب کے لیے پیش بھی کئے۔۔۔
’’منٹو ڈراما‘‘ اکلوتے کردار کا کیا۔۔۔
پرفارمنس سے اُس کی گو یا حق کیا ادا۔۔۔
تفریح کے ساتھ ساتھ تھا شعور بھی دیا۔۔۔
اور اُن کو سوچنے پہ تھا مجبور بھی کیا۔۔۔
کیا پہلو دار ذات تھی کیا باکمال تھے۔۔۔
جاگیرِ فن کے ہر طرف کیا کیا جمال تھے۔۔۔!

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ ساؤتھ امریکہ)

پروین شیر (امریکہ)

قسط......۲

نابینا بینا

وہ پو پھٹے ہوٹل سے باہر چہل قدمی کے لیے نکل رہی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر دربان اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اُس سے کہہ رہا تھا کہ اگر الپا کا کے فرکا سوئیٹر یا اسکارف وغیرہ خریدنا ہوتو اسے پونو شہر سے ہی خریدنا چاہیے کیونکہ یہ یہاں کی خاص پہچان ہے۔ پروین اُس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل گئی تھی۔ پونو شہر کے قدرتی حسن کو پی رہی تھیں اُس کی نظریں۔۔۔ہموار زمین بہت کم تھی۔شاید دو میل سے بھی کم۔لوگ پہاڑوں پر رہ رہے تھے۔ ہر طرف ڈھلوان گلیاں تھیں جن میں گاڑیاں نہیں چل سکتی تھیں۔غربت بھی چار سو نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں پر رہنے والے غریب ہیں لیکن قدرتی حسن کی دولت سے مالا مال۔۔۔جھیل ٹی ٹی کا کا دور سے چمک رہی تھی اور دعوت نظارہ دے رہی تھی۔سب کچھ اصل تھا لیکن یقین سے پرے تھا۔وہ پہاڑ پر ایک بل کھاتی ہوئی ناہموار سڑک پر جا رہی تھی۔ کہیں دور سے بہت سی پرسوز ساز کی آواز نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھی تھی اُس نغمے کی کشش بلا رہی تھی۔سڑک پر ایک نابینا موسیقار کوئی ساز بجا رہا تھا۔درد انگیز دھن سے فضاؤں کو مخمور کر رہا تھا۔سُر یلے، پرسوز نغمے پروین کو سرشار کر رہے تھے کیونکہ موسیقی اس کی روح کی غذا ہے۔وہ نابینا موسیقار باہر کی دنیا سے بے نیاز اپنی الگ دنیا میں کھویا ہوا تھا۔مگن تھا۔پرسکون تھا۔ پروین اُسے دیکھ رہی تھی اور اُس کی منفرد، اندرونی دنیا کے متعلق سوچ رہی تھی جس کا دروازہ کہیں اور کھلتا ہے۔وہ نابینا فنکار اپنے روایتی، شوخ رنگ لباس میں تھا۔اپنے ملک کے مدھر نغمے چھیڑ رہا تھا۔مسافر اُس کی طرف ایک نظر دیکھے بغیر اپنے راستوں پر جا رہے تھے۔ پروین وہیں کھڑی ہوئی اس کے میٹھے سُروں میں کھو چکی تھی۔اس کے مطمئن چہرے پر اندرونی بصارت کی طمانیت تھی جس سے کوئی دوسرا واقف نہ تھا۔ کچھ لوگ اس کی جسمانی معذوری پر رحم کھا کر کچھ پیسے اُس کے قریب رکھ رہے تھے۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ دنیائے دروں میں تو بصیرت کے اتنے تابناک چراغ روشن تھے کہ اس کے آگے دنیائے بیروں تاریک اور بے معنی تھی اُس نابینا کے لیے۔ پروین اُس انوکھے ساز سے نکلتی ہوئی دُھن کے رس کو نچوڑ کر اُس کی مٹھاس رگ و پے میں محسوس کر کے سرشار بھی تھی اور دوسرے راہ گیروں کی اس سے محرومی پر حیرت زدہ بھی تھی۔بے ساختہ اسے اپنی یہ نظم یاد آ گئی تھی:

اس کی بے نور آنکھوں کی اندھی گپھا
اک جہاں در جہاں
تھے اندھیرے وہاں بے کراں
بام و در پر تھا تاریکیوں کا تصرف جہاں
سارے ارض و سما
ماہ و انجم، پرندے، شجر، ندیاں
راستے، بند گلیاں، مکاں
سب اندھیروں کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے مگر
ذہن کے بند کمرے کی دیوار پر
اس نے کھولا دریچہ تو دیکھا نیا اک سماں!
رات ہاتھوں میں مہتاب کا جام تھامے ہوئے
چاندنی کی فضاؤں میں مدہوش ہوتی ہوئی
اس نے دیکھا، عروس سحر
نرم رنگین ریشم کا آنچل بدن پر سجائے ہوئے
اپنی کرنوں کی افشاں چھڑکتی ہوئی
جھومتی ڈالیاں
ندیاں اپنی دھن میں رواں
تتلیاں، پھول، قوسِ قزح
رنگ ہی رنگ تھے تا بہ حدِ نظر
ابر کی نرم چادر میں چھپتیں، نمودار ہوتیں
پرندوں کی کلکاریاں
سرخوشی، راحتیں
پرسکوں تھے نظارے
جو بے نور آنکھوں پہ مرہم لگاتے گئے
کیا خبر تھی کسی کو کہ تاریکیوں کے بھنور سے نکل کر اُسے
مل گئی ہے نئی روشنی۔۔۔!

دیارِ نغمہ و رقص

اتفاق سے پروین جس دن پونو پہنچی تھی اُسی دن Catholic Feast Day تھا۔جس کا جشن منانے کے لیے رقص و موسیقی کے پروگرام ہوتے ہیں۔دو دن اور دو راتوں تک خوشیاں منائی جاتی ہیں۔پورا شہر رقص، رنگین لہراتی ہوئی قباؤں اور نغمات میں ڈوب جاتا ہے۔سڑکوں پر رنگین ریشم کی قبائیں رقصاں بدن سے لپٹی ہوئی موسیقی کی دھن پر لہرا رہی تھیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔140 قسم کے رقص تھے اور مختلف قسم کے لباس۔سڑکوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہزاروں تماشہ بین تھے۔ ہر طرف الپا کا۔۔۔لاما۔۔۔ پیرو کے خاص مویشی کے Fur سے بنے ہوئے سویٹر، ٹوپیاں اور اسکارف برائے فروخت تھے۔غریب عورتیں اور مرد اپنی پیٹھ پر یہ سب کچھ لاد کر سیاحوں کے قریب منڈلا رہے تھے۔اُن کی طرف کوئی ایک نظر بے خیالی میں دیکھتا تو وہ دوڑ کر

قریب آ کر سامان کھول کر فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور اتنے اونچے پہاڑوں پر ہوائیں بہت جلد سرد ہونے لگتی ہیں۔ ایک عورت اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ سویٹر اور اسکارف اپنے بڑے سے تھیلے میں لیے ہوئے پروین کے قریب آ گئی تھی۔ اس کے بچے کی آنکھوں کی معصومیت نے پروین کو بے بس کر دیا تھا۔ اس عورت کے چہرے پر پیسے کمانے کی امید کی کرن کو دیکھ کر پروین بے چین ہو گئی تھی۔ اس لیے اس عورت سے اسکارف اور سویٹر خرید کر اُسے ایک انجانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔۔۔

دو دنوں تک رقص، موسیقی اور جلوس جاری تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں ساری رات موسیقی کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ وہ بھی اتنی پر زور کے لوگوں کے لیے سونا آسان نہ تھا۔ کمرے میں برقی ہیٹر تو تھا لیکن کام نہیں کر رہا تھا۔ پونو میں پانچ ستارہ ہوٹل میں بھی Heating System نہیں تھا۔ لیکن آکسیجن کا ٹینک ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ سردی کی تکلیف مٹانے سے زیادہ ضروری سانس لینے کی سہولت ہے۔ یہ تجربہ انوکھا تھا کہ پروین زینوں سے اتر کر ہوٹل کی میزبان سے دوسرے ہیٹر کی گذارش کرنے گئی تھی۔ اس نے کم از کم پندرہ ہیٹر نکال کر انہیں باری باری دیکھا اور جانچا تھا لیکن سب ٹوٹے ہوئے تھے۔ مجبوراً اس نے دو مزید کمبل نکال کر دے دیے۔۔۔ پونو شہر، پیرو میں سب سے زیادہ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے ایک بے حد چیلنج کا سامنا کرواتا ہے۔

پانیوں پر تیرے ہوئے گھروندے (Floating Islands)

علی الصباح اُٹھ کر پیدل بندرگاہ جانے کے لیے ایک خاص مقام پر جانا تھا جہاں سائیکل رکشے لینے تھے جسے وہاں ٹرائی سائیکل ٹیکسی کہتے ہیں جو صرف ایک Sole میں بندرگاہ تک لے جاتی ہے۔ ایک رکشے پر دو افراد بیٹھ سکتے ہیں اور رکشہ ڈرائیور کو ٹپس دینا ضروری ہوتا ہے۔ اُس رکشے پر بیٹھ کر وطن کے رکشے یاد آ گئے تھے۔ برسوں بعد یہ نظارہ ملا تھا۔ رکشے والا رکشہ یا ٹرائی سائیکل ٹیکسی دوڑائے جا رہا تھا۔ تنگ ناہموار گلیوں میں۔ ہر طرف سائیکل اور تین پہیوں کی ٹیکسی، وطن کے ٹمپو جیسی۔ ہواؤں میں وہی خوشبو۔۔۔ وطن جیسی، دل کے عالم کا کیا کہنا تھا۔ سب کچھ کتنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ بچپن کی یادیں ایک جال کی طرح دل سے لپٹی رہتی ہیں۔۔۔ سیاحوں کے پانچ رکشے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہر طرف لوگ اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے تھیلے میں کوکا کی پتیاں رکھے ہوئے تھے اور اُسے چباتے جا رہے تھے۔ صدیوں سے تیرہ ہزار فٹ سمندری سطح سے اوپر رہنے کے لیے یہ کوکا کی پتیاں ہی ان کی زندگی ہیں ان کی سانسیں ہیں۔۔۔ بندرگاہ پہنچ کر 35 فٹ کی اسپیڈ بوٹ (Speed Boat) پر سب سیاح اپنی اپنی سیٹ لے چکے تھے۔ بوٹ ٹی ٹی کاکا جھیل پر تیرتے ہوئے جزیروں کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ بوٹ پر کیرولینا کے علاوہ ایک نیا گائیڈ بھی تھا جو کہہ رہا تھا کہ جھیل ٹی ٹی کاکا دنیا کی سب سے بڑی جھیل ہے جو دو ہزار میٹر (تیرہ ہزار فٹ) سطح سمندر سے اونچی ہے۔ یہ جھیل پیرو (Peru) اور بولیویا (Bolivia) کی سرحد پر ہے۔

پروین دیکھ رہی تھی جھیل کا نیلا پانی اور اس سے بھی زیادہ نیلا کھلا آسمان۔۔۔ جھیل پہ چھوٹے چھوٹے نرسل سے بنائے گئے تیرتے ہوئے جزیرے (Floating Island) اور آسمان پہ چھوٹے چھوٹے بادلوں کے جزیرے تیر رہے تھے۔۔۔ خوبصورت پرندے نازک رنگین پروں کو پھیلائے ہوئے محو پرواز تھے اور ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ دور چھوٹی سی کشتی پر کوئی مچھلی کا شکار کر رہا تھا۔ بوٹ کے ڈرائیور کا نام لیس مانی تھا جو مائیکروفون تھامے ہوئے سیاحوں کو اس جھیل اور اُس پہ تیرتے ہوئے جزیروں کے باشندوں کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا کہ ٹی ٹی کاکا جھیل پر انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے جزیروں میں رہنے والے باشندے انکاز سے بھی قبل کے قبیلے ہیں یعنی Pre Incas ہیں۔ ان کی زبان وہی قدیم زبان ہے جس کا نام آئی مارا ہے۔ لیس مانی اپنے خاندان کا ایک دل چسپ واقعہ سنا رہا تھا کہ اس کی بہن کیچوا قبیلے کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی اور شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں نے یہ رشتہ توڑ دیا تھا کیونکہ وہ آئی مارا قبیلے کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ٹی ٹی کے معنی ہیں پہاڑی جنگلی بلی اور کاکا کے معنی ہیں پہاڑ۔ اس طرح اس جھیل کا نام ٹی ٹی کاکا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ جھیل دو ہزار میٹر زمین سے اوپر پہاڑ پر ہے۔ آئی مارا قبیلے اس جھیل کو Mother Lake کہتے ہیں۔ لیس مانی کی باتیں لوگ توجہ سے سن رہے تھے۔ دور بولیویا (Bolivia) کے بلند پہاڑوں کے سروں پر برف کا آنچل تھا۔ بوٹ کا سفر چار گھنٹوں سے زیادہ تھا۔

کچھ سیاح اور پروین لیس مانی سے سوالات کرتے جاتے تھے اور وہ جواب دیتا جاتا تھا۔ ٹی ٹی کاکا جھیل پر تیرتے ہوئے جزیروں کے متعلق وہ کہہ رہا تھا کہ وہاں 64 چھوٹے چھوٹے انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے جزیرے ہیں جو قدیم Andean تہذیب کی مثال ہیں۔ اب تک وہی پرانی رسم و روایت کو برقرار رکھ کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں آج بھی 11 ویں صدی قائم ہے۔ وقت یہاں تھم گیا ہے۔ ٹی ٹی کاکا جھیل پونو شہر کا دل ہے۔ سب سے اہم اور طلسماتی۔۔۔ پروین کی متجسس نگاہیں ششدر تھیں۔ ذہن و دل کے پیمانے رنگین، حسین اور اعجوبہ فضاؤں کی شراب سے لبالب ہو رہے تھے۔ چاروں طرف آسمان کو چھوتے ہوئے کوہسار، نیلم سی درخشاں جھیل، نرم و نازک رنگین پروں والے بادلوں کے جزیروں تک اڑتے ہوئے پرندے، وہ دنیا جیسے بے نظیر ارم۔۔۔ صدیوں پرانی، انوکھی، منفرد اور بے مثال دنیا۔ روح کو عجیب طلسم سے ہم کنار کرنے والی۔۔۔ جس کی قدیم تہذیب اور تاریخ صفحات پر منتقل نہیں کی گئی تھی۔ نیلگوں شیشے جیسے پانیوں پر تیرتے ہوئے جزیرے قریب آ رہے تھے۔ رنگین چھوٹے چھوٹے گھروندے۔ اب کیرولینا بول رہی تھی۔۔۔ ''یہاں تین ہزار یوروز (Uros) رہتے ہیں یہ قبیلہ انکاز سے بھی پرانا ہے۔ یہ لوگ دوسرے دشمن قبیلوں جیسے Collas اور Incas سے خود کو بچانے کے لیے دوران جنگ غلامی کے خوف سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ جھیل کے کنارے اپنی الگ تھلگ دنیا۔۔۔ تیرتے ہوئے جزیرے بنائے تھے پناہ لینے کو۔ یہاں ان کی نئی زندگی شروع ہوئی تھی جو ٹوٹورا نرسل (Totora Reeds) سے

جڑی ہوئی تھی۔ دنیا سے دور اور آسمان سے قریب۔''

سیاحوں کی بڑی سی انجن والی کشتی ایک چھوٹے سے Floating Island پہ رک گئی تھی۔ آس پاس بکھرے ہوئے رنگین چھوٹے چھوٹے 64 جزیرے نظر آرہے تھے۔ جو یوروس (Uros) قبیلے نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جو پیرو کی سب سے قدیم تہذیب کی نشانی ہے۔ صدیوں پرانی روایت اور تمدن یہاں آج بھی سانس لے رہا ہے۔ انکاز کے مطابق ان کے سورج خدا کی پیدائش اسی جگہ ہوئی تھی جس نے انکاز کی سلطنت قائم کروائی تھی۔ لیس مانی بتا رہا تھا کہ ان جزیروں پہ رہنے والوں کی اپنی کوئی اور زبان تھی جو مر گئی۔ کیونکہ مختلف قبیلوں میں شادیاں ہونے لگیں تھیں اور اب یہاں آئی مارا ہی زبان بولتے ہیں۔ ان 64 جزیروں پر تین سو (300) خاندان رہتے ہیں۔ یہیں Andes کی تہذیب پھولی پھلی تھی۔ یہ لوگ خود کو دنیا کی سب سے قدیم قوم کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سورج کے وجود میں آنے سے پہلے یہ لوگ یہاں موجود تھے۔ جب زمین بالکل تاریک اور سرد تھی۔ پروین کو یہ سب کچھ بہت شاعرانہ اور پراسرار محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ ان کا یہ Legend۔۔۔!

حیرت کدہ

جب پروین نے تیرتے ہوئے جزیرے پر قدم رکھا تھا ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی نرم میٹریس (Mattress) یا اسپنج (Sponge) پر چل رہی تھی۔ وہ تو کوئی اور ہی دنیا کوئی اور ہی سیارہ تھا۔ بالکل منفرد۔۔۔ زمین سے اتنی دور اکیلی بسی ہوئی یہ چھوٹی سی دنیا۔۔۔ قدرت کی آغوش میں۔۔۔ حقیقت ہوتے ہوئے بھی خواب سا سماں تھا۔ نرسل کی دنیا نیلے پانیوں پر حسین رنگوں کو اوڑھے ہوئے تیر رہی تھی جس کی پرچھائیاں شفاف پانی کے آئینے پر جھلک رہی تھیں۔ ٹوٹورا نرسل سے بنے ہوئے، ٹی ٹی کا کا جھیل پر تیرتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے گھروندے، گھروندے نہیں عجوبے ہیں۔ اور یہ ٹی ٹی کا کا جھیل بھی۔۔۔ جو Andes میں ہے۔ دنیا کے سب سے لمبے پہاڑوں کے سلسلوں پر۔۔۔ اینڈس جو سات ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے ساؤتھ امریکہ کے شمال سے جنوب تک۔ تقریباً 13 ہزار فٹ سمندری سطح سے اوپر۔۔۔ یہ جھیل۔۔۔ اپنی گود میں نرسل کی چھوٹی چھوٹی دنیا سمیٹے ہوئے اس دنیا سے دور۔۔۔ ساؤتھ امریکہ کی سب سے بڑی اور دنیا کی سب سے اونچی Navigable جھیل۔۔۔ پروین کی حیران نظریں دیکھ رہی تھیں۔۔۔ چھوٹے سے جزیرے پر نرسل کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے چند جھونپڑے تھے۔ جزیرے سے ملحق کناروں پر نرسل سے بنائی گئی کشتیاں تھیں۔ عورتیں اپنے صدیوں پرانے روایتی لباس میں تھیں۔ شوخ رنگوں کے لمبے اسکرٹ اور بلاؤز۔۔۔ سر پر ہیٹ۔ مرد پینٹ اور قمیص میں۔ اپنے اپنے جھونپڑوں کے سامنے اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے کرافٹ، پرس، ٹوپیاں وغیرہ سجائے ہوئے تھے جو برائے فروخت تھے۔ یہ سب کچھ نرسل کی زمین پر پھیلی ہوئی چادروں پر رنگ بکھیر رہے تھے۔ سیاحوں کی طرف پرامید نظروں سے تک رہے تھے کہ شاید ان میں کوئی ان کا خریدار ہو۔ ان کے صناع معصوم مسکراہٹ لیے ہوئے اپنی تخلیقات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کی روزی روٹی کے وسائل میں ان کی خاص اہمیت تھی۔ لیس مانی کہہ رہا تھا۔۔۔ ''اس جزیرے پر 6 خاندان رہتے ہیں۔ کل ملا کر تقریباً 20 افراد پر مشتمل۔ اس کا رقبہ 30 (تیس) میٹر ہے۔ اسی جھیل میں یہ لوگ ٹوٹورا نرسل اُگاتے ہیں جس کی تہیں بچھا کر یہ اپنے جزیرے بناتے ہیں۔ جب نچلی تہیں سڑنے لگتی ہیں تو اوپر سے نئی تہیں بچھاتے ہیں ہر دو ماہ پر۔ ٹوٹورا نرسل کی جڑیں بہت مضبوط ہوتی ہیں اسی کی نیو پر جزیرہ بنتا ہے۔ مستقل سیاحوں کی آمد و رفت سے اور اس پر چلنے سے نرسل ٹوٹتا رہتا ہے اور پانی اندر جانے سے سڑنے لگتا ہے تو نئی تہہ رکھنی ہوتی ہے۔ ان 64 جزیروں کے رقبے ایک دوسرے مختلف سے ہیں۔''

پانیوں پر گھروندوں میں بسی ہوئی اس صدیوں پرانی دنیا کو پروین انگشت بدنداں دیکھ رہی تھی۔ اس کے رنگین جھرمٹ۔۔۔ لیس مانی پانی سے سر اٹھائے ہوئے ٹوٹورا کی ایک شاخ کو توڑ کر سیاحوں کو اس کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ اس کے چھلکے اتار کر سفید جڑوں کو کھانے لگا تھا کہ یہ بھی یہاں رہنے والوں کی غذا ہے۔ یہ پودے ڈھائی میٹر گہرائی میں پانی کے اندر اُگتے ہیں اسی لیے وہ لوگ اس جھیل کو Mother Lake کہتے ہیں کیونکہ یہ انہیں غذا فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مچھلیاں اور پرندے بھی ان کی غذا ہیں۔

پروین ایک جھونپڑے کے قریب جا کر چادر پر پھیلے ہوئے رنگ برنگے سامان دیکھنے لگی تھی۔ قریب بیٹھی ہوئی عورت قیمت لکھ کر بتا رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان اشاروں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ نرسل سے بنی ہوئی کشتیوں کے Miniatures الپاکا اور لاما کے Fur سے بنے ہوئے اسکارف اور ٹوپیاں اس نے خریدیں تو دوسرے جھونپڑے والے اس کے قریب آگئے تھے اپنی طرف لے جانے کے لیے۔۔۔ ایک عورت اُسے اپنے جھونپڑے کے اندر لے گئی تھی۔۔۔ نرسل کا بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف سونے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف چند کپڑے رکھے ہوئے تھے۔۔۔ یہی ان کا محل ہے۔ کھانا کھلے آسمان تلے پکاتے ہیں۔ وہ اپنی آئی مارا زبان میں بتا رہی تھی اپنے طور طریقے اور لیس مانی انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا کہ ''پہلے یہ لوگ نرسل سے بڑا سا بلاک بناتے ہیں تین میٹر کا، بنیاد کے لیے۔ جس پر سولہ میٹر کا جزیدہ قائم رہتا ہے۔ 25 برسوں میں یہ جزیرہ غرق ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک سال پہلے اس جزیرے کے ڈوبنے سے پہلے دوسرا جزیرہ دوسرے مقام پر بنانا شروع کر دیتے ہیں جو ایک سال میں تیار ہو جاتا ہے۔

بچوں کی پیدائش کے لیے ماہر عورتیں (مڈوایف) مدد کرتی ہیں اور علاج کے لیے ماہر میڈیسن مین ہوتا ہے جو جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے (پروین کو ساؤتھ افریقہ کا ذولو گاؤں یاد آگیا تھا جہاں یہی ہوتا ہے) یہ لوگ زیادہ تر محبت کی شادیاں کرتے ہیں اور کچھ بغیر شادی کے بھی شادی شدہ زندگی گزارتے ہیں۔'' یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس عورت نے ٹوٹو ا نرسل کو اپنے پیروں پر لپیٹ لیا تھا اور کہہ رہی تھی۔۔۔ ''جب درد ہوتا ہے جسم میں تو یہی نرسل

مدد کرتا ہے۔اس کا عرق بدن میں جا کر درد ختم کر دیتا ہے۔گرمیوں میں اس کی سفید جڑوں کو نکال کر پیشانی پر رکھنے سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔نرسل کے نازک پھولوں سے چائے بنتی ہے۔نرسل ہی ان کی زندگی ہے۔ٹوٹورا غذا بھی ہے اور دوا بھی۔'' پروین نے اُس عورت کو اپنا گھر دکھانے اور یہ معلومات مہیا کرنے کے لیے شکریہ کہا تھا جس کا جواب اس نے مسکراہٹ سے دیا تھا جس میں خلوص کی خوشبو تھی۔جھونپڑوں کے باہر۔۔۔ایک گوشے میں پتھروں کے بیچ آگ تھی جس پر پتیلی رکھی ہوئی تھی اور کچھ پک رہا تھا۔۔۔وہاں کی روایتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ میزبان اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے ہیں۔صرف کھلاتے ہیں۔ ننھے منے جزیرے پر دو خوبصورت بلیاں بھی دوڑ رہی تھیں۔کھیل رہی تھیں۔وہ بھی ان سے کھیل رہی تھی کہ بلیاں اسے بے حد پسند ہیں۔لیس مانی کے مطابق یہ بلیاں چوہوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رکھی جاتی ہیں۔پروین نے اُس عورت سے سوال کیا تھا کہ نرسل کے جزیرے پر رہنے میں ٹھنڈ تو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہوگی۔۔۔ناقابل برداشت ہوگی۔اس نے آئی مارا زبان میں جواب دیا تھا جس کا ترجمہ لیس مانی نے کیا تھا۔۔۔کہ ان لوگوں کا خون سرخ نہیں سیاہ ہے اس لیے انہیں ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی۔وہ لوگ اپنے سورج خدا کے بچے ہیں اس لیے بھی ٹھنڈ کی آفت سے محفوظ رہتے ہیں۔ 64 جزیروں میں کچھ پر چرچ بنائے گئے ہیں۔ چرچ ہی میں اسکول ہوتے ہیں جن میں بچے پڑھتے ہیں۔پھر وہ بڑے ہو کر پونو کی یونیورسٹی جاتے ہیں۔

نرسل کی بنی ہوئی بڑی سی خوبصورت کشتی سیاحوں کو ٹی ٹی کا کا جھیل کی سیر کے لیے تھی۔جس پر بکھرے ہوئے جزیروں کے نظارے مل رہے تھے۔ پروین قدرت کی گود میں تیر رہی تھی۔دور بولیویا (Bolivia) کے پہاڑ، نیلی جھیل پہ بکھرے ہوئے جزیروں کے شوخ رنگ، ان پہ کھڑی ہوئی عورتیں اور بچے کشتی کو تکتے ہوئے اور ہاتھ ہلا کر ہلو کہتے ہوئے۔۔۔اپنی آئی مارا زبان میں گیت گاتے ہوئے، سیاحوں کے لیے۔۔۔یہ پانی کے سینے پر ٹکی ہوئی نرسل کی دنیا۔۔۔پرسکون، شور سے دور، قناعت سے بھرپور، ترقی پذیر دنیا سے دور، زمین سے دور، آسمان سے قریب، قدرت کی ڈوری تھامے ہوئے سادگی سے پُر۔۔۔انوکھی زندگی جی رہی تھی۔پروین کا دل کہنے لگا تھا کاش وہ بھی ان میں سے ہوتی۔ قدرت کی آغوش میں۔۔۔حیرت انگیز سرکنڈوں کے جزیرے پر۔۔۔ان احساسات کی کوکھ سے تب یہ نظم وجود میں آئی:

جھیل پر تیرتے ہوئے گھروندے

کہنہ وقت کے ساگر کے چوڑے سینے پر
اس دھرتی کا گول جزیرہ
جانے کب سے استادہ ہے
دھرتی کے باہوں میں سمٹا
ٹی ٹی کا کا بھی جیسے اک
ننھا منا سیارہ ہے!
اب بھی پچھلی صدیوں کی ڈوری تھامے وہ
ہر ہر لمحے رنگ بدلتے زماں کا چہرہ
دور سے بیٹھا، حیراں ہو کر دیکھ رہا ہے
لہروں کی آغوش میں سمٹی
چھوٹی چھوٹی نرسل کی پارینہ دنیا
وہی پرانے رنگوں کی چادر اوڑھے اب بھی قائم ہے!
فطرت کے رنگیں ریشم کی ڈور سے اس کی
سانسیں بندھی ہوئی ہیں
ہر دھڑکن قدرت کے دل سے جڑی ہوئی ہے
بادل، بارش، دھنک کے جوہر
سورج کا سونا، پھولوں کے رنگ برنگے گوہر
چاند کی رخشاں چاندی
اس کے باشندوں کے یہ سرمائے
اب بھی ان کی مٹھی میں ہیں!
اس طوفانی رنگ بدلتی دھرتی پر بھی
یہ کتنے محفوظ ہیں اب تک
اپنی پارینہ دنیا میں کتنے آسودہ خاطر ہیں!!

...... حُسنِ عقیدت ......

تخلیقی صلاحیت میں جب زبان و بیان پر دسترس بھی شامل ہو جائے تو پھر شاعر کے لیے مشکل ردیفوں میں شعر کہنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔جناب عزیز جبران انصاری کی بعض حمدیہ و نعتیہ نظموں میں ایسی ایسی مشکل ردیفیں استعمال ہوئی ہیں اور اس کمالِ فن کے ساتھ کہ اچھے اچھے حمد و نعت گو شعرا شاید ان ردیفوں پر طبع آزمائی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں یا اگر کچھ کہہ بھی لیں تو وہ آورد تو ہو، آمد نہ ہو۔عزیز جبران انصاری نے تو ''بہ ہر صورت''، ''کاغذ قلم''، ''پیہم''، ''خود بخود''، ''مکمل''، ''ہمیشہ''، ''مسلسل''، ''تقاضے''، ''مقبولیت'' جیسی ردیفوں میں اچھوتے قافیے استعمال کر کے تخلیقی کمال کر دکھایا ہے۔اور کہیں بھی حمد اور نعت کے درمیان کے بال سے زیادہ باریک فرق کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

جُز شرک اگر چاہے گا، بخشے گا خطائیں
کر شِرک سے پرہیز تُو جبرانؔ مکمل

نسیم سحر

اشاعت:۲۰۱۶ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: جبران اشاعت گھر، اردو بازار، کراچی۔

''جلتا ہوا دیا''

شگفتہ نازلی (لاہور)

کس درجہ اُن کو اپنے روابط کا پاس ہے — رستے اُجڑ گئے ہیں جو جنگل اُداس ہے
قُرب و جوار میں کہیں کوئی نہیں ملا — جلتا ہُوا دیا ہی میری آج آس ہے
اُڑتے ہوئے غبار نے چہرہ چُھپا دیا — صحرا میں یاد کے اگرچہ اب بھی پاس ہے
کاغذ کے پھول موسموں سے بے نیاز ہیں — کوئی بھی رُت ملے، کہاں اُن میں وہ باس ہے
ہجر و فراق کی کھنچی تنہا سی اک لکیر — اور اُس کے آس پاس صرف حرفِ یاس ہے

○

پرویز مظفر (برمنگھم)

نیچی چولی، اونچے بھاؤ — کس کی ہو تم ، نام بتاؤ
پھڑ پھڑ کرتے رہ گئے نوٹ — خوردہ نا ہے آگے جاؤ
فرصت عنقا ہے لیکن — آ ہی گئے تم تو آؤ
میں بھی وحشت کرتا ہوں — مجنوں صاحب ہاتھ ملاؤ
گریہ کرتا ہے پرویز — اور مجھے آتا ہے تاؤ

○

عارف شفیق (کراچی)

اک صدا حق کی لگاؤں گا چلا جاؤں گا — شہرِ غفلت کو جگاؤں گا چلا جاؤں گا
خود سے بچھڑے ہوئے جو لوگ ہیں تنہا تنہا — ان کو خود ان سے ملاؤں گا چلا جاؤں گا
تم نے اک عہد کیا تھا جو خدا سے اپنے — وہ تمہیں یاد دلاؤں گا چلا جاؤں گا
میرے اس شہر کو کس کس نے لہو پہنایا — پردہ چہروں سے اٹھاؤں گا چلا جاؤں گا
یہ جو مقتل میں تماشا ہے ذرا رک جائے — لاش خود اپنی اٹھاؤں گا چلا جاؤں گا
زیر ہو جائے گا جب آخری دشمن میرا — سب کو سینے سے لگاؤں گا چلا جاؤں گا
روک پائے گا کہاں مجھ کو ترا شہرِ جمال — خاک خود اپنی اڑاؤں گا چلا جاؤں گا
دیکھنا جنگ کا نقشہ ہی بدل جائے گا — آخری تیر چلاؤں گا چلا جاؤں گا
میں بھی عارفؔ کبھی آوارہ ہواؤں کی طرح — اس چمن زار میں آؤں گا چلا جاؤں گا

○

نوید سروش

(میر پور خاص)

جی تو رہے ہیں ہم بھی مگر زندگی سے دور جیسے کہ تیرگی ہو کہیں روشنی سے دور
بچّے ہوئے ہیں جنگِ مسلسل سے بدمزاج رہنے لگے ہیں امن سے اور آشتی سے دور
ہے کیفیت عجیب یہ ہجر و وصال کی کوئی تو مل رہا ہے کوئی ہے کسی سے دور
سینے سے ایک یاد لگا کر وہ شاد ہے تھا باغ بھی قریب، رہا وہ کلی سے دور
پہچان لو کہ جو بھی بچا ہے وہ لائے ہیں رکھے ہوئے بچوں کے لاشے گلی سے دور
اُن میں تلاش کرتے ہو خوشیاں کمال ہے جو عمر بھر رہے ہیں ہنسی اور خوشی سے دور
دیکھو ہے چاندنی کی ردا اُس کے جسم پر جس کی سروش زندگی ہے چاندنی سے دور

○

سبھاش گپتا

(گورداس پور، بھارت)

ہر جانب ہے پہرہ دیکھ پھر بھی کیا نہیں ہوتا دیکھ
سوچتی آنکھیں تھک جائینگی لازم ہے اک سپنا دیکھ
شام کو دِل کی بگیہ میں درد کا پھول مہکتا دیکھ
ساحل پر گمصم مت بیٹھ غافل چڑھتا دریا دیکھ
توبہ تقویٰ چھوڑ ذرا موسم بھیگا بھیگا دیکھ
مجھ سے بگڑا رہتا ہے اب تو میرا رستہ دیکھ
میرے کہنے پر مت جا سب کچھ حسبِ منشا دیکھ

○

تصور اقبال

(اٹک)

اُن کے لب پر جو اک بد دُعا ہے گویا نفرت کی آج ابتدا ہے
میں نے پُوچھا مری کیا خطا ہے جھٹ سے بولے کہ تُو بے وفا ہے
دو دلوں میں جو اک فاصلہ ہے ختم اب پیار کا سلسلہ ہے
وہ بھُلا دے تو اُس کی ادا ہے یاد رکھے تو اک معجزہ ہے
اُس نے دل توڑ کر یہ کہا ہے جا اسے جوڑ لینا سُنا ہے
جب سے مالی تصوّر مرا ہے باغ اُس دن سے اُجڑا ہُوا ہے

○

پروفیسر حسین سحر

(ملتان)

ایہ گردشِ حالات ہو بھی سکتی ہے
حصارِ غم میں مری ذات ہو بھی سکتی ہے

یقین نہ آئے تو دیکھو ہماری آنکھوں میں
بغیر ابر کے برسات ہو بھی سکتی ہے

نگاہ و دل کے دریچے کبھی نہ بند کریں
ہماری خود سے ملاقات ہو بھی سکتی ہے

ہمیشہ فتح کے نشے میں رہنا ٹھیک نہیں
کھلاڑیوں کو کبھی مات ہو بھی سکتی ہے

جہاں چمکتے ہوئے دن کی حکمرانی ہو
وہاں سیاہ گھنی رات ہو بھی سکتی ہے

کسی کی یاد بھی آئے کبھی نہ بھولے سے
غم و الم کی وہ بہتاب ہو بھی سکتی ہے

سحرؔ یہ دل کی مسلسل جو ہے پریشانی
کسی کے ہجر کی سوغات ہو بھی سکتی ہے

○

سلیم انصاری

(جبل پور، بھارت)

مری نیند خواب سے بھر گئی، مرے خواب زخم سے بھر گئے
مری زندگی یہ عذاب کیا، مرے جسم وجاں پہ گذر گئے

یہ عجیب فکرِ معاش ہے، یہ عجیب شہرِ تلاش ہے
مرے پاؤں ہی نہیں چھوڑتا، مجھے عرصہ ہو گیا گھر گئے

کہ عجیب ساعتِ کشمکش میں ملا تھا اذنِ سفر ہمیں
جو سفر میں ساتھ چلے تھے وہ، کہیں راستے میں اتر گئے

نہ کسی بدن کی صدا سنی، نہ کسی وصال سے خوش ہوئے
وہ کبھی تو لوٹ کے آئیگا، اسی انتظار میں مر گئے

نہ کبھی رکے، نہ چلے کبھی، نہ کوئی دشا ہے نہ راستہ
کہ سفر تھا دور دراز کا، سو ہم آکے خود میں ٹھہر گئے

○

تمثیلہ لطیف

(پسرور)

ہاتھ میں اِک کتاب رکھتی ہوں
اور اُس میں گلاب رکھتی ہوں

مجھ سے کوئی سوال مت کرنا
ورنہ میں بھی جواب رکھتی ہوں

کس کو کتنا خلوص دینا ہے
اُس کا پورا حساب رکھتی ہوں

تم ستاروں کی بات کرتے ہو
پاؤں میں مہتاب رکھتی ہوں

لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں
میں بھی آنکھوں میں خواب رکھتی ہوں

کیسی کیسی محبتیں ہیں مجھے
کیسے کیسے عذاب رکھتی ہوں

خود میں تمثیلہؔ ڈوب جاؤں گی
اپنے اندر چناب رکھتی ہوں

○

وشال کھلر

(لدھیانہ، بھارت)

سردی، بارش، رم کا پیار منظر کیسا دیکھا بھالا!
غم کی صورت مٹ جائے گی کانٹے پر مت رکھنا چھالا
آگ کی لپٹیں سینک رہے ہو گال ہیں جیسے ابلا لالہ
بچ کے رہنا اندھیارے سے سوچ میں پڑ جائے گا جالا
شام کے بھیگے بھیگے پن میں کھُل جاتی ہے اپنی ہالہ
دن میں، رات میں پھیر رہا ہوں موتی سانسیں، زیست ہے مالا

○

زاہدہ عابد حنا

(لاہور)

موت دے یا کہ زندگانی دے جو بھی دے مجھ کو جاودانی دے
وہ جو بہتا تھا اپنی رگ رگ میں پھر اسی بحر کو روانی دے
دے رہا ہے جنوں پھر دستک دل کے صحرا کو بے کرانی دے
لحہ لحہ بکھرتا جائے، اور دل کو اک رنجِ رائگانی دے
خواب تعبیر سے گلے مل لے شام ایسی بھی اک سہانی دے
رکھ دے ہونٹوں کو میری پلکوں پر جاتے جاتے کوئی نشانی دے
کشتِ ارماں کو سبز ہونے دے آ، مری آنکھ ہی کو پانی دے
حسن ہو، عشق ہو کہ دردِ دل چیز کوئی تو آسمانی دے

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

تمہیں چراغ جلانا ہیں دھیان میں رکھنا یہ نیکیوں کی رتیں جسم و جان میں رکھنا
کچھ ایسے خواب سے منظر میں اڑ رہے تھے پرند کہ تیر بھایا نہیں تھا کمان میں رکھنا
بڑے تپاک سے ملتے ہیں دوستوں سے دوست یہ خوشبوئیں مرے مولا امان میں رکھنا
کہ پستیوں میں تو حشرات ہی بھٹکتے ہیں پرند سوچ کا اونچی اڑان میں رکھنا
زمانہ سچ کی حرارت سے جلنے لگتا ہے ذرا سا جھوٹ کا شک بھی بیان میں رکھنا
مجھے یقیں ہے وہ چمکے گا چاند بن کے عدیلؔ زمیں کا ٹکڑا کوئی آسمان میں رکھنا

○

گردشِ ایام

زندگی کے چنداوراق

حسن منظر
(کراچی)

مجھے اس سے انکارنہیں کہ حسن منظراورسید منظرحسن دونوں میرے ہی نام ہیں۔

سید منظرحسن میں اس وقت سے تھاجب ۱۹۴۱ء میں اسکول میں نام لکھوایا تھا۔حسن منظر کی ضرورت مجھے خودکو چھپانے کے لیے اس وقت آ پڑی جب میراچھپنے والادوسراافسانہ''دوسڑکیں دوکنارے''۱۹۵۰ء میں میرے قلم سے وارد ہوا اور امریکہ اور اس سے ڈرنے والے ممالک سینئر جوزف میکارتی Mccarthy کی ہرایک پس شک، ہرایک پرشبہ کی پھیلائی ہوئی نفرت کی گرد سے بھری تندہوا کی لپیٹ میں تھے۔کولوجوں،یونیورسٹیوں اورسرکاری اداروں پر کڑی نظررکھی جارہی تھی کہ ان میں کہیں سے مغربی استعمارکوانفیکٹ کرنے والے جراثیم تو داخل نہیں ہورہے تھے۔دوسرے لفظوں میں پرو(Pro) روسی عناصر ہمارے ہاں بھی کچھ ادیب امریکہ کے عاید کردہ اس حکم کومنوانے پر مامور تھےاور تعلیم گاہوں میں اساتذہ اورطلباہ جوچھپ کر یہ کام کررہے تھے۔

وہ افسانہ لکھنے کے بعد مجھ میں ایک نئ خواہش پہلی بار بیدار ہوئی کہ اسے کہیں پڑھا جائے۔میں اپنے خیالات کودوسرے ادیبوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔

اُن دنوں میں فورمین کرسچین کولج لاہور سے ایف۔ایس۔سی کرچکا تھااورسیاست کا نیارخ وہاں کے سال دوم کے دنوں سے محسوس کرنے لگا تھا۔ انجمن ترقی پسند لاہور کی ہفتہ وارنشستیں نکلسن روڈ پر ہوا کرتی تھیں اورایک دوست کی وساطت سے اُن میں سے کم ازکم ایک میں شریک ہونے کا امکان مجھے نظر آیا۔وہ دوست مخدوم محی الدین کا ترانہ''یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم تلے'' جوش وخروش سے پڑھا کرتے تھے۔یعنی جنگ آزادی ۱۹۴۷ء میں ختم نہیں ہوئی تھی۔ابھی جاری تھی اور یہی میراافسانہ کہہ رہا تھا۔

مگرایک وسوسہ تھا کہ جولکھنے والے پکڑے جارہے تھے ان میں میرا نام بھی ناحق شامل ہوجائے گا۔

چنانچہ میں نے ایک شام اپنے عقیقے کے نام حسن معوض کے تحت وہ افسانہ پڑھا۔نہ تحریک کومیں نے ڈھونڈا تھا نہ تحریک نے مجھ کو۔معاملہ صرف اتنا تھا کہ جس لڑکے نے صرف گاؤں کی تلیّا میں چھپا چھپ کی ہوا ایک دن ذرا بڑا ہونے پرجھیل میں جاپڑے اوراُسے پتہ چلے کہ ارے مجھے تیرنا آتا ہے۔میں ان کے ساتھ تیرنے لگا۔افسانے نے میرے قدم ادب کی دنیا میں جما دیئے لیکن حسن معوض اُن سب کے لیے کچھ اجنبی سا رہا۔پھرمیں ے ہمت کرکے حسن منظر میں پناہ لی اورخوش تھا کہ ادب کی کاشت کرنے والوں کے سوا مجھے کوئی نہیں جانتا ہے۔نہ رشتے دار، نہ ملنے والے، نہ ہی بی۔ایس۔سی کے اساتذہ اورساتھ پڑھنے والے۔

مگراطمینان عارضی تھا۔ایک دن ایک کلاس فیلو نے بتایا''آپ نے نشست میں یہ یہ کہا تھا، یہ یہ کیا تھا۔۔۔''اس کے چچایا ماموں، جوجاسوس تھے، وہاں سامعین میں موجود تھے!

اس کے بعد مجھے مختلف ذرائع سے پہلو بچا کر چلنے کی ہدایتیں ملتی رہیں، میٹرک کا جواسکولرشپ ملنا تھااس کے لیے بڑی چھان بین کی گئی لیکن گھر جو تفتیش کرنے آئے تھے وہ صرف سید منظرحسن سے واقف تھےاور میری خوش قسمتی کہ حسن منظر نام کا کوئی نوجوان ان کی دنیا میں ابھی پیدانہیں ہوا تھا۔ورنہ اسکولر شپ سے ہاتھ دھوبیٹھتا۔

وہ دن ہی ایسے تھے،فیضؔ، سجادظہیرؔ، سبط حسن، احمد ندیم قاسمی، حسن عابدی وغیرہ جن کے میں صرف نام سے واقف تھا جس میں تھےاورکم اہم جوتھے ان کا میں ہم رکاب تھا۔پھرمیں نے کہا: کیا حرج ہے حسن منظرہی چلنے دو۔میں عملی سیاست میں تب بھی نہیں تھا، نہ بعد میں کبھی ہوا، میرا پیچھا کرکے اپنا وقت ضائع کریں گے، والد صاحب نے اس حقیقت کو اپنے ضبط نفس کے ساتھ بغیر کسی اچنبھے کے سُنا۔

والد صاحب سید مظہرحسن گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔اُن کے والد سید مہدی حسن بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔۱۸۵۲ء میں لکھے گئے شجرے کے مطابق ددھیال کے متعلق جتنا مجھے معلوم ہے اس میں سے کچھ یوں ہے:

میرکریم مورث اعلیٰ دہلی سے نواب برہان الملک کے ساتھ فیض آباد (صوبجات متحدہ آگرہ واودھ) گئے اور وہیں بس گئے وہاں کچھ زمین جنگی خدمات کے صلے میں ملی تھی۔ باقی رشتے میرٹھ، بجنور، رجّو پور، بلکہ صوبجات (موجودہ اترپردیش) کی تمام شمالی کمشنریوں میں یہاں وہاں آباد تھے۔ایک اور جنگی مہم میں جب میراحمد نے دوآبہ گنگ وجمن فتح کیا تو فیض آباد والے گڑھ مکتیسر Garh Muktesar ہندوؤں کے گنگا نہان کے شہر آباد ہوئے۔وہاں اچانک ان کے پڑپوتے میرمردانعلی (مردان علی) فوت ہوگئے اور پیچھے رہ گئیں ان کی بیوہ آمنہ، پیدائش سے نابینا بیٹی منیرالنساء اور بہت کم عمر بیٹا میرمنورعلی۔یقیناً غربت ساتھ دے رہی تھی کہ خاندان میں سے کوئی اس نابینا لڑکی کواپنی بہو بنانے کو رضامند نہیں ہوا نہ اس لڑکے کے سرپرہاتھ رکھنے کو۔بیوہ آمنہ کا بھی چل چلاؤ کا ووقت تھا۔ناچارانہوں نے بیٹی کی شادی ہاپڑ کے میانجی (میاں جی) محمد علی سے کردی جوشیخ تھے۔مولینا گدّن کا اولاد جن کے نام پرہاپڑ کا م حلہ گدّ اپاڑہ ہے۔

اس شادی نے پورے خاندان میں ہنگامہ برپا کردیا۔میرا خیال ہے شرکت اوروں نے تو کیا خودمیرمنورعلی کے سگے چچانے بھی نہیں کی ہوگی جوگڑھ

مکٹیسر میں موجود تھے۔

شجرے کے مصنف نے لکھا ہے وہ آٹھویں پشت میں سید ہیں۔اور جنگی فتوحات کے ثبوت میں عماد السعادت اور بوستان اودھ وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔ دہلی کے (حورث اعلیٰ) میر کریم سے لے کر میرے پردادا تک کے پُرکھے نام کے ساتھ میر کا سابقہ لگاتے تھے لیکن یہ میریت ویسی نہیں تھی جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے (دروغ انھی کی گردن پر) علی متقی کے فرزند خدائے سخن محمد تقی المعروف میر تقی میؔر کے لیے کیا ہے۔

میرے پردادا کی دادی آمنہ کے انتقال کے بعد جب میر منور علی گڑھ مکٹیسر میں بے سہارا رہ گئے تو میانجی محمد علی انہیں چار سال کی عمر میں ۱۷۹۹ء میں ہاپوڑ لے گئے جہاں ان کی پرورش اندھی بہن منیر النساء اور غیر سیّد بہنوئی شیخ محمد نے کی۔ان کے چچا نے اس پر آسمان سر پر اٹھالیا۔سیدوں کی لڑکی کی شادی ایک شیخ سے: سیہات، اوران کے لڑکے کوایک شیخ نے گود لے لیا، جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔اک شور تھا کہ یہ لوگ ہاپڑ کے شیخوں کے شیر وشکر ہو گئے ہیں۔

ستم بالائے ستم میانجی بے اولاد رہے اور اپنی ساری جائیداد انہوں نے آگے چل کر میر منور علی کے بیٹے میر عنایت علی کے نام دوصد روپے سکہ کلدار، نصف جس کا صد ہوا، کے عوض کر دی۔شیخ صاحب کے سارے رشتے دار اُن پر چڑھ دوڑے کہ کیوں انہوں نے اتنی بڑی جائیداد ایک غیر کو دے ڈالی۔

ایک اور الزام شیخ صاحب پر نومسلم ہونے کا لگا۔عیاذ اباللہ۔ایک جدی مسلمان گھرانے کی لڑکی ایک نومسلم گھرانے میں جائے! شجرہ لکھنے والے بزرگ نے صفائی میں لکھا ہے یہ الزام غلط تھا۔

لیکن میرے نزدیک وہ نومسلم شیخ جدی مسلمانوں سے بہتر تھا، کتنے ہی نجیب الطرفین سیدوں پر بھاری۔وہ اگر اُس مفلسی گھرانے کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو ماں کے مرنے کے بعد اس نابینا لڑکی کا کیا بنتا اور اس کا کم سن بھائی زندگی کی کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔یہ خناس ابھی تک بہت سوں کو ستاتا ہے کہ فلاں نو مسلم ہے۔یعنی دائمی مسلمانوں سے رتبے میں کم ہے۔جیسے دائمی نزلہ قابل فخر عارضہ ہے،موسمی کھانسی بخار کے لیے کون شفاخانوں اور مطب کا رخ کرتا ہے۔

ایک دلچسپ نام اس دور کی ایک ایسی شخصیت کا شجرے میں ہے کہ ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔میر کلّو۔۔۔وہ اس پوری کہانی کے ولن Villain تھے، سید منور علی کے چچا لکھنے والا ان کا صحیح نام لکھنے کا روادار نہیں تھا۔کاش وہ رفیع الدین سودا ہوتے تو خاندان کی تاریخ ایک ہجو سے مزید ہوتی،انہوں نے بس میر کلو کو لکھنے پر اکتفا کی۔میں سوچتا ہوں یہ لوگ عرب سے آ کر کس آسانی سے ذات پات اور تنگ نظری کی رسومات میں بندھ گئے تھے۔

میں نے غیر ضروری کرداروں کے نام وکام کو اس روئیداد میں چھوڑ دیا ہے ورنہ کہانی بے مزہ ہو جاتی۔غرضیکہ ہاپوڑ میں جنگیں تھیں،مقدمے تھے، جائیداد کے ایک غیر گھرانے کے لڑکے کے نام ہو جانے کا فساد تھا،ہائیکورٹ چلتے ہوں گے، یہ لوگ زہر کا گھونٹ پی کر سوتے ہوں گے اور منہ میں پتے کا پانی لئے افواہ پھیلانے والے کو یاد کرتے ہوئے اُٹھتے ہوں گے یہاں تک کہ میر منور علی کے نمبر۲ بیٹے ہاپڑ کی فضا سے تنگ آ کر ۱۸۵۰ء میں گورکھپور کو سدھارے موجودہ اتر پردیش کے انتہائی مغرب سے انتہائی مشرق کو،اور وہاں انہوں نے میریت کو بھی خدا حافظ کہا۔یہ تھے میرے پردادا سید بنیاد علی۔

شجرے میں لکھا گیا ہے کہ سید بنیاد علی مغلوب الغضب آدمی تھے۔ ان کا حلیہ یوں درج ہے: وجیہہ،طویل قامت اور سرخ سپید۔لیکن یہ تو اسٹینڈرڈ حلیہ ہے جو پچھلوں کے لیے اکثر تذکروں میں پڑھنے میں آتا ہے اور جس سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ موصوف دیکھنے میں کیسے تھے۔ہاں اتنا یقینی ہے کہ وہ گھوڑے پالنے کے شوقین تھے اور گھوڑوں کے علاج کے لیے گورکھپور میں پہچانے جاتے تھے۔میں ہاپڑ میں پیدا ہوا تھا۔۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو، ہوسکتا ہے ۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو۔اُن دنوں نہ برتھ رجسٹریشن ہوتا تھا نہ برتھ سرٹیفکیٹ کسی کام کے لیے چاہیے ہوتا تھا۔قبر پہ اگر کتبہ ہوا اور اس پر جینے مرنے کی تاریخ کندہ ہو تو وہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا کام دیتا تھا۔

مراد آباد میں رام گنگا کے کنارے کے قبرستان میں میرے دادا کی قبر جس کا کتبہ ہے:

ھوالغفور/ سید مہدی حسن/ ۱۸۔اکتوبر ۱۹۲۸ء/ کندہ مبارک لالچاہ، دہلی۔

۱۹۸۳ء میں جب ہندوستان چھوڑنے کے بعد پہلی بار میں مراد آباد گیا تھا وہ قبر جوں کی توں تھی، چھاؤں میں اس پر پیلے چھوٹے پھولوں اور جھڑنے والے پتوں کی بارش ہمیشہ کی طرح ہوئی تھی اور کچھ ہی فاصلہ پر رمنگا سکون سے بہہ رہی تھی۔میرے چھوٹے بھائی تیر کی قبر ۱۹۶۲ء میں لالو کھیت (لیاقت آباد) کراچی میں بنی اور دس سال بھی سلامت نہیں رہی۔ بعد میں ڈھونڈے سے بھی کسی کو نہیں ملی۔

میں مردان علی اور لال چاہ وغیرہ کو اسی طرح لکھ رہا ہوں جس طرح وہ اس دور میں جوڑ کر لکھے جاتے تھے۔مردانعلی،لالچاہ وغیرہ۔میرے لڑکپن میں وہ جگہ جس کا ذکر سنگِ مزار میں لالچاہ ہو کر آیا ہے لال کنواں کہلاتی تھی۔

دادا سید مہدی حسن گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔تعلیم بریلی میں حاصل کی،مولانا شوکت علی کے دوست تھے۔عمر انہوں نے ہمالیہ کی ترائی کے جنگلوں میں گزاری اور رنائر کنزرویٹر کے عہدے سے ہوئے۔میرا افسانہ ''پتے کا پانی'' ان کی جنگلات کی زندگی کے ایک واقعے یا حادثے پر مبنی ہے۔انہیں جو ہتھنی سرکار سے ملی ہوئی تھی اس کا نام رام پیاری تھا۔اس کی دو تصویریں میرے پاس موجود ہیں۔چمکیلے تانبے کے رنگ کے چکنے کاغذ پر پرنٹ کئے ہوئے فوٹو۔ان کی جائداد اور فرنیچر وغیرہ ان کے انتقال کے بعد خاندانی جھگڑوں کی نذر ہو گیا۔ میرے حصے میں ان کی ''مثنوی مولوی معنوی'' دفتر اوّل اور ''مدوجزر اسلام'' آئے اور ابھی تک میرے پاس ہیں۔ اسے سندھی میں کہیں گے ''گنج

ہیں۔''(بہت پرانا خزانہ)

اُن کے ساتھ زیادتی سرکار برطانیہ نے کی کہ جو ایجاد کاغذ بنانے کے لیے لگدی تیار کرنے کی مشین کی انہوں نے کی تھی اُس پر انہوں نے خطاب تو دیا لیکن نام ہوئی وہ متعلقہ برطانوی محکمے کے۔ انہوں نے نہ اُس خطاب کو کبھی اپنے نام کے ساتھ لکھا نہ اوروں کو لکھنے دیا۔

اب ذرا دادی ممتاز فاطمہ کا ذکر ہو جائے۔

ہاپوڑ سید بنیاد علی اور اُن کے ساتھ گورکھپور جانے والوں کے بعد رشتے داروں سے خالی نہیں ہو گیا تھا، نہ ہی دوسرے شہروں سے لوگ سب کے سب پورب ڈھل گئے تھے۔ رجو پور میں سُنا ہے۔ دادی کی تھوڑی بہت زمین تھی۔ وہ خود وہیں تھیں۔

شجرے میں ۱۸۵۷ء کے بعد جگہ جگہ کسی کے مرد وارث کا نام تو دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی لکھا ہے: مفقود الخبر۔ لاپتہ اور بہت سے عمود بے نام ہے۔ ان ہی میں سے ایک دادی کے والد یا نانا تھے۔ جنگ آزادی چھڑی تو ایک دن وہ نور مرقد سوداسلف کے بعد عجلت کے عالم میں گھر لوٹے، گھر والی کو وہ تھمایا جو خرید کر لائے تھے، اپنا اسلحہ سنبھالا، سب کو خدا حافظ کہا اور پھر جو گھر سے نکلے تو جنگ آزادی تھم بھی گئی لیکن ان کا پتہ نہیں چلا کہاں ہیں۔ اُن کے سر پر انعام تھا۔ قابلِ فخر سر ہو گا کہ برطانیہ نے اس کے لانے والے کے لیے انعام مقرر کیا۔

عرصہ بعد وہ ایک دن چھپ کر گھر آئے، والد صاحب نے بھی اُن کی شکل دیکھی تھی، کچھ ہی دیر ٹھہرے اور آخری بار سب کو خدا کے سپرد کر کے جو گئے تو کسی کو اُن کی سُن گن نہ ملی۔ خیال ہے نیپال نکل گئے ہوں گے جدھر کا رُخ سب زندہ رہ جانے والے باغیوں نے کیا تھا۔

دادی کو بیاہ کر جب دادا رجو پور سے گورکھپور لے جا رہے تھے تو وہ ساتھ جانے والی عورت کے ساتھ زنانے کمپارٹمنٹ میں تھیں اور دادا مردانے میں۔ یہ دادی کا ریل کا پہلا سفر تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے کو ایک جہان تھا۔ پر اسٹیشن پر وہ سر کھڑکی سے باہر نکال دیتی تھیں اور ہر بار گھبرا کر اندر کر لیتی تھیں۔ مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اُن سے نہیں رہا گیا اور انہوں نے ساتھ جانے والی عورت سے، جو کوئی رشتے دار ہی ہوگی، شکایت کی ''یہ مردوا کون ہے جو مجھے ہر اسٹیشن پر غصے سے آنکھیں دکھاتا ہے۔''Chaperon(معمر خاتون) نے بھی اُٹھ کر تجسس سے باہر دیکھا اور گھبرا کر ممتاز فاطمہ کا سر اندر کھینچ لیا کہ ''یہی تو تیرا میاں ہے۔''

گورکھپور میں تین دیورانیاں، جٹھانیاں اور سب سے چھوٹے دیور محلّہ خونی پور کے ہمارے آبائی مکان میں رہتے تھے۔ دادا جنگلات میں رہتے تھے اور ان کے دو بھائی بھی اپنی اپنی ملازمتوں پے۔ وہیں میرے والد سید مظہر حسن پیدا ہوئے۔ انہیں کچھ عرصہ بڑی چچا زاد بہن اور ہم عصر چچا زاد بھائی کے ساتھ کنڈو کی نرسری بھیجا گیا۔ شاید دو بکروں کی گاڑی میں یا بکروں کی جگہ وہ کام ٹٹو لے لیا جاتا تھا۔

پھر مظہر صاحب نینی تال فلانڈرا سمتھ بھیجے گئے جو کسی کونوینٹ کا حصہ ہوگا۔ لیکن ان کے والد نے بالآخر فیصلہ کیا کہ تعلیم کے لیے علی گڑھ بہتر رہے گا وہاں کی صبح کی آذان سے ہوتی ہے اس لیے لختِ جگر وہیں تعلیم پائے۔ میرے پاس ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۱۶۔ستمبر ۱۹۲۶ء کو The Solitaire, P.o. Jeolikote, (Namital) کے پتے سے ہیڈ ماسٹر ایم۔اے۔او کولیجیئیٹ اسکول علی گڑھ کو لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں اپنے بیٹے سید مظہر حسن کی دیکھ بھال کے لیے اپنے پرانے ملازم قدرت اللہ کو بھیج رہا ہوں۔ والد صاحب کا داخلہ ظہور وارڈ میں ہوا تھا۔۔۔ بچوں کا سیکشن۔۔۔ اور مسلم یونیورسٹی سے وہ بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد نکلے۔ گھر جا کر ماں، باپ کے ساتھ رہنا انہیں کم ہی نصیب ہوتا ہوگا۔

اُن سے دونوں چھوٹی بہنوں ماں سے زیادہ نزدیک ہیں۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت وہ کوئین میری اسکول دہلی میں پڑھ رہی تھیں۔

دیکھا جائے تو دادا، دادی بھٹکتی ہوئی روحیں تھیں۔ ان کی عمر میں تفاوت ایک بڑے دریا اور اس کے معاون یا جگز ار دریا کا نہیں تھا جو ساتھ ساتھ بہہ رہا ہو۔ جیسے گنگا کے ساتھ جمنا، جمنا بالآخر گنگا میں سما جاتی ہے۔ ان کا رشتہ زیادہ اور تاپتی کا سا تھا۔۔۔ ساتھ ساتھ بہتے ہوئے دو دریا جو اپنے اپنے دہانوں سے خود کو بحیرہ عرب میں گم کر دیتے ہیں۔

رٹائر ہونے کے بعد دادا اپنی جائداد، نینی تال کی راہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے لکڑی کے بنگلے تملیا Timalia اور ہلدونی کے چند ہندو آنہ طرز پر بنے ہوئے مکانوں کو چھوڑ کر مراد آباد آبسے تھے، ایک کرایے کے مکان میں۔ ارادہ شاید وہیں رہ بسنے کا تھا۔ پاپا میرے والد گریجویشن کے بعد وہیں آگئے اور انڈین سول سروس کا امتحان دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

دادا نے ان کی شادی ریلوے اسٹیشن ماسٹر عاشق علی کی بیٹی انور جہاں بیگم سے کر دی۔ آنے والے بچوں کے نام بھی تجویز کر دیئے، غرض کہ گورکھپور سے دور نئی دنیا بسانے چلے تھے کہ خود چل بسے۔ دونوں دو پھوپھیاں دہلی سے لائی گئیں اور کفن دفن ہوا۔

کچھ ہی عرصہ بعد میری بڑی بہن ماظرہ مراد آباد میں (لاہور کے دسویں کے طلبا کے مقبول الفاظ میں) کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئیں۔ ہاپڑ کا مکان خالی پڑا تھا اور کرایے کے گھر سے بہتر تھا۔ میں وہاں پیدا ہوا۔ لیکن اس زمانے میں والد صاحب کو کہیں پیر جمانے مشکل ہو رہے تھے۔ انڈین سول سروس خواب ہوئی۔ شاید ایم۔ایس۔سی کرتے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں جا سمائے، لیکن حالات ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

اُن حالات میں گدّا پاڑہ، ہاپڑ کے مکان محل میں میں پیدا ہوا۔ وہی ہاپڑ جہاں امتیاز علی تاج کے والد مولوی ممتاز علی تاج پیدا ہوئے۔ ''تہذیب النسواں'' اور ''پھول'' کے خالق، اور بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی۔

دادی نے دادا کی زندگی ہی میں دہلی سے کوئی میڈیکل کورس کیا تھا۔

اپنی زندگی کی کہانی لکھنا ناول لکھنے سے کہیں مختلف کام ہے۔ یہ

دوسری بات ہے کہ خودنوشت کا مصنف یہ کام کسی دوسرے کو سونپے یا خود پہ ایک نوول لکھ ڈالے با قاعدہ تھیم اور پلوٹ کے ساتھ۔amoeba ایسا ایک جانور ہے قطر میں انچ کے تقریباً سویں1/100 کے برابر جو تالابوں وغیرہ کی نلی کی کیچڑ میں رہتا ہے اور صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اپنی شکل بدلتا ہے پہلے گول جیسا ہوتا ہے پھر اس میں سے ایک کھونڈی انگلی سی ایک طرف کو نکلتی ہے، بلکہ انگلیاں جنہیںpsendopodin کہا جاتا ہے۔۔۔جھوٹے پیر جو لمبے ہوتے جاتے ہیں، جسم سکڑتا جاتا ہے یہاں تک کہ پورا جسم وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں جھوٹے پیر پہنچیں۔

خودنوشت کے کردار سوڈوپوڈیا جیسے پیر گزرے ہوئے وقت میں یہاں وہاں دوسرے کرداروں کے درمیان دوڑاتے رہتے ہیں اور ان کی جولانگاہ اِس کی پرواہ کئے بغیر ہوتی ہے کہ کیا مقدم ہے کیا متاخر۔ واقعات اس طرح آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہیں کہ ان کا علیحدہ کرنا لکھنے والے کے لیے دشوار نہیں، ناممکن ہوتا ہے۔

جب دادا کا گھر جنگل میں ایک تنبو (خرگاہ) ہوتا تھا، ساتھی کتا، گھوڑا اور ہتھنی، پڑوسی جنگلی جانور اور خدمت گار پہاڑی لوگ تو دادی گورکھپور میں جٹھانی اور دیوارنیوں کے ساتھ چھوٹے چچا، یعنی دادا کے سب سے چھوٹے بھائی کے مستقل چٹکی کاٹنے اور خرچ کے لیے ترسانے کا شکار تھیں۔ موصوف تار کے محکمے میں انسٹرکٹر تھے اور گھر میں عورتوں کے کان بھی ان کی انسٹرکشنز سننے کے عادی تو نہیں پک ضرور گئے تھے۔

بہر حال دادی اور گھر کی ایک اور خاتون نے جو بے اولاد تھیں بہتری گورکھپور کو خدا حافظ کہنے میں سمجھی۔ دہلی میں دونوں نے میڈیسن کا کوئی سال بھر کا کورس کیا اور میری کہانی میں دادی اس وقت داخل ہوئیں جب میں پیدا تو ہو چکا تھا لیکن آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ مجھے اچھّن میاں کہتی تھیں۔

''محل'' وہی مکان جو میاںجی محمد علی نے میر عنایت علی کو دیا تھا اب دادی کی قیام گاہ بھی تھا اور کلینک بھی۔ چھوٹی پھوپھی ان کی کمپاؤڈر بنیں۔ اس چھوٹے سے شہر میں جہاں سب، سب کو جانتے ہوں گے گھر کے باہر نام کے بورڈ کی کیا ضرورت تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہوگا۔ مریض عورتیں بچوں کے لئے دن بھر آتی رہتی تھیں۔ دادی ڈاکٹرنی کے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ وہ مریضہ سے پوچھ گچھ کے بعد بغیر نسخہ لکھے ''کمپوڈر'' کو بتاتی جاتی تھیں فلاں پاؤڈر اتنا، فلاں ٹنکچر اتنا، فلاں اسپرٹ اتنی۔۔۔لیکن آخری جزو اکثر باعث نزاع ہوتا تھا۔ وہ کہتیں پانی اتنے اونس تو ہندو عورتیں ہڑابڑا کر کہتیں ''پانی نہیں'' وہ ہم گھر میں ڈال لیں گے۔ دادی نے صلح پسندی سے پانی کی جگہ ایکواAqua کہنا شروع کر دیا جو بھری بوتل سے مکسچر میں ڈال دیا جاتا ہوگا۔ چلو تم بھی خوش ہم بھی خوش۔

اسکول کے زمانے میں والد صاحب کی کتابوں میں دو کتابیں مجھے دادی کی بھی ملیں۔ دونوں ڈبلن، آئرلینڈ کی چھپی ہوئی۔ ایک کا نام تھا Rotunda Midwifery۔ دادا کے چمڑے کے بیگ میں جہاں اور چیزیں تھیں ایک چمڑے کا خول چڑھی قینچی بھی تھی جس کے ایک بلیڈ پر پیمانہ کندا تھا۔ نال کاٹنے اور ناپنے کا اوزار؟

کمپاؤنڈر کو نسخہ لکھ کر دینے کی جگہ اجزا کا فرمان سنانا میں نے دوسرے معالجوں کے ہاں مرادآباد میں بھی دیکھا اور لاہور میں بھی۔۔۔لاہور میں ہمارے پہلے فزیشن اللہ بخش کے مکسچر کا آخری جزو سیرپ ٹولُو ہوتا تھا۔

میں ہفت خوان تو نہیں ۳ خوان رستم بچپن میں ضرور تھا۔ موت سے تین بار مقابلہ ہوا۔ حالات سدھرتے نہ دیکھ کر والد صاحب نے ہلدوانی کا رخ کیا تھا اور وہاں وہ کام کیا جو خاندان میں کسی نے نہیں کیا تھا اور جو اُن کے بس کا نہ تھا۔ دکانداری۔

ہلدوانی نینی تال سے نیچے اتر آنے کے بعد ہمالیہ کی ترائی کا ایک شہر ہے۔ بیچ میں کاٹھ گودام پڑتا ہے۔ شہر کے پاس بیچ میں جو پہاڑی ندی شور مچاتی ہوئی گزرتی ہے اس کا نام میں نے والدہ سے گولا (بروزن مولا) سُنا تھا۔ ہلدوانی میں دادا نے جو معمولی قسم کے چند مکانوں کی جائیداد چھوڑی تھی اُن میں سے ایک میں والد صاحب اپنے مختصر کنبے کے ساتھ جا براجے۔۔۔ پاپا خود، ممی، آپا اور میں۔ میں تب گھٹنوں چلتا تھا۔ اس دکان کے لیٹر پیڈ (سرنامہ) کے کچھ کاغذات اسکول کے زمانے میں میرے ہاتھ بھی آئے تھے۔ S.M. Hasan Jafrey & Son۔۔ فوٹو گرافی کی سلائیڈ سازی اور دکان کی نوعیت، ہلدوانی۔ ایک دن میری ماں جب باورچی خانے سے اس کمرے میں آئیں جس میں مجھے فرش پر چھوڑ کر گئی تھیں تو ان کی چیخ نکل گئی۔ وہ علاقہ ہر قسم کی مخلوق کا گھر ہے۔ کمرے میں ایک بڑا سانپ سر اٹھائے مجھے اپنی آنکھوں سے مسحور کر رہا تھا اور میں یعنی ایس ایم حسن جعفری اینڈ سن کا جزو دوم نہایت خوش اُسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ نہایت ڈرپوک تھیں۔ پیلی آندھی اور کالی آندھی کو کاٹنے کے لیے دعا پڑھتی تھیں، آسمان کی کڑک چمک کو قرآنی آیت سے روکتی تھیں اور کوئی زیادہ خطرے کی بات ہو تو قرآن مجید کھول کر بیٹھ جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت انہیں ہمت نے اتنا جوش مارا کہ وہ مجھے بلا تردد ایک جھپٹے میں باہر لے گئیں۔ خیر وہ دکان زیادہ دن نہیں چلی اور یہ مختصر خاندان ہاپڑ لوٹ آیا۔

میرے نانا قاضی عاشق حسین اسٹیشن ماسٹر تھے اور ان کی پوسٹنگ زیادہ تر چھوٹی جگہوں پر رہی۔ انہیں گھر بھی ریلوے اسٹیشن سے ملے ہوئے ملتے تھے۔ ایک موقع پر اُن کا مستقر مسیت تھا۔۔۔غالباً مسجد کا دیہاتی بدل۔ کوارٹروں کے پیچھے سے ریلوے لائن جاتی تھی۔ ایک دن ان کے سامنے ایک ٹرین چلی اور وہ جا کر اپنے کمرے میں ابھی بیٹھے ہی تھے کہ وہ آوازیں بلند ہوئیں جو انجن کے بریک لگنے، ٹرین کے اچانک رکنے اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہیں، ساتھ ہی انجن کی سیٹیاں۔ وہ گھبرا کے کمرے سے نکلے اور ٹرین کو رکے دیکھ کر بھاگتے ہوئے انجن تک پہنچے کہ کیا معاملہ ہے۔ اس سے پہلے کہ انہوں نے ڈرائیور سے کوئی سوال کیا ہو اس نے انہیں ریل کی پٹڑی کی طرف دیکھنے کا اشارہ

کیا۔ یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ وہاں ایک بچہ اپنی دُھن میں ہر قسم کے خطرے سے بے خبر کچھ نئی چیزوں کا لطف لے رہا تھا۔ وہ مجھے اٹھائے ہوئے غصے سے کھولتے گھر میں آئے کہ اتنی عورتوں ہیں اور ایک بچے کی حفاظت کسی سے نہیں ہوسکتی۔ فردوسی لکھتا: یہ دوسرا ہفتخوان تھا جو میں نے سر کیا تھا۔

اب پھر یادداشتوں کی انہی سُوڈوپوڈیا (جھوٹے پاؤں) سے میرا واسطہ ہے۔ مائیکروسکوپ کے لینس کے نیچے امیبا کو دیکھنے والا یہ نہیں جان سکتا ہے کہ اب یہ کس طرف کو اپنا پیر نکالے گا اور میری توجہ کو بے ترتیب کردے گا۔ میں بھی اپنی اس متاع زندگانی میں واقعات کو ترتیب سے دیکھنے سے قاصر ہوں۔ قصہ میرے موت سے مقابلے کا ہے جو ہاپڑ کے دنوں کو راہ سے ہٹا کر نمودار ہو رہا ہے۔

میں جب اردو کی کتاب ’’شہنشاہ ریڈر‘‘ حصہ اول گھر پر پڑھتا تھا بیمار پڑا۔ رات کو بڑی بہن کے ساتھ کھیل رہا تھا جو روز کا معمول تھا لیکن اس دن مجھ سے کھیلا نہیں جا رہا تھا۔ طبیعت گری گری سی نہیں ڈوبی ہوئی تھی۔ سر اور ریڑھ کی ہڈی میں درد تھا۔ کمزوری اتنی تھی کہ اگر مجھ سے دوڑ کر کوئی چیز لے آنے کے لیے کہا جاتا تو دو قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ کھانا بھی نہیں کھا سکا۔

مراد آبادی میں ایک ہومیو پیتھ تھے جن کے سر کے پچھے حصے پر ایک اتنا بڑا اٹیومر تھا کہ لگتا تھا کہ ان کے دو کھوپڑیاں ہیں۔ وہ اس اضافی کھوپڑی پر بھی کنگھا کرتے تھے اور ہم انہیں دو کھوپڑیوں والا ڈوکٹر کہتے تھے۔ مجھے ان کی دوا پسند تھی اور ایک موقع پر درد کا بہانہ کر کے بھی میں نے ان کی چھوٹی سفید گولیاں لی تھیں۔ والد صاحب اپنے ملنے والوں سے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے میں ساتھ تھا کہ درد اٹھا تھا۔ مگر جس شدید کمزوری والے بخار کا ذکر ہے اس پر سفید گولیاں کارگر نہیں ہوئیں اور ڈوکٹر داس کو بلایا گیا جو بنگالی تھے اور پاپا کو زافری صاحب کہتے تھے۔ ان کا فرمانا کہ ٹائیفائڈ ہے۔ گویا یہ کہنا تھا کہ نہیں بچے گا۔

میرے تایا سید ظل الرحمٰن سول جج بجنور کی بیٹی زہرہ جو مجھ سے اور میری بہن سے بڑی تھیں میری بیماری سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس بخار سے اس انجام کو پہنچی تھیں کہ ایک دن تایا کا خط آیا کہ میری بیٹی زہرہ اس وقت حوروں سے کھیل رہی ہوگی۔

سامنے کے گھر کی لڑکی جوہر بھی جنت کے اس کھیل میں شریک ہونے کو ایک دن چلتی بنی اور رشتے داروں جیسے ملنے والے ایک گھرانے کی لڑکی رضیہ بھی۔

وہ دور اینٹی بائیوٹیکس کے دریافت ہونے سے پہلے کا دور تھا۔ خاص طور سے کلوروما ئی سیٹین کے دریافت ہونے میں ابھی دس بارہ سال پڑے تھے۔ پروگنوسس Prognosis ایک ہی ہوتا تھا بچنے کا مدھم امکان۔ اور علاج: ہر ٹھوس چیز کے منہ میں جانے کی ممانعت، حتی کہ پانی کے سوا دودھ کے باقی اجزا ک بھی اور مکمل آرام جو اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے کی اجازت تک نہیں دیتا تھا۔ ورنہ آنتوں کے پھٹ جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔

پاپا نے دو مہینے کی چھٹی لے لی، ڈوکٹر داس دیکھنے کے لیے روز آتے تھے، دو روپے ان کے گھر آنے کی فیس تھی اور مجھے دودھ کو پھاڑ کر اس کا پانی دیا جاتا تھا۔

میں سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور بے سدھ پڑا رہتا تھا۔ ایک دن جب پاپا گھر لوٹے تو انہیں ممی نظر نہیں آئیں۔ وہ گھبرا کر انہیں تلاش کرتے بیگم، بیگم کی آوازیں دیتے ہوئے گھر میں ادھر اُدھر پھرے، وہ دور کی چھت پر انہیں روتی ہوئی ملیں اور ان کا ایک ہی جملہ وہ سن سکے ’’ممّو نہیں بچے گا‘‘

اس تین دفعہ موت کے منہ سے نکل آنے اور بعد میں پیش آنے والے حادثات اور شدید ترین بیماریوں سے بچیوں نے (اپنے اور اپنوں کے) مجھے زندگی کے ایک بھید سے آگاہ کیا کہ کچھ بھی ہو زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ تا عمر غیر مبدّل Constant رہتا ہے۔ ایک ہندسہ جسے صرف نا معلوم کہا جا سکتا ہے۔

اور ٹائیفائڈ کی آمد کے کیا آثار ہوتے ہیں مریض دیکھتے ہوئے ہمیشہ کام آئے۔ پوچھنے پر جب مریض کہتا ہے دوڑنا کیا اس سے دو قدم نہیں چلا جا رہا ہے تو کسی ٹیسٹ کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور میں سمجھ جاتا ہوں میرا بچپن کا بن بلایا مہمان ہے۔

...... آفتابِ داغ ......

اشرف جاوید جدید اردو غزل کی پہچان ہے اور شاعری میں اپنی جداگانہ حیثیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اب وہ تحقیق و تنقید کی راہ پر گامزن ہوا ہے، تو یہاں بھی اس نے اپنی الگ راہ بنالی ہے۔ مرزا داغ دہلوی کا پہلا مجموعہ کلام ’’آفتابِ داغ‘‘ مرتب کرتے ہوئے اس کے تنقیدی اور تحقیقی جوہر وامکان کھل کر سامنے آئے ہیں۔ داغ کی شاعری کو جس رُخ سے اشرف جاوید نے دیکھا ہے، اس جانب تو بڑے بڑے چغادری قسم کے نقادوں نے قلم پیمائی کی جرأت نہیں کی، پھر اس نے حواشی لکھتے ہوئے بھی ایک نئی روایت اور ایک نئی ریت ڈال دی ہے۔ ’’آفتابِ داغ‘‘ کا دیباچہ پڑھ کر ایک اور طرح کے داغ سے مکالمہ ہوتا ہے۔ یقیناً اب آفتابِ داغ بلکہ داغ کی پوری شاعری کو اس نئے تناظر میں بھی دیکھا جائے گا۔ مجھے اشرف جاوید کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو میری اس بات کی تائید بھی کرتا ہے۔

اِک نئی راہ بناتا چلا جاتا ہوں سخن میں
یہ بھی ممکن ہے کہ اس رہ پہ زمانہ نکل آئے

قیمت: ۴۹۰ روپے، دستیابی: جمہوری پبلیکیشنز، لاہور

احمد عقیل روبی

برطانیہ میں عیدیں

یعقوب نظامی

(برطانیہ)

برطانیہ میں عید کے تہوار جوش وجذبہ کے ساتھ منائے جاتے ہیں ...... نیا لباس، نماز عید، رشتہ داروں اور دوست احباب سے ملاقاتیں، بچوں کو عیدی دینے کے ساتھ ساتھ لذیز کھانے ...... یہ عید کی لوازمات ہیں ...... اور ہاں ایک بات میں بھول گیا ...... چاندرات ...... بریڈفورڈ، مانچسٹر، شفیلڈ، برمنگھم، گلاسگو اور لندن کے کچھ حصے جہاں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں وہاں کچھ عرصہ سے چاندرات بازار بھی سجائے جاتے ہیں ...... خواتین اور بچے ان بازاروں کی رونقیں بڑھاتے ہیں ...... جہاں مہندی کے سٹال، چوڑیوں کی چھنکار، فیشن، میک اپ اور اس طرح کے کام جو آخری وقت پر موقوف رکھے جاتے ہیں ...... انگریز خواتین بھی چاندرات بازار میں جاتی بلکہ کچھ دل پھینک گوریاں چوڑیاں خریدتی اور حنا آرٹسٹ کے سامنے ہاتھ پھیلائے مہندی لگواتی نظر آتی ہیں ...... کچھ شلوار قمیض بھی پہنتی ہیں ...... بازار میں رش اتنا ہوتا ہے کہ بس یہی سمجھیے کہ ...... کھوے سے کھوا چھلنا ...... والے مناظر ہوتے ہیں۔ چاندرات کا اہتمام خصوصی طور پر خواتین ہی کرتی اور اُس کی رونقیں بڑھاتی ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے برطانیہ کے مختلف شہروں میں عید میلوں کا رواج بھی چل نکلا ہے ...... اگر موسم ٹھیک ہوتو اس طرح کے میلوں کا اہتمام عوامی پارک میں ہوتا ہے ...... جہاں ڈھول کی تھاپ پر نوجوان رقص کرتے اور کاروباری حضرات بازار سجاتے ہیں ...... اگرچہ عید بیت چکی ہوتی ہے لیکن پھر بھی خریداری کے شوقین بلکہ یوں سمجھئے کہ اس مرض میں مبتلا خواتین اور بچے خرید وفروخت بھی کرتے ہیں ...... عید میلے پر ہلکے پھلکے پکوان کے سٹال جہاں چٹ پٹے چاٹ، سموسے، پکوڑوں کے ساتھ ساتھ گرما گرم جلیبی بھی تازہ تازہ تیار کرکے فروخت کی جاتی ہے۔ بازار کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے جھولے بھی خصوصی طور پر لگائے جاتے ہیں ...... میوزک کا بھی اہتمام ہوتا ہے جہاں برصغیر سے آئے ہوئے آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ ایشیائی طرز کی باتیں ہیں۔ اب برطانیہ میں عرب ممالک سے بھی دس لاکھ کے قریب قریب مسلمان آباد ہو چکے ہیں۔ عرب مسلمان عید کا تہوار تو ہماری طرح ہی مناتے ہیں لیکن چاندرات اور عید میلے کی بجائے وہ پورا ماہ صیام میں میلے کا سماں ہی پیدا کیے رکھتے ہیں ...... ان کے جشن کا مرکز مساجد ہیں جہاں افطار کا اہتمام اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ منظر عید سے کم نہیں ہوتا ...... اللہ تعالیٰ نے عربوں کو جہاں دولت دی وہاں انہیں سخاوت سے بھی نوازا ...... چنانچہ افطار کے موقع پر انواع اقسام کے کھانے ...... روسٹ گوشت، روسٹ مرغ، مختلف اقسام کے پلاؤ، مشروبات اور پھلوں سے دسترخوان سجاتے ہیں ...... ان مساجد میں جو بھی چلا جائے مخیّر حضرات بڑی منت سماجت کرکے انہیں دسترخوان پر بیٹھا کر افطار کرواتے بلکہ اتنا کھلاتے ہیں کہ پھر چوبیس گھنٹے کھانے کی حاجت نہیں رہتی ...... مساجد میں خواتین کے لیے بھی الگ اہتمام ہوتا ہے چنانچہ مرد، بچے اور خواتین سب مساجد میں افطار کرتے ہیں ...... عید کے دن بھی اجتماعی عید کا بندوبست کرتے ہیں ...... جہاں ہر خاندان کھانا پکا کر لاتا ہے اور پھر سب مل کر کھانا کھاتے اور عید سعید کی خوشیاں مناتے ہیں۔

برطانیہ میں عیدگاہوں کی بجائے نماز عید مساجد میں ادا کی جاتی ہے ...... مساجد میں گنجائش کم ہوتی ہے یوں نماز عید ایک سے زائد بار پڑھائی جاتی ہے ...... اگر پہلی نماز آٹھ بجے تو دوسری نو اور تیسری دس بجے پڑھائی جاتی ہے ...... یوں تقسیم سے عید کے جشن کچھ ماند اور اسلام کا اجتماعیت کا تصور پھیکا پڑا جاتا ہے۔ برطانیہ کی وہ مساجد جہاں عرب ممالک کے مسلمانوں کی اکثریت اور وہی اُس کا نظام بھی چلاتے ہیں ...... اُن کے اجتماع کی نوعیت ہم سے اس لیے مختلف ہوجاتی ہے کہ اُن مساجد میں خواتین بھی شامل ہوجاتی ہیں جن کے لیے مسجد میں الگ انتظام ہوتا ہے ...... عربوں کے برعکس ہماری ایشیائی مساجد تو خواتین کے لیے بالکل ممنوع بنا دی گئی ہیں ...... اب برطانیہ میں عربوں کی دیکھا دیکھی ایشیائی مسلمانوں نے بھی مساجد میں خواتین کے لیے الگ جگہ کا اہتمام شروع کردیا ہے۔

نماز عید کے بعد مسلمان ایک دوسرے کو گلے ملنے کے بعد اکثریت مقامی قبرستان چلی جاتی ہے ...... عید کے دن برطانیہ کے مسلم قبرستانوں میں اس قدر لوگ ہوتے ہیں کہ یہ منظر بھی میلے سے کم نہیں ہوتا ...... قبریں پھولوں سے لد جاتی ہیں ...... لوگ اپنے پیاروں کی قبروں کے قریب کھڑے یا بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت کرتے نظر آتے ہیں ...... یہ بڑا پرنور منظر ہوتا ہے جہاں فضائیں تلاوت قرآن پاک اور دعاؤں سے گونج رہی ہوتی ہیں ...... قبرستان کے بعد گھروں میں کھانے پینے کا دور چلتا ہے ...... دوست واحباب اور رشتہ داروں کا آنا جانا رات گئے بلکہ دوسرے اور تیسرے دن تک جاری رہتا ہے ...... برطانیہ میں اسلامی ممالک سے ایک چیز مختلف ہے کہ یہاں عید کے موقع پر چھٹی نہیں ہوتی ...... سکول، دفاتر اور دوسرے ادارے کھلے رہتے ہیں ...... ایسے میں مسلمان عید کے دن چھٹی لیتے ہیں ...... لیکن اس میں کچھ بدمزگی بھی پیدا ہوجاتی ہے جب علماء اپنے اپنے مکتبہ فکر کے جھنڈوں تلے عید ایک دن کرنے پر راضی نہیں ہوتے ...... علماء کے اختلافات کی وجہ سے اگر ایک گھرانہ عید منا رہا ہے تو ممکن ہے پڑوسی روزے میں ہوں بلکہ بعض اوقات گھروں میں بھی دو دو عیدیں منائی جاتی ہیں۔ یہ المیہ افسوس ناک ہے ...... عرب ممالک کی اکثریت سعودی عرب کے ساتھ آغاز رمضان اور عیدین مناتے ہیں ان کے ساتھ برصغیر کے اہل حدیث بھی شامل

ہوجاتے ہیں......جبکہ بریلوی مکتبہ فکر برطانیہ کے مقامی چاند طلوع اور غروب کے مطابق رمضان کا آغاز اور اختتام کرتے ہیں......کمال کی بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے مطابق عیدیں منانے والے برطانوی مسلمان روزے کا آغاز، افطار، پانچ نمازیں برطانیہ کے اوقات کے مطابق ادا کرتے ہیں......لیکن جوں ہی عید کا وقت آتا ہے یہ برطانیہ کی بجائے سعودی عرب کی پیروی شروع کردیتے ہیں......یوں علماء دین اس مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے اس میں مزید خلیج پیدا کر کے ایک غیر اسلامی ملک میں دین اسلام کو بدنام کرنے کا سامان مہیا کرنے میں بالکل ڈرتے نہیں۔

عید ایک اسلامی تہوار ہے......برطانیہ ایک ایسا ملک ہے جہاں دنیا کے ہر ملک کے لوگ آباد ہیں......اس طرح یہ ایک کثیر الامذاہب، کثیر الازبان اور کثیر الاتہذیب سوسائٹی بن چکی ہے......تارکین اپنے ساتھ مذہب کے علاوہ اپنی تہذیب وتمدن بھی لے آئے پھر اُسے مقامی کلچر کے ساتھ مطابقت رکھنے کی خاطر وقت کے ساتھ ساتھ اُس میں تغیر یا پھر مختلف تہذیبوں کے درمیان رہنے سے لین دین کے مرحلے طے ہوتے ہوتے ہر تہذیب نے کچھ کھویا اور کچھ پایا......مقامی تہذیب وتمدن اگرچہ بہت ہی مضبوط ہے لیکن اسلامی کلچر نے بھی اپنی چھاپ مقامی لوگوں پر اس طرح لگائی کہ ان میں بھی تبدیلی آئی......یوں کچھ لین اور کچھ دین میں آہستہ آہستہ ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے جس میں برصغیر کے ساتھ ساتھ عرب تہذیب کی جھلک بھی واضح نظر آرہی ہے......آج برطانیہ میں تیس لاکھ کے لگ بھگ مسلمان آباد ہیں......جن میں دس لاکھ پاکستانی اور کشمیری مسلمان ہیں......جبکہ بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی تعداد بھی آٹھ لاکھ کے قریب ہے......حالیہ جنگوں میں جب افغانستان، عراق لپیٹ میں آئے تو بڑی تعداد میں مسلمانوں نے برطانیہ سمیت یورپ کے مختلف ممالک میں پناہ لی۔ پھر عرب میں جمہوریت کے نام پر......جمہوری بہار کی لہر اٹھی تو مصر، لیبیا اور شام میں بہار کی بجائے خزاں نے ڈیرے ڈالے تو ان ممالک کے مسلمانوں نے ایک بار پھر مغرب کا رخ کیا۔ فلسطین، یمن، صومالیہ اور افریقی ممالک کے مسلمانوں نے اس ملک میں پناہ لی......یوں برطانیہ میں برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عرب اور افریقی ممالک سے ایک بڑی تعداد برطانیہ پہنچی۔

برطانیہ میں اسلام ایک ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا آرہا ہے۔ ساتویں صدی میں برطانیہ کے ایک اینگلو سیکسن بادشاہ ''افا آف مرسیا Offa of Mercia'' کے مسلمانوں کے ساتھ رابطے تھے۔ اس کی حکومت انگلینڈ کے موجودہ علاقہ مڈلینڈ برمنگھم، گلاسٹر شائر، آکسفورڈ اور چیسٹر تک تھی۔ یہ بادشاہ اسلام کیلئے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے سکوں پر ''لا الٰہ اللہ'' کے لفظ عربی میں کندہ کروائے تھے۔ یہ سکے اب بھی میوزیم میں موجود ہیں۔ افا آف مرسیا کا انتقال 796ء میں ہوا۔ انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم کا اتالیق ایڈلارڈ باتھ 1125ء میں شام گیا جہاں اس نے عربی زبان سیکھی۔ اور پھر عربی کی کچھ تحریروں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ بارھویں صدی میں برطانیہ کے بادشاہ کنگ جان نے میتھیو پیرس نامی ایک شخص کو 1213ء میں شمالی افریقہ کے بادشاہ محمد الناصر کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا کہ برطانیہ سپین کے کیتھولک بادشاہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ 1386ء میں برطانوی سکالر رازی، ابن سینا اور ابن رشد جیسے مسلم سکالروں سے واقف ہو چکے تھے۔ مشہور مسلمان سکالر ابو وفا مبشر ابن فتح کی کتاب ''مختار الحکمه و محسن الحکمه'' کا 1477ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

16 نومبر 1913ء میں برطانوی تاریخ میں اُس وقت ہلچل پیدا ہوئی جب لارڈ ہیڈلی حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور اپنا اسلامی نام شیخ رحمت اللہ الفاروق منتخب کیا۔ لارڈ ہیڈلی 1855ء میں پیدا ہوئے۔ 1877ء میں انہیں لارڈ کا عہدہ ملا۔ 1916ء میں لارڈ ہیڈلی نے سکریٹری آف سٹیٹ آسٹن چیمبر لین کو خط لکھ کر تجویز پیش کی کہ جنگ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے جنگ میں شریک ہو کر شہید ہونے والے مسلمانوں کی یاد میں لندن میں مسجد تعمیر کی جائے۔ 29 نومبر 1917ء میں مسلم لٹریری سوسائٹی میں مارمیڈیک پکتال نامی ایک صاحب جو ایک عیسائی مبلغ کے بیٹے تھے نے سوسائٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور اپنی تقریر کے اختتام پر حلقہ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کیا۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے پہلی بار قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ جنگ عظیم اول میں پکتال نے برطانوی فوج میں رہ کر ترکوں کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 1924ء میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک اور معزز فرد سر آرچی بولڈ ہملٹن نے اسلام قبول کیا۔ اور اسلامی نام عبداللہ آرچی بولڈ پسند کیا۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے فرسٹ کزن اور لارڈ ہیڈلی کے بہترین دوست تھے۔ ممکن ہے لارڈ ہیڈلی کے اثر سے انہوں نے اسلام قبول کیا ہو۔ بیگم لیڈی آرچی بولڈ بھی دین صداقت میں شامل ہوئیں۔ اسی طرح برطانوی فوج کے ڈپٹی سرجن جنرل چارلس ولیم ہملٹن نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ جنرل چارلس 1882ء میں مصر میں فوجی خدمات انجام دے چکے تھے۔ انہوں نے اسلامک ریویو میگزین میں خط لکھ کر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ دین اسلام میں شامل ہو چکے ہیں۔

مسلمان برطانیہ میں قلیل تعدا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے۔ ان میں اضافہ جنگ عظیم دوئم کے بعد ہوا جب ہندو پاک اور مشرق وسطیٰ سے کافی تعداد میں مسلمان برطانیہ آئے۔

برطانیہ میں پہلی مسجد 1799ء میں سلطنت عثمانیہ کے سفیر نے لندن اپنے گھر کے قریب جارج سٹریٹ پورٹمین سکوائر میں قائم کی تھی۔ جہاں سفارت خانہ کا مسلمان عملہ نماز ادا کرتا تھا۔ سفارت کاروں کے علاوہ لندن میں مقیم مسلمان بھی اسی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ زمین خرید کر تعمیر ہونے والی پہلی مسجد ووکنگ کے مقام پر 1889 میں ڈاکٹر لائٹنر نے تعمیر کی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے سابق

رجسٹرار ڈاکٹر لائٹنر (Dr.Leitner) جب ریٹائرڈ ہو کر واپس انگلستان آئے تو یہ سوچتے ہوئے آئے کہ یہاں ایک مشرقی دارالعلوم قائم کریں گے۔ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لندن شہر سے تیس میل کے فاصلہ پر ایک خوبصورت قصبہ ووکنگ (Woking) کا انتخاب کیا۔ ان دنوں ملکہ بھوپال شاہ جہاں بیگم اپنے بیٹے کے علاج کے لیے لندن میں مقیم تھیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کے کہنے پر ملکہ بھوپال نے اپنی جیب سے ووکنگ کی تاریخی مسجد 1889ء میں تعمیر کرائی۔ برطانیہ میں تعمیر ہونے والی یہ سب سے پہلی مسجد تھی۔ مسجد تعمیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد 1899ء میں ڈاکٹر لائٹنر کا انتقال ہو گیا اور یوں پورے منصوبے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ لیکن جان جے پول کا خیال مختلف ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''سٹیڈیز ان ممڈنزم'' (Studies in Mohammadanism) مطبوعہ 1982ء میں لکھا ہے۔ کہ برطانیہ میں پہلی مسجد 1887ء میں لیور پول میں قائم ہوئی۔ یہ مسجد ایک انگریز وکیل ہنری قویلم (W.H.Quillum) نے 1884ء میں مراکش کا دورہ کرنے کے بعد اسلام قبول کر کے ماؤنٹ ورنن سٹریٹ میں ایک گھر کو مسجد میں تبدیل کر کے قائم کی تھی۔ اس مسجد میں شروع میں صرف چار مسلمان نماز ادا کیا کرتے تھے۔ 1889ء میں یہ مسجد ویسٹ ڈربی روڈ پر منتقل کر کے اسے لیور پول مسلم انسٹی ٹیوٹ کا نام دیا گیا۔ 1860ء میں کارڈف میں گلن رونڈا اسٹریٹ کے مکان نمبر 2 میں مسجد تھی۔ 1930ء میں نیوکاسل کے نزدیک ساؤتھ شیلڈ میں خالد شیلڈرک نے مسجد کی بنیاد رکھی۔ 1938ء میں اس چھوٹے سے ساحلی قصبے میں سات سو مسلمان آباد ہو چکے تھے۔ 1934ء میں ایسٹ لندن میں جمعیت المسلمین کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کے صدر ڈاکٹر قاضی منتخب ہوئے۔ انہوں نے برمنگھم، مانچسٹر اور گلاسگو میں اپنی شاخیں قائم کیں۔ تنظیم نے برطانیہ کے بڑے بڑے شہروں میں مساجد قائم کرنے کی غرض سے ٹرسٹ قائم کیے۔ اس ٹرسٹ کے پہلے چیئرمین لارڈ ہیڈلی تھے۔ جن کی وفات کے بعد اس کے چیئرمین سر حسین سہروردی مقرر ہوئے تھے۔ 24 اکتوبر 1940ء کو برطانیہ کے وزیراعظم چرچل نے لندن کی مرکزی مسجد کیلئے فنڈز دینے کا اعلان کیا۔ 1941ء میں ایسٹ لندن مسجد اور اسلامک کلچرل سنٹر کا افتتاح لندن میں مصر کے سفیر نے کیا تھا۔ 1943ء میں جمعیت اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام گلاسگو میں پہلی مسجد 27/29 آکسفورڈ سٹریٹ میں قائم ہوئی تھی۔ آج برطانیہ میں ایک ہزار کے لگ بھگ مساجد ہیں۔ لندن میں ریجنٹ پارک کی مسجد، برمنگھم کی مرکزی مسجد، مسجد گھمگول شریف، لیوٹن کی مرکزی جامع مسجد، بریڈفورڈ کی مسجد حنفیہ، جمعیت تبلیغ اسلام کی مرکزی مسجد، ڈیوزبری کی مرکزی مسجد، لیڈز کی جامع مسجد، گلاسگو کی جامع مسجد سمیت بہت سی ایسی مساجد موجود ہیں جو باقاعدہ نقشوں کے مطابق تعمیر کی گئی ہیں۔ جو بہت خوبصورت اور دلکش ہیں۔ جن لوگوں نے اس نیک کام کی بنیاد رکھی خدا انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ ان عظیم لوگوں کی وجہ سے آج دیار فرنگ کے ہر اس شہر میں جہاں مسلمان ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت مسجد نظر آتی ہیں۔

بقیہ : ''بے ڈھب''

''شازیہ کو لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق ہے باؤجی۔''

اس نے، یعنی شازیہ کی ماں نے مزید تعارف کرایا۔

''ہاں لکھنا پڑھنا بہت اچھی بات ہے۔''

شازیہ کرسی پر بیٹھی سکڑنے سمٹنے کا عمل دھراتی رہی اور اس کی ماں الٹی پلٹی باتوں سے میرا مغز چاٹتی رہی۔ اور پان چبا چبا کر باتیں بتاتی رہی۔ میں الجھتا رہا۔۔۔ کڑھتا رہا۔۔۔ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں میرے خدا۔ ان بلاؤں سے کیسے چھٹکارہ حاصل کروں۔ مسلسل سوچ سوچ کر میں تھک چکا تھا۔ نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مغرب کی اذان ہوئی تو میں نے اٹھ کر بتی جلائی اور کاغذات سمیٹنے لگا۔ وہ بولی:

''کیا چل دیے باؤجی''

''ہاں''

''کدھر''

''بھئی اب گھر نہ جاؤں؟''

''اسے ذرا کچھ سکھاتے تو جاؤ باؤجی۔'' اس کے چہرے پر لجاجت اور عیارانہ سی مسکراہٹ تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ وہ جلدی سے بولی ''اتنے میں تمہارے پڑوسی کی خیر خبر لے آؤں۔ ناس پیٹا میری راہ دیکھتا ہوگا۔ اس کی جورو اپنے میکے گئی ہوئی ہے نانواں بچہ۔۔۔'' وہ مسکرا کر اٹھی اور بل کھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے جاتا دیکھ کر شازیہ کچھ اور لجائی شرمائی اور سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور اس ایک لمحے میں جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ میں پھرتی سے اٹھا۔ اپنی کرسی کو ایک طرف کھسکایا۔ اور شازیہ کو بازو سے پکڑ دروازے سے باہر دھکا دے دیا۔

''یہ ایک ادبی رسالے کا دفتر ہے کوئی قحبہ خانہ نہیں۔''

غصے کی شدت سے میرا جسم کانپنے لگا اور تنفس تیز ہو گیا۔

شازیہ لڑکھڑا کر جاتی ہوئی ماں کی پشت سے ٹکرائی۔ اتنی دیر میں مَیں دروازے کی کنڈی چڑھا چکا تھا۔ اور بند دروازے کے پیچھے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شازیہ پر برس پڑی۔

''کمشتی۔۔۔ حرامزادی ایک بابو کو قابو نہیں کر سکی۔ اپنا آپ بیچ کر میں کب تک تیرے فیشن پورے کرتی رہوں گی۔''

''ماں وہ بابو مرد ہی کب ہے جس کے پاس تو مجھے چھوڑے جا رہی تھی۔ وہ مرد ہوتا تو۔۔۔'' شازیہ کی آواز رندھ گئی۔

اور پھر خاموشی چھا گئی۔

صرف ایک آواز تھی جو باقی رہ گئی تھی اور وہ تھی میرے دل کی دھڑکن!

''جوشِ جنوں''

مزاجِ قلندری

محمودالحسن (راولپنڈی)

خود ہی سمٹ گئے رہِ جاناں کے پیچ وخم
جوشِ جنوں شوق سے تھمتے نہ تھے قدم

ناکامیوں کا اپنی کسی سے ہو کیا گِلہ
بے اختیار آپ تھے ، بے اختیار ہم

دُہرا رہے ہیں، شبنم وگُل کی حکایتیں
اُن کا تبسّم اور ہماری یہ چشمِ نم

یارب مجھے عطا ہو مزاجِ قلندری
یثرب کی مے ہو اور ہو خُمخانہِ عجم

یہ بھی ہے ایک معجزہ میرِ حجازؐ کا
مرکرہی اُس کی راہ میں آتا ہے دم میں دم

جنت میں کیا ہے آپؐ کے دیدار کے سوا
ہم آج بھی ہیں دل کو بنائے ہوئے اِرم

مجھ کو تو آپ دیجئے جامِ سفال میں
میری طلب تو نشہ مے ہے نہ جامِ جم

محروم ہم بھی ہیں، تو ہیں محروم آپ بھی
دیوانگی سے آپ ہیں، فرزانگی سے ہم

یُوں مشغلہ تو سنگ تراشی نہ تھا مرا
سُن کر خدا کا میں نے تراشے کئی صنم

محشر میں اُن کی شانِ کریمی تھی موج میں
محمودؔ رہ گیا مری نیکی کا یُوں بھرم

○

در آیا ہے تاریخ میں جو لمحۂ منحوس

شبنم رومانی

(●)

در آیا ہے تاریخ میں جو لمحۂ منحوس
فریاد و فغاں اُس کی تلافی تو نہیں ہے
دیکھو۔۔۔کہ بہت سخت ہے اللہ کا قانون
قدرت کے یہاں عام معافی تو نہیں ہے
اسلام ہے انسان کی عظمت کا وسیلہ
اسلام' ترقّی کے منافی تو نہیں ہے
قوّت بھی ضروری ہے 'تدبّر بھی ضروری
نعرہ ہی فقط جنگ میں کافی تو نہیں ہے
ملتا ہے یہ انعام مسلسل تگ و دَو سے
کہتے ہیں جسے ''فتح''اضافی تو نہیں ہے
نصرت کا جو وعدہ ہے وہ ہے وعدۂ مشروط
اللہ کی یہ وعدہ خلافی تو نہیں ہے

☆

تاریخ سے لیتے ہیں سبق اہلِ بصیرت
پھر ازسرِنو ملک کو تعمیر کیا جائے
روٹھے ہوئے ہر بھائی کو سینے سے لگا کر
کھوئے ہوئے ہر شہر کو تسخیر کیا جائے
حالات کا رُخ موڑ دیا جائے نئی سمت
جذبات کو اب تابعِ تدبیر کیا جائے
ملّت کے لئے موت ہے غیروں پہ بھروسہ
خود اپنے وسائل کو عناں گیر کیا جائے
لازم ہے کہ ہر فرد ہو ملّت کا سپاہی
لازم ہے کہ ہر شوق کو تصویر کیا جائے
اسوقت ضروری ہے کہ خونِ شہدا سے
اک باب نئے عزم کا تحریر کیا جائے
اس وقت ضروری ہے کہ خوابوں سے گزر کر
ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے

○

ایسانہ ہُوا تو پھرلب پہ دُعا ہو
(پانامہ لیکس کے تناظر میں)

یونس صابر
(پشاور)

سوچو بھی ذرا غور سے، ایسا نہ ہُوا تو
ہو جائے کا ایسا ہی جو ویسا نہ ہُوا تو

ہم خیال سے ہوتا ہے بہرحال گذارہ
پھر سوچو، مخالف کو گوارہ نہ ہُوا تو

غاصب کو بھلی لگتی ہے سونے کی ڈلی بھی
قبضے سے مگر پہلے ہی دیوانہ ہُوا تو

پانامہ کے ایجنٹ اس ایجاد پہ خوش ہیں
اُن کے سبب ایوانوں میں ہنگامہ ہُوا تو

تاریخ زمیں کہتی ہے مُنہ جھوٹ کا کالا
اور یہ بھی کہ سچ مثلِ فلک بالا ہُوا تو

دروازہ رحیمانہ کُھلا رہتا ہے اُس کا
ہے شرط فقط جذبہ فقیرانہ ہُوا تو

صابؔر جی، بھلا اُمہّ اُتھل پتھل لگے کیوں
ربّ سائیں کرے، مسئلہ حل ہوگا کبھی تو

○

دستِ وفا

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

مَن کی دنیا میں یوں چلے آئے
جیسے خوشبو فضا میں بَس جائے
تم نے آ کر جو ساز چھیڑا ہے
سازِ الفت کہیں نہ بن جائے

حسرتیں کیوں رہیں میرے دل میں
تم جو بادِ بہار بن آئے
میرے محبوب تیرے جانے سے
دل کی دُنیا نہ پھر اجڑ جائے

زندگی تیز تر رواں ہے یہاں
راہِ الفت میں کاش تھم جائے
تم محبت کی لاج رکھ لینا
یہ کہیں روگِ جاں نہ بن جائے

ہم بڑھاتے رہیں گے دستِ وفا
گر وفاؤں کو تم سمجھ پائے
وہ تصور جو ہم نے باندھا ہے
کاش اب اس میں جان پڑجائے

ہم تو ایفا کریں گے عہدِ وفا
گر قیامت ہی سر پہ بن آئے
جذبہ صادق ہو گر وفا میں ریاضؔ
سنگ مرمر بھی موم بن جائے

○

گوراقبرستان

فیصل عظیم
(کینیڈا)

یہ کیسی بستی ہے
جس میں حدِّ نگاہ تک بس مجسّمے ہیں۔۔۔
تنی ہوئی گردنیں ہیں کاندھوں پہ ایستادہ
جو دونوں ہاتھوں میں اپنی ہی اک خفیف مورت اُٹھائے
خود ہی زمانے بھر کو دکھا رہے ہیں
یہ کیسا جادو جگا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔
مجسّمے بڑھتے جا رہے ہیں

جہاں سے دیکھو
وہیں سے باقی تمام بُت
لگ رہے ہیں بونے
ڈھلکتا سورج، گواہ گویا ہر ایک کا ہے
جو بے بسی سے مچلتی کرنیں
سروں پہ، آنکھوں میں جھونکتا ہے
غروب ہوتا دیا جو سائے بڑھا رہا ہے
تو یہ بھی منظر دکھا رہا ہے
کہ شہرِ مرقد میں ڈھل رہی ہے تمام بستی

صلیب اُٹھائے
میں اپنے مرقد سے سر اُٹھا کر جو دیکھتا ہوں
تو دیکھتا ہوں!
سجی ہوئی ہیں قطار اندر قطار قبریں
مزار اندر مزار حدِ نگاہ تک ہیں
اُٹھے ہوئے ہاتھ، گردنیں تو
صلیب و گنبد میں ڈھل رہے ہیں
نئے نئے سائے تازہ قبروں سے بے خودی میں نکل رہے ہیں
اور اس دھوئیں کی کثافتوں میں
تمام منظر پگھل رہے ہیں

والدہ محترمہ کی یاد میں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

ہر دم ترا خیال ہے اور تیری گفتگو
یادوں کی ایک دھمال ہے اور تیری گفتگو

جو کچھ گزاری ساتھ ترے، تھی وہ زندگی
اب ذکرِ ماہ و سال ہے اور تیری گفتگو

بیتے دنوں کا عکس ہے اب بھی شریکِ حال!
اک عہد پُر ملال ہے اور تیری گفتگو!

جس میں ترے وجود کی تابانیاں رہیں!
وہ دورِ لازوال ہے اور تیری گفتگو

کیوں دور ہو گئی تری آوازِ دل نشیں
اب بھی یہی سوال ہے اور تیری گفتگو

تیرے چمن میں تیری مہک ہے ہر اک سمت
پھولوں کی دیکھ بھال ہے اور تیری گفتگو

کیوں کر حسین ہو نہ مری شامِ اضطراب
تُو ہے، ترا جمال ہے اور تیری گفتگو

○

ہمسفر کی یاد میں

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

اے میرے ہمسفر
تیرے بعد
یاد میں تیری
ہماری باہمی رفاقت کے برسوں
عیش ونشاط ومسرت کا پل پل
اور
تیری مفارقت میں جیا
غم واندوہ میں ڈوبا دلِ حزیں کے
اشکوں سے لبریز پل پل کا حساب
میرے مصوّر نے
اپنی نگارشات میں ایسے دلدوز نقوش
اُبھارے ہیں
میرے ہی لیے
تیری روح کی تسکین کی خاطر

اور اب
تمہارے شہر کی مشہورِ عالم آرٹ گیلری میں
اس کی نمائش کی ہے
تیری یاد میں
اپنی دنیا سے میرے دنیا میں آ،
دیکھ ذرا
میرا جذبۂ عقیدت، میرا عہدِ وفا
تیرے بعد
جو زندہ وتابندہ ہے
ہماری مشترکہ زندگی کے
روزِ اوّل کی طرح

اے میرے ہمسفر، تُو آج بھی
رواں ہے مجھ میں
رگوں میں لہو کی طرح
آ، دیکھ میرے نگارشات،
میں نے اُبھارے ہیں ایسے
دلدوز نقوش

❍

''میری کہانی''

(صنفِ رباعی میں)

مامون ایمن (نیویارک)

دُنیا کو سُناتا ہوں کہانی اپنی
اس میں ہے نہاں نقل مکانی اپنی
پتّا ہُوں کسی سبز شجر کا، میں نے
پردیس کو دے دی ہے جوانی اپنی

○

لمحات کے دریا میں بہا کرتا ہوں
خود ساختہ اِک زخم سہا کرتا ہُوں
لفظوں سے بھی آگے ہے کہانی میری
پردیس کو میں دیس کہا کرتا ہُوں

○

تقدیر کو آواز دِیا کرتا ہُوں
بے نام صدائیں بھی پیا کرتا ہُوں
مصروف ہُوں سانسوں کے تواتر کی طرح
دن، رات بھلا کیا میں کِیا کرتا ہُوں

○

شانوں پہ مِرے سَر ہے نجانے کب سے
ڈھونڈوں ہُوں میں جینے کے بہانے کب سے
سُنتا ہی نہیں رُک کے زمانہ اِک پَل
جاری ہیں مِرے لب پہ فسانے کب سے

○

خوابوں کا سہارا نہیں حاصل مجھ کو
تعبیر نہیں آس کی منزل مجھ کو
رستہ ہے مرا، وقت کا سُوکھا دریا
ساحل کو سراپا نہیں حاصل مجھ کو

○

دیوار کی تصویر ہے میری صُورت
پیکار سے دِل گیر ہے میری صُورت
سانسوں کے سلاسل ہیں مرے سینے میں
آزار کی زنجیر ہے میری صُورت

○

آنکھوں میں سوالات کی گہرائی ہے
ہونٹوں پہ جوابات کی پہنائی ہے
آئینہ کہا کرتا ہے مجھ کو، ہنس کر
سودائی ہے، سودائی ہے، سودائی ہے

○

اب دہر مری جاں پہ ہنسا کرتا ہے
بے کیف مِرے دل کو کہا کرتا ہے
محفل میں خموشی کا سراپا بن کر
تنہائی میں ہُو ہاؤ کِیا کرتا ہے

○

اب خواب بھی، تعبیر بھی ہیجانی ہے
ہر لمحہ تضادات سے حیرانی ہے
قسمت سے بندھا ہے کوئی جھونکا، گویا
ہر گام سرابوں ہی کا زندانی ہے

○

پردیس مِری ذات کا قصّہ ہے اب
یوں جیت کسی مات کا قصّہ ہے اب
منظر میں سجا رہتا ہے پس منظر بھی
احساس میں جذبات کا قصّہ ہے اب

○

گذرے ہوئے لمحات دکھاتی ہی نہیں
اب یاد کوئی دل میں سماتی ہی نہیں
تقدیر کی دیوار ہے جاں کے آگے
دھڑکن کوئی اب اس کو گراتی ہی نہیں

○

اے کاش، پلٹ آئے زمانہ اِک دن
مل جائے مجھے کھویا خزانہ اِک دن
پردیس مجھے دیس سے باہم کر دے
کر جائے مِرے دِل کو دوانہ اِک دن

○

دُوری کا ہر اِک لمحہ جہاں سے جائے
فُرقت بھی سدا دیر کا منظر لائے
بچھڑے نہ کوئی شخص وطن سے، ایمنؔ
پَت جھڑ بھی بہاروں ہی کا نغمہ گائے

موت اور زندگی

(مرحومہ بہن سعیدہ عندلیب کی یاد میں)

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

(۱)

وہ جبین جس پہ چمکتا تھا دمکتا ہوا چاند
سرد ہے شبنم میں بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح
جسم لکڑی کی طرح سخت ہوا جاتا ہے
ہاتھ ہیں خشک بیاباں کے بگولوں کی طرح

(۲)

آنکھ ہے بند، لب نغمہ فشاں ہیں خموش
موت کی برف جمی جاتی ہے رخساروں پر
مُردنی چہرہ پہ یوں چھائی ہوئی ہے جیسے
راکھ کا ڈھیر ہے بجھتے ہوئے انگاروں پر

(۳)

اب نہ دوڑے گا لہو اب نہ چلیں گی نبضیں
اب نہ مہکیں گے تیرے عارض کے گلاب
اب نہ تنیں گی بھنوئیں، اب نہ جھکیں گی پلکیں
اب نہ چھلکے گی نگاہوں سے جوانی کی شراب

(۴)

اب نہ پھیلے گی تیری زلفِ پریشان کی شمیم
عکس تیرا نظر آئے گا نہ آئینے میں کبھی
اب نہ چونکائیں گی قدموں کی صدائیں تجھ کو
کوئی طوفان اُٹھے گا نہ تیرے سینے میں کبھی

(۵)

چوڑیاں تیری کلائی کے لیے روئیں گی
کنگھیاں ترسیں گی اُلجھے ہوئے بالوں کے لیے
ہو گی سرمے کو تیرے دیدہ و مژگاں کی تلاش
غازہ رکھا ہی رہے گا تیرے گالوں کے لیے

(۶)

کوئلیں کوکیں گائیں گے پپیہے لیکن
آہ۔۔۔ تو پیار بھرے گیت سنے گی نہ کبھی
گھر کے آکاش پہ ساون کی گھٹا آئے گی
تو گھر اپنے جھولے میں نہ جھولے گی کبھی

(۷)

رات ڈھونڈے گی تجھے لے کے ستاروں کے چراغ
صبحیں بھٹکیں گی کہستانوں میں، بیابانوں میں
جا کے ہر سمت پکاریں گی ہوائیں تجھ کو
پھول دیکھیں گے تیری راہ گلستانوں میں

(۸)

ڈھونڈنے والے تجھے ڈھونڈ کے تھک جائیں گے
بزمِ فطرت کی کسی چیز میں نہ پائیں گے سراغ
صبر کر لیں گے تیری موت پہ رونے والے
جھلملا جاتے ہیں انسان کی یادوں کے چراغ

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور کھِلا دیتی ہے

●

ایک صدی کا قصّہ
نمی
دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

نام نواب بانو۔نواب اور بانو کا یہ جوڑ مہمل سا لگتا ہے البتہ اس نام کے پس پردہ جو کہانی ہے وہ خاصی دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ نواب بانو کے نانا برٹش حکومت سے نواب کا خطاب پانے کے شدید متمنی تھے۔زندگی بھر اُنہوں نے یہ خطاب پانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر برٹش حکومت نے اُنکی درخواست کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔جب سالہا سال کی دھوڑ دھوپ کے بعد اُنہیں کوئی کامیابی نہیں ملی تو وہ تھک ہار کے بیٹھ گئے مگر دل کی یہ خواہش مری نہیں جس کو اُنہوں نے اپنی زندگی کا منتہائے مقصود بنا لیا تھا۔رات دن ناکامی کا یہ درد دل میں کچوکے مارتا تھا۔تشنگی کا یہ عالم تھا کہ خوابوں میں اُنہیں لفظ نواب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔اپنے دل کی تسلی کے لئے اُنہیں ایک تدبیر سوجھی جس نے سب کو حیران کر دیا۔جب اُن کی بیٹی نے ایک بچے کو جنم دیا تو نانا جان نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس بچے کا نام نواب رکھ دیں۔نانی نے اُنہیں ٹوک کر کہا کہ ناتا نہیں ناتی ہوئی ہے تو نانا جان برہم ہو کے بولے۔جو بھی ہے اس کا نام نواب بانو رکھ دو۔مجھے اگر انگریزوں نے نواب کے خطاب سے نہیں نوازا تو کیا ہوا میں اپنے ناتے پوتے کو اس خطاب سے خود سرفراز کروں گا۔اسطرح آگرہ کے عبدل حکیم کے گھر میں پیدا ہونے والی بچی کا نام نواب بانو رکھا گیا۔نواب کا جنم 18 فروری 1933 فتح آباد (آگرہ) میں ہوا۔اُنکے والد ملٹری کنٹریکٹر تھے۔کاروبار میں گھاٹا ہونے کی وجہ سے وہ کلکتہ چلے آئے۔ یہاں بھی کوئی کامیابی نہیں ملی۔اُنکے پڑوس میں اے آر کاردار رہا کرتے تھے۔ایک دن اُنکی بیگم کاردار صاحب سے ملی اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اُنکے شوہر کو کسی کام پر لگا دیں۔کار دار صاحب نے کہا کہ فلم میں جتنے بھی کردار تھے وہ سب بٹ چکے ہیں۔ہاں ایک جج کا کردار بچا ہے۔وہ اُنہیں اسٹوڈیو بھیج دیں۔جب حکیم صاحب اسٹوڈیو پہنچے تو اُنکو جج کے کپڑے پہننے کے لئے دئے گئے۔بھاری بھرکم پوشاک اور اون کی ٹوپی پہن کر عبدل حکیم بے چینی محسوس کرنے لگے۔جب شاٹ لینے کے لئے سارے پنکھے بند کر دئے گئے تو وہ گرمی سے اندر ہی اندر جھلسنے لگے۔اُنہیں لگا جیسے اُنہیں تپتی ریت پر پھینک دیا گیا ہو۔وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپڑانے لگے۔جب گرمی اُن سے برداشت نہ ہوئی تو وہ باتھ روم جانے کا بہانہ بنا کر سیٹ سے اُٹھ کے چلے گئے اور سیدھے گھر آ کے دم لیا۔اُسنے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ فلموں میں کبھی کام نہیں کریں گے۔گھر کی مالی حالت ٹھیک نہ تھی۔روز پانی پینے کے لئے کنواں کھودنا پڑتا تھا۔جب کمائی کی کوئی سبیل بنتے نظر نہ آئی تو دو ایک روز کے بعد اُنکی بیگم نے ایک بار پھر کاردار صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اُنکی کچھ مدد کریں۔کاردار صاحب نے حکیم صاحب کی بیگم وحیدن سے کہا کہ اُنکی فلم میں ایک رول ہے جہاں ایک عورت تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فلم میں آتی ہے اور ایک دو لائینیں گا کر نکل جاتی ہے۔اسطرح وحیدن بیگم کی فلموں میں انٹری ہوئی۔وہ قبول صورت بھی تھی اور خوش گلو بھی۔اُن دنوں خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گلو ہونا فلموں میں کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔وحیدن بیگم کی گاڑی پٹری پر دوڑنے لگی۔اُسے کامیابی تب ملی جب رنجیت اسٹوڈیو کے مالک سیٹھ چندولال شاہ کو ایک ایسی اداکارہ کی تلاش تھی جو خوبصورت بھی ہو اور اچھا گا بھی لیتی ہو۔ایک دن اُنہوں نے وحیدن بیگم کو اے آر کاردار کی فلم میں دیکھا۔اُنہوں نے فوراً وحیدن بیگم کی تلاش میں اپنے لوگ دوڑائے۔وحیدن بیگم کو سیٹھ چندولال کے سامنے پیش کیا گیا۔چندولال شاہ نے اُسے اپنی فلم کے لئے سائن کیا۔تنخواہ چھ سو روپے مقرر ہوئی جو اُس زمانے میں ایک بڑی رقم مانی جاتی تھی۔یہاں سے اُنکا دلدر دور ہو گیا اور ایک خوشگوار زندگی کی شروعات ہوئی۔وحیدن بیگم نے کئی کامیاب فلموں میں کام کیا اور ساتھ ہی بہت سارے گانے بھی گائے۔

نواب تب گیارہ سال کی تھی جب اُسکی ماں وحیدن بیگم کا اچانک انتقال ہو گیا۔نمی کے والد عبدل حکیم کلکتہ چھوڑ کر میرٹھ میں جا کے بس گئے جب کہ نواب کو اُسکی نانی کے یہاں ابیٹ آباد بھیجا گیا۔جب ملک کا بٹوارا ہوا تو اُسکی نانی اُسے لیکر بمبئی آ گئی۔بمبئی میں اُنکے خالو اپنے زمانے کے مشہور گلوکار جی ایم درانی رہا کرتے تھے۔اُنکی بیگم جیوتی اپنے زمانے کی ایک مشہور اداکارہ تھی۔ایک دن جیوتی نے نانی کے بارے میں کچھ تلخ الفاظ استعمال کئے جو نانی کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئے اور اُسنے درانی کا گھر چھوڑا اور ایک جان پہچان کے موسیقار کے گھر میں ایک رات کے لئے پناہ لی اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اگلی صبح اُنہیں محبوب صاحب کے گھر تک پہونچا دیں۔محبوب خان کے ساتھ وحیدن بیگم کی وجہ سے اُنکے گہرے تعلقات تھے۔اگلے روز وہ محبوب سے ملنے اُنکے دفتر چلے گئے۔محبوب صاحب بڑے تپاک سے ملے۔باتوں باتوں میں اُنہوں نے ان سے پوچھا کہ اُنکا قیام کہاں ہے تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ کسی ہوٹل میں جا کے رک جائیں گے۔محبوب صاحب نے اُنہیں سمجھایا کہ اکیلی عورت ذات ساتھ میں ایک نوجواں لڑکی۔اُنکے لئے ہوٹل میں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔اُنہیں کوئی کمرہ کرایے پر لے کر رہنا چاہیے۔وہ کہتے ہیں نا کہ بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ مراد۔اوپر والے نے اُنکی سن لی۔محبوب صاحب کا ایک ملازم جو اُنکے دفتر میں کام کرتا تھا اُنہیں یاد دلانے لگا کہ اُنہوں نے شمشاد بیگم کے لئے جو کمرہ تیار کروایا تھا وہ تو خالی پڑا ہے۔کیوں نہ وہ کمرہ اُنہیں دیا جائے۔محبوب صاحب نے اپنے ملازم کی پیٹھ تھپتھپائی اور ان دونوں کو اُس کمرے میں روانہ کر دیا۔کمرہ ایک دم سجا ہوا تھا۔اصل میں محبوب صاحب نے گلوکارہ شمشاد بیگم کے لئے یہ کمرہ تیار کروایا تھا کیونکہ وہ ہوٹل میں جا کے رکتی تھی۔محبوب صاحب کو اُسکا ہوٹل میں رکنا اچھا نہیں لگتا تھا۔اُنہوں نے ایک دن شمشاد بیگم کو سمجھاتے ہوئے

کہا کہ اگر کسی دن ہڑتال ہوگئی تو کیا کروگی۔میرے پاس ایک کمرہ خالی پڑا ہے۔میں اسے ٹھیک ٹھاک کروادیتا ہوں۔جب تک چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔محبوب صاحب نے کمرے میں رنگ روغن کروایا۔فرنیچر بنوالیا۔پردے لگوالئے۔جب شمشاد بیگم نے کمرہ دیکھا تو اُسے کمرہ پسند نہیں آیا۔اصل میں اُسے ٹھاٹ سے رہنے کی عادت تھی اسلئے وہ اس کمرے میں نہیں رکی۔یہ تیار کمرہ نواب اور اُسکی نانی کو رہنے کے لئے مل گیا۔اُنہیں لگا جیسے وہ فائیو اسٹار ہوٹل میں آ گئے ہوں۔

ایک دن محبوب صاحب نے اُنہیں اپنی فلم ''انداز'' کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے سیٹ پر مدعو کیا۔سیٹ پر دلیپ کمار، راج کپور اور نرگس موجود تھے۔نواب ان تینوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگی۔اُس دن کی شوٹنگ دیکھنے کے بعد وہ اکثر محبوب صاحب کے سیٹ پر شوٹنگ دیکھنے پہونچ جایا کرتی تھی۔قسمت کا کھیل دیکھئے کہ ایک دن جب وہ سیٹ پر پہونچی تو جدن بائی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔اُس کی بغل میں ایک خالی کرسی پڑی تھی۔وہ ڈر کے مارے کرسی پر نہیں بیٹھی کہ کہیں جدن بائی کو برا نہ لگے۔جدن بائی کی نواب پر نظر پڑی تو وہ اُس سے بولی۔''اے لڑکی کھڑی کیوں ہو۔آو یہاں بیٹھ جاؤ۔'' وہ جب کرسی پر بیٹھ گئی تبھی راج کپور وہاں آ گئے اور جدن بائی کے پاوں چھوکر جب وہ جانے لگے تو اُنکی نظر اس شرمیلی سی لڑکی پر پڑی۔اُنہوں نے اُس سے پوچھا۔''اے لڑکی تمہارا نام کیا ہے؟'' اُسنے شرما کر کہا۔''نواب بانو''۔اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔راج کپور اُن دنوں اپنی دوسری فلم ''برسات'' کی کاسٹنگ میں لگے تھے۔نرگس کو سائن کیا گیا تھا۔پریم ناتھ کے مقابل جس طرح کی لڑکی اُنہیں چاہیے وہ اُنہیں اب تک مل نہیں پا رہی تھی۔گاؤں کی ایک بھولی بالی معصوم لڑکی۔اگلے روز کیا ہوا کہ ایک بڑی سی گاڑی نواب کو لینے آ گئی۔اُس سے کہا گیا کہ راج کپور نے اُنہیں آر۔کے۔اسٹوڈیو میں بلایا ہے۔

وہ جب اسٹوڈیو پہونچ گئی تو وہاں پر دو تین لڑکیوں کا میک اپ ہو رہا تھا۔اُسکا بھی میک اپ کیا گیا۔پہلے اُن کا اسکرین ٹیسٹ ہوا۔اُسکے بعد اُسکی باری آئی۔وہ بیحد گھبرائی ہوئی تھی۔جب اُسکے ہاتھ میں لمبے چوڑے مکالمے دئے گئے۔وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اس ٹیسٹ میں فیل ہوگئی تو پھر اُسکا کیا ہوگا۔اسکے بعد وہ کہاں جائے گی۔یہ غم اُسکے دل و دماغ پر اس قدر طاری تھا کہ جب وہ مکالمے بولنے لگی تو اُسکی آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل آئے۔ایک تو اُسنے صحیح تلفظ میں مکالمے ادا کئے کیونکہ وہ یوپی کی رہنے والی تھی اوپر سے رو رو کر اُسنے جسطرح مکالمے ادا کئے، اُسے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔جب اسکرین ٹیسٹ ختم ہوا تو وہ اپنی نانی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔تھوڑی دیر بعد اُسنے دیکھا کہ اسٹوڈیو میں مٹھائیاں بٹ رہی ہیں۔اُسنے ایک لڑکے سے روک کے پوچھا کہ یہ مٹھائیاں کس خوشی میں بانٹی جا رہی ہیں تو لڑکے نے حیران ہو کے اُس سے کہا۔ آپ کو نہیں معلوم۔آپکو فلم کے لئے چن لیا گیا ہے۔یہ خبر سن کر نواب کے ہاتھ پاؤں مارے خوشی سے پھول گئے۔

راج کپور کی پہلی فلم ''آگ'' میں ایک ہیروئن کا نام نمی تھا۔فلم شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے راج کپور نے نواب بانو کا نام بدل کر نمی رکھ دیا۔یہاں سے نواب بانو نمی کہلائے جانے لگی۔جب فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو نمی دبی دبی سی رہتی تھی۔ایک طرف نرگس اور دوسری طرف راج کپور، انکے بیچ وہ اپنے آپ کو کمتر محسوس کر رہی تھی۔راج کپور نے اس بات کو محسوس کیا۔ایک دن سب کے سامنے اُسنے نمی سے کہا کہ وہ اُس کی کلائی پر راکھی باندھے۔جب نمی نے اُسکی کلائی پر راکھی باندھی تو راج کپور نے اُسے آشیرواد دیتے ہوئے کہا کہ آج سے تم اس اسٹوڈیو کی مالکن ہو۔تمہیں جو چاہے جب چاہے مانگ سکتی ہو۔جسے رکھنا چاہتی ہو رکھ سکتی ہو، جسے نکالنا چاہتی ہو نکال سکتی ہو۔اس اسٹوڈیو پر تمہارا اُتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔راج کپور نے نمی کو نازک سے رشتے کی ڈور میں باندھ کر اُسمیں خود اعتمادی پیدا کی۔وہ کپور خاندان کا ایک جز بن کر رہ گئی۔ایک دن اُس نے شمی کپور سے کہا کہ وہ اُسے بھی راکھی باندھنا چاہتی ہے تو شمی کپور نے ہنس کر کہا کہ جب بڑے بھائی نے تمہیں اپنی بہن بنالیا تو اُس ناتے تو تم ہم سب کی بہن ہوئی نا۔اب تم راکھی باندھو یا نہ باندھو یہ رشتہ قائم و دائم رہے گا۔سچ تو یہ ہے کہ راج کپور اور شمی کپور کے نہ ہوتے ہوئے بھی یہ رشتہ قائم و دائم ہے۔

فلم ''برسات'' نے باکس آفس پر دھوم مچائی۔''برسات'' کے یہ گانے ''ہوا میں اُڑتا جائے، میرا لال ڈوپٹا ململ کا'' اور ''برسات میں ہم سے ملے تم سے ملے'' اور جیا بیقرار ہے'' نے ایسی دھوم مچادی کہ فضاؤں میں ہواؤں میں یہی گانے گونجنے لگے۔نمی نے اپنے کردار کو جسطرح اپنی فطری اداکاری سے حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا اُسے دیکھ کر فلم بین عش عش کر اُٹھے تھے۔''برسات'' کی کامیابی کے ساتھ ہی اُسکے پیچھے پرڈیوسروں کی بھیڑ لگ گئی۔ہر کوئی اُسے اپنی فلم میں سائن کرنا چاہتا تھا۔نمی نے تین فلمیں سائن کیں جو 1950 میں ریلیز ہوئیں۔یہ فلمیں تھیں ''وفا'' ''راج مکٹ'' اور ''جلتے دیپ''۔نمی کی اداکاری کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ٹاپ سے ٹاپ ہیرو اُسکے ساتھ کام کرنے کے لئے بے تاب تھے۔1951 میں اُسکی ایک نہیں بلکہ چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔دیو آنند کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''سزا'' نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ایس ڈی برمن کی سحر انگیز دھنوں میں سجے ہوئے اس فلم کے گانے ''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے'' بھلا کون بھول سکتا ہے اسی سال دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''دیدار'' ریلیز ہوئی جس نے ظفریابی کا پرچم پورے ملک میں لہرا دیا۔اس فلم میں اُسکے ساتھ اپنے زمانے کے دو مشہور اداکار اشوک کمار اور نرگس بھی شامل تھے۔اس فلم میں ہر اداکار نے اپنی اچھوتی اداکاری سے فلم بینوں کو مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔فلم ''بزدل'' اور ''بے دردی'' بھی اسی سال ریلیز ہوئیں۔بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ نمی ایک بہترین اداکارہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھی گلوکارہ بھی ہے۔فلم ''بے دردی'' میں اُسکے گانے اُسی کی آواز میں صدا بند ہوئے تھے۔

نمی کامیابی اور شہرت کی رفعتوں کو تیزی سی چھوتی جا رہی تھی۔1952 کا سال اُسکے لئے کامیابی اور کامرانیوں کا سال تھا۔اس سال بھی

اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں ۔سب سے پہلے دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی فلم ''داغ'' ریلیز ہوئی جسے بے پناہ کامیابی ملی۔ اُسمیں دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی اچھوتی اداکاری نے فلمی شائقین کا من موہ لیا تھا۔جہاں دلیپ کمار اور نمی کی اداکاری کا کوئی ثانی نہیں تھا وہیں پر اس فلم کی موسیقی نے بھی فلم کو چار چاند لگا دئے تھے۔اس فلم کے موسیقار شنکر اور جے کشن تھے۔اسی سال دیو آنند کے ساتھ اُسکی فلم ''آندھیاں'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر کامیاب رہی۔تیسری فلم ''اوشا کرن'' تھی اور چوتھی فلم محبوب خان کی ''آن'' تھی۔محبوب صاحب اصل میں نمی کو اپنے بینر کے تلے لانچ کرنا چاہتے تھے مگر راج کپور نے اُن سے وہ موقع چھین لیا۔ نمی کے ساتھ کام کرنے کی اُنکی یہ حسرت فلم ''آن'' کے ساتھ پوری ہوئی۔محبوب خان اس فلم کو ٹیکنی کلر میں بنانا چاہتے تھے جب کہ اُس وقت ملک میں اس طرح کی کوئی سہولیت دستیاب نہ تھی۔یار دوستوں اور بہی خواہوں نے محبوب صاحب کو سمجھایا کہ وہ اپنا ارادہ ترک کردیں کیونکہ وہ مشکل میں پھنس جائیں گے مگر محبوب صاحب ضدی آدمی تھے۔اُنہوں نے طے کرلیا تھا کہ وہ ''آن'' کو کلر میں بنائیں گے اسلئے وہ لنڈن جاکر سولہ ایم ایم کا کیمرہ خرید کر لے آئے ۔فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔''آن'' ٹیکنک کلر میں بننے والی ایک عظیم لاگت کی فلم تھی جسے محبوب خان نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ یہ فلم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ڈب ہو کے ریلیز ہوئی ۔جب اسے فرینچ زبان میں ڈب کیا گیا تو اسکا نام رکھا گیا۔ Mangala fille des Indes یعنی منگلا ہندوستان کی لڑکی۔اس فلم میں نمی نے گاؤں کی ایک شوخ و شریر لڑکی منگلا کا کردار ادا کیا تھا۔دوسری زبانوں میں جب فلم کو ڈب کیا گیا تو منگلا کے کردار کو خوب اُبھارا گیا۔پوسٹروں میں اُسی کے بڑے بڑے فوٹو دئے گئے ۔ جب یہ فلم لنڈن میں ریلیز ہوئی تو نمی کو ہالی وڈ کی طرف سے چار فلموں کی پیشکش ہوئی۔ان میں سے ہالی وڈ کے مشہور ہدایت کار Cecil Be Demille تھے۔ اُس نے نمی کے کردار کو بیحد سراہا تھا۔نمی نے چاروں فلموں کی پیش کش ٹھکرا دی۔وہ ہندی فلموں کو چھوڑ کر کسی اور زبان میں کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔''منگلا'' کروڑوں دلوں پر چھا گئی تھی۔اُسکی معصوم اور بے مثال اداکاری نے کروڑوں لوگوں کو اُسکا دیوانہ بنا دیا تھا۔اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔

1953 میں نمی کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ۔''ہمدرد''،''الف لیلا'' اور ''آبشار''۔یہ تینوں فلمیں ٹھیک ٹھاک رہیں ۔1954 میں چار فلمیں ریلیز ہوئیں ۔''پیاسے نین''،''کستوری''،''ڈنکا'' اور ''امر''۔فلم ''امر'' محبوب خان کی ہدایت میں بنی ایک ملٹی اسٹار فلم تھی جسمیں نمی کے ساتھ دلیپ کمار اور مدھو بالا نے بھی کام کیا تھا یہ فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔اصل میں محبوب خان نے جس طرح کا موضوع چنا تھا فلمی پنڈتوں کے حساب سے وہ دور اس فلم کے لئے درست نہیں تھا۔یہ فلم ایک انسان کی نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتی تھی جس کے ہاتھوں ایک معصوم لڑکی کی عزت لٹ جاتی ہے اور وہ اس گناہ کا پرایسچت کرنا چاہتا ہے۔اداکاری کے حساب سے اس کے اداکاروں کا کوئی ثانی نہیں تھا مگر محبوب خان کی بے مثال ہدایت کاری اور نوشاد کے دلفریب موسیقی کے باوجود فلم نہیں چلی جس کا محبوب خان کو ساری زندگی افسوس رہا۔

''امر'' کی فلم بندی کے دوراں یہ خبر فلمی حلقوں میں گشت کرتی رہی کہ دلیپ کمار اور نمی کا رومانس پروان چڑھ رہا ہے۔ان دنوں دلیپ کمار اور مدھو بالا ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے۔یہ خبر جب مدھو بالا تک پہونچی تو اُسے گہرا صدمہ لگا۔ایک دن ''امر'' کی شوٹنگ کے دوراں جب کھانے کا بریک ہوا تو سبھی آرٹسٹ کھانے کے ٹیبل پر جمع ہو گئے سوائے مدھو بالا کے۔نمی نے جب مدھو بالا کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے میک اپ روم میں بیٹھی ہے اور وہ اُسکے ساتھ لنچ کرنا نہیں چاہتی۔کسی نے نمی کی توجہ اُن خبروں کی طرف مبذول کرائی جو فلمی دنیا میں زور شور سے گشت کررہی تھیں۔نمی مدھو بالا کے کمرے میں گئی اور اُسکی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اُس سے کہا کہ یہ سچ ہے کہ میں دلیپ کمار کو پسند کرتی تھی لیکن جب مجھے معلوم پڑ گیا کہ وہ تمہارے عشق میں گرفتار ہے تو میں پیچھے ہٹ گئی۔خدا قسم ان خبروں میں کوئی سچائی نہیں ہے۔یہ ساری خبریں بے بنیاد اور جھوٹی ہیں۔دلیپ کمار تمہارا ہے تم ہی کو مبارک ہو۔آج سے دلیپ کمار سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہوگا۔مدھو بالا نمی کے اس جواب سے مطمئن ہو گئی اور اُسکے بعد دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا۔

1955 کا سال نمی کے لئے مسرتیں لے کر آیا۔اس سال اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ان میں سے دو فلمیں بیحد کامیاب رہیں۔پہلی فلم دلیپ کمار کے ساتھ ''اُڑن کھٹولا'' تھی جسے ایس یوسنی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔اس فلم کی کامیابی میں نوشاد کے سحر آگیں موسیقی کا کافی دخل تھا۔دوسری سہراب مودی کی فلم ''کندن'' تھی جسمیں اُس نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔وہ اس فلم میں ماں بھی بنی تھی اور بیٹی بھی۔بیٹی کے رول میں اُسکے مدمقابل سنیل دت تھا۔اس فلم میں اُسنے اداکاری کی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔اس فلم میں اُسکی اداکاری کو بیحد سراہا گیا تھا۔اسی سال نمی کی تین اور فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام ہیں ''سوسائٹی''،''چار پیسے'' اور ''بھاگوت مہما''۔

1956 میں نمی کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں ۔''بھائی بھائی''،''راج دہانی'' اور ''بسنت بہار''۔فلم ''راج دہانی'' میں ہیرو سنیل دت تھے۔فلم ''بھائی بھائی'' میں نمی کے مدمقابل اشوک کمار اور کشور کمار تھے جب کہ ''بسنت بہار'' میں ہیرو بھارت بھوشن تھے۔فلم ''بھائی بھائی'' اور ''بسنت بہار'' نے باکس آفس پر دھوم مچائی، جب کہ ''راج دہانی'' بھی ٹھیک ٹھاک گئی۔''بھائی بھائی'' اور ''بسنت بہار'' دل گداز اور روح پرور موسیقی کے لئے بھی یاد کی جاتی ہیں۔''بھائی بھائی'' کے موسیقار مدن موہن تھے جب کہ ''بسنت بہار'' کے سنگیت کار شنکر جے کشن تھے۔ان دونوں فلموں میں راگوں کا استعمال کیا گیا تھا۔

1956 کے بعد نمی کی چمک دمک ماند پڑنے لگی۔اُسکی ایک درجن کے قریب فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں کچھ کامیاب ہوئیں، کچھ ناکام۔بڑی ہٹ کوئی نہ تھی سوائے ''میرے محبوب''، جسمیں نمی نے بڑی بہن کا رول ادا کیا تھا۔نمی نے اپنے ایک

انٹرویو میں کہا کہ اصل میں وہ سادھنا کا رول میں کرنے والی تھی اور میرا رول بینا رائے کرنے والی تھی۔ جب ایچ ایس رویل ''میرے محبوب'' میں مجھے ہیروئن کے رول کے لئے سائن کرنے آگئے تو پوری کہانی سن کر میں نے ہیروئن کا رول کرنے کے بجائے بڑی بہن کا کردار ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے تب لگا کہ بڑی بہن کا رول ہیروئن کے رول سے زیادہ دم دار ہے۔ جب فلم بن کر تیار ہوگئی اور ہم نے اسکی ٹرائل دیکھی تو میں نے محسوس کیا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ مجھے اپنے فیصلے پر انتہائی افسوس تھا۔ سادھنا کا رول تو فلم کی جان تھی۔ ''بیجو باورا'' میں بھی اُسے کام کرنے کی پیشکش کی گئی تھی جو اُس نے ٹھکرا دی تھی۔ بعد میں مینا کماری کو وہ رول مل گیا اور ''بیجو باورا'' ایک زبردست ہٹ ثابت ہوئی۔

1960 کے بعد کئی ساری نوجوان ہیروئینیں فلم انڈسٹری میں داخل ہو چکی تھیں۔ جیسے آشا پاریکھ، سادھنا، نندہ، مالا سنہا اور سائرہ بانو۔ پرانی ہیروئینیں دھیرے دھیرے فلمی اُفق سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور نئی پود اُنکی جگہ لے رہی تھیں۔ نمی بھی اُن میں سے ایک تھی۔ حالانکہ ریٹائرمنٹ سے پہلے اُسکی ایک درجن کے قریب فلمیں ریلز ہوئیں۔ اُنکے نام ہیں ''انجلی''، ''چھوٹے بابو''، ''سوہنی مہیوال''، ''پہلی رات''، ''چار دل چار راہیں''، ''انگولی مال''، ''شمع''، ''میرے محبوب''، ''پوجا کے پھول''، ''دال میں کالا''، ''آکاش دیپ'' اور ''لواینڈ گاڑ''. وہ 1986 تک فلموں میں سرگرم رہیں۔ اس کے بعد اُسنے فلموں سے سنیاس لیا۔

اُنکے شوہر سید علی رضا اعلیٰ پایے کے رائٹر تھے۔ اُنہوں نے بے شمار ہٹ فلمیں لکھیں، ''انداز'' سے لے کے وہ ''امر'' تک محبوب خان سے جڑے رہے۔ ''آن'' اور ''مدر انڈیا'' کے رائٹر بھی وہی تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب محبوب خان فلم ''انداز'' بنا رہے تھے اور نمی اپنی نانی کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے آئی تھی۔ علی رضا اسٹوڈیو کے ایک کمرے میں بیٹھ کر سین لکھتے تھے۔ نمی کی پہلی ملاقات علی رضا سے ''انداز'' کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ وہ اُردو اچھی طرح پڑھنا لکھنا جانتی تھی۔ اُسنے جب علی رضا کو اُردو میں سین لکھتے دیکھا تو وہ اُن سے بولی کہ کیا میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں تو علی رضا ہنس کے بولے۔ ''بی بی کیوں میرے پیٹ پر لات مارنا چاہتی ہو۔ جا کے کوئی اور کام کرو نا''۔ نمی اُٹھ کے چلی آئی۔ چونکہ اُسکا محبوب اسٹوڈیو میں آنا جانا لگا رہتا تھا اور کبھی اتفاق سے علی رضا کے ساتھ علیک سلیک ہو جایا کرتی تھی۔ کون جانتا تھا کہ ایک دن یہ دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں گے۔ نمی شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی۔ دلیپ کمار اُسکی نظر میں تھا مگر وہاں مدھو بالا آڑے آگئی تھی۔ ایک دن نمی نے ہندی فلموں کے مزاحیہ اداکار مکری سے کہا کہ وہ اُسکے لئے کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈ لے۔ مکری نے ہنس کے کہا۔ لڑکا بغل میں۔ ڈھونڈرا شہر میں۔ نمی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں''۔ مکری بولے۔ ''ارے ادھر اُدھر کہاں بھٹک رہی ہو۔ لڑکا تو بغل میں کھڑا ہے۔ علی رضا کی بات کر رہا ہوں۔''

علی رضا بڑے ہی پروجیہہ نوجوان تھے۔ گورے چٹے، دراز قد کے علی رضا بہت ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بڑے بڑے عالم اُنکے ساتھ بیٹھنے میں گھبراتے تھے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بے شمار فلموں کو اپنے قلمی جوہر سے نکھار دیا۔ وہ مشہور قلم کار آغا جانی کشمیری کے سگے بھانجے تھے۔ نمی اور علی رضا کا ساتھ بتالیس سال کا رہا۔ ایک نومبر 2007 میں علی رضا کا انتقال ہو گیا۔ وہ لاولد رہے۔ آجکل نمی جوہو کے ایک اپارٹمنٹ میں اکیلی رہتی ہے۔ نمی نے کئی دہائیوں تک فلمی دنیا پر راج کیا۔ اُسکا کردار ہمیشہ بے داغ اور صاف و پاک رہا۔ بیچ میں یہ افواہ اُڑائی گئی کہ نوے کی ہیروئن کمی کاٹکر اُنکی بیٹی ہے۔ بعد میں یہ خبر جھوٹی نکلی۔ نمی نے شہرت کے بام پر پہونچ کر بھی اپنے آپ کو سنبھال کے رکھا اور اپنی طرف ایک بھی اُنگلی اُٹھنے نہ دی۔

...... چونبھے ......

''چونبھے'' اُردو تے سرائیکی دے منّے پرمنّے شاعر سئیں مہندر پرتاپ چاند دے سرائیکی کلام دا مجموعہ ہے۔ کروڑ لعل عیسن دے واسی ہوون دے ناطے اُنہیں دی مادری زبان سرائیکی ہے تے پاکستان بنن توں بعد اوہ ہجرت کرتے انبالہ شہر وچ ونج آباد تھئے۔ اُنہیں اُردو زبان وچ شاعری وی کیتی ہے تے تنقید وچ وی ناں پیدا کیتے۔ ایں طرح سرائیکی وچ اُنہیں اپنے تخلیقی اظہار کوں فنی تے فکری حوالے نال لفظیں دا روپ ڈِتے تے اپنے فکر تے خیال دے جوہر وی ڈکھائن۔ خوشی دی گالھ اے ہے جو ۶۹ سال گزرن توں باوجود اُنہیں سرائیکی زبان کوں اپنی میراث سمجھ تے اوندی حفاظت کیتی ہے۔

۲۰۱۰ء وچ سئیں مہندر پرتاپ جڈاں اپنے وطن کروڑ لعل عیسن وچ آئے ہَن تاں اُنہیں دے اعزاز وچ تقریباں وچ تھِیاں ہَن تے اُنہیں دے بارے وچ مضمون وی پڑھیئے تے لکھیئے گئے ہَن۔ ایں حوالے نال ڈاکٹر مزمل حسین تے ڈاکٹر گل عباس دے مقالے ایں کتاب وچ شامل ہِن۔ ایویں ہی تنویر شاہد محمد زئی اپنی معرکتہ آلاراء کتاب ''مٹی ہجرت لکھتی ہے'' وچ ''مہتابِ سخن مہندر پرتاپ چاند'' دے عنوان نال جیڑھا مضمون تحریر کیتے اوہ ضمیمے وچ ڈے ڈتا گئے تاں جو مہندر پرتاپ چاند دا مکمل تعارف وی تھی ونجے تے اے لکھتاں محفوظ وی تھی ونجن۔ سرائیکی ادبی بورڈ اپنے محدود تے نہ ہوون جتنے وسائل دے باوجود سرائیکی زبان نے ادب دے فروغ تے وَدھارے وچ اپنا کم کریندا پئے۔ سرائیکی نال محبت کرن آلیں دی خدمت وچ ایہا گزارش ہے جے کتاباں خرید کرتے اساڈے مالی بحران وچ مددگار بنن۔ اللہ تعالیٰ دا شکر ہے جو اساں سرائیکی کتاباں چھاپن دے سلسلے کوں رو کیا نئیں بلکہ سرائیکی زبان تے سرائیکی وسیب دی خدمت کریندے پئے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

قارئین محترم!

چہارسو نے مجھ پر گوشہ چھاپا ہے بھلا مجھ پر گوشہ چھاپ کر مجھے اس باوقار پلیٹ فارم پر متمکن کر کے کیا ملنا۔ نہ دوستوں میں دوست نہ تنظیم نہ انجمن نہ تعریف وستائش کی توفیق۔ تبھی تو اپنی سماعتوں پر دھوکہ ہوا۔ آپ پر چہارسو میں گوشہ چھاپا جائے گا کیونکہ آپ Deserve کرتی ہیں۔

بھلا یہ اس زمانے اس دور کی لاجک ہے

نہ روبرو ملاقات نہ پرانا تعلق۔۔۔سوائے اس کے کہ جب چہارسو ملتا تو فون پر رسید دے دیتی یہ سلسلہ بھی منقطع کیا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ میں یاد دہانی کروا رہی ہوں یونس جاوید صاحب کا گوشہ لگا تو تعریفی فون کیا جواب ملا آپ پر بھی لگے گا مطلوبہ چیزیں بھجوا دیں۔ ارے ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں۔

جواب ملا اس وقت خواتین میں آپ۔۔۔۔ خیر بسم اللہ! ایک نظریے پر روز اول سے یقین رہا ہے کہ کائنات میں قدرت کا ایک نظام عدل مسلسل برسرِ کار ہے۔ اُس نے میرے حق میں کہیں فیصلہ لکھ دیا۔ جو چیزیں طلب کی گئیں بھجوا دیں خوف روم روم میں کیونکہ چند حالیہ اشاعتوں پر نظر پڑی۔ بڑے بڑے نام بڑے بڑے کام۔ اس فیصلے کے بعد ایک روز آخری کوشش کی۔

دیکھئے سر! یہ سر تو میری گردن پر لگا رہنے دیجئے آپ مجھے بھائی کہہ سکتی ہیں۔ دیکھیں گلزار بھائی، میں سمجھتی ہوں کہ مجھ پر ابھی گوشہ نہیں لگنا چاہیے کیونکہ۔۔۔دلائل بے شمار تھے جواب ایک ہی تھا۔

ہم آپ سے نہ ملے ہیں نہ جانتے ہیں آپ کی تحریریں پڑھی ہیں وہی آپ کی سفارشی ہیں اور ہم صرف اسی سفارش کو مانتے ہیں۔ سو صاحبو! سیمنٹ اکھڑی رنگ اُڑی چٹخی دیواروں سے جھانکتی طاہرہ چہارسو کے پلیٹ فارم پر آبراجمان ہوئی تو خود ہی حیران رہ گئی۔ ارے یہ میرے سوانحی عکس کو کیسے پایا! آپ تو میرے گاؤں کبھی گئے ہی نہیں نہ کبھی اُن دیواروں کو دیکھا جن میں اک عمر گزری۔ شاید یہ اتفاق ہی ہے۔

کہا بہت شکریہ! جواب ملا اس قسم کے تکلفات تو ہمارے ہاں مروج نہیں ہیں۔ چہارسو تلاش میں رہتا ہے۔ چھپے ہوئے ہنر، میرٹ، اپنی سفارش آپ۔ صاحبو ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھی عورت۔ گھر بچے، تدریس یونیورسٹی پھر گھر۔ اُس عورت کو چہارسو کے سرورق پر لا بٹھانا۔ شکریہ گلزار جاوید صاحب۔

اگرچہ یہ لفظ آپ کو ناپسند ہے لیکن اب تو بنتا ہے کیونکہ آپ نے مجھے ایک بڑے سوال کا جواب دینے کے قابل کر دیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بچے میری کتابوں پر مقالہ لکھتے تو ایک سوال مجھ سے ضرور کرتے آپ کو کون کون سے ایوارڈ ملے ہیں؟ سو اب میرا جواب یہ ہوگا میرا ایوارڈ یہ ہے کہ مجھے سب سے بڑا ایوارڈ ملا چہارسو نے مجھے ایک سچے ایوارڈ سے نواز دیا ہے۔ چہارسو کا ایوارڈ وہ ایوارڈ ہے جسے تاریخ کبھی جھٹلا نہیں سکتی۔

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

گلزارِ محبت! بہارِ جاوید!! زندہ باد!!!! السلام علیکم۔

چہارسو کی مطالعاتی عشرتیں میسر آئیں۔ کیا بتاؤں اس کے اسلوبیاتی کرشموں اور اس کی بے ساختہ پیش کاریوں سے کس قدر مزہ آتا ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ ایک نشست میں سب کچھ دیکھ لوں۔ بعض تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں مکرر دیکھنے کی بے قراری ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال صاحبہ کے افسانے اور اس قبیل کے دیگر ''قصّے'' بہت پڑھے ہیں ''حتی المقدور'' ان سے لطف بھی لیا ہے۔ ان کے ''بے ساختگی'' خلوصِ مطالعہ کی روداد ہے۔ مینا کماری سے متعلق دیپک کنول کی تحریر پسند آئی۔ آپ جانیں مینا کماری کی فن کارانہ معصومیت از قبیلِ شاذ ہے۔ نہ دیکھی نہ سنی۔ گونا مساعد حالات نے اسے ''بے بس'' کر دیا تھا مگر اس کی شاعری ''از بس'' ہو گئی تھی۔ گلزار کے سے شاعر اور قلم کار نے اس کی خدمت کی اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ آپ نے دیکھا ہوگا مینا کماری کے بلمقابل دلیپ کمار نے ''سرتاپا'' مختلف سٹائل سے اداکاری کی ہے۔ فلم ''کوہِ نور'' میں مدھوبن میں رادھا کا ناچے گردھر کی مرلیا باجے رے کے سمے مینا کماری سامنے تو نہ تھی لیکن اس کا احساس محیط تھا۔ کرشن جی مہاراج کی بانسری کا تاثر اور راگ ہمیر کا رنگ۔ بھئی خوب۔ دیپ کنول نوتن کی بات بھی کریں۔ فلم ''ہم لوگ'' میں اس کی اداکاری لاجواب تھی۔ اس شعر کے ساتھ رخصت:

کوئی دیوانہ وار گلیوں میں
بانٹتا پھر رہا ہے دانائی

(کرامت بخاری)

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

طاہرہ اقبال پر قرطاس اعزاز کے میری طرح اور بھی لوگ منتظر رہے ہوں گے اس لیے ان کے بارے میں تفصیلات جان کر خوشی اور اطمینان ہوا۔ ایک عرصے سے اُن کے افسانے، سفرنامے اور دیگر مضامین اُن کے بارے میں کچھ جاننے کو اکسا رہے تھے میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن کے سفرنامے اُن کے افسانوں سے کہیں بہتر رہے۔ اس شمارے میں ''تاج محل'' مکرر شائع ہوا تو اُس

میں بھی میری دلچسپی بدستور قائم رہی۔ ناولٹ ''رئیس اعظم'' پر نوید سروش نے تبصرہ بہت محنت سے لکھا ہے پسند آیا۔ ''نگین گم گشتہ'' پر مرحوم ڈاکٹر انور سدید کا تبصرہ بھی میرے دل کی آواز بن کر نظر سے گزرا۔ اللہ کرے طاہرہ اقبال اسی طرح اپنے سفرناموں کی دنیا سجاتی رہیں کہ اُن کے بنگلہ دیش کی سیاحت ابھی تک میری نظر میں ہے۔

شہناز خانم عابدی کا تعزیتی مکالمہ بھی بہت خوب ہی نہیں خوب تر ہے۔ جوگندر پال کی موت پر یہ مکالمہ ایک تاریخ بن کر تاریخ میں محفوظ رہ جائے گا۔ دیپک کنول نے اس ماہ مینا کماری کی یادوں کو سمیٹا ہے۔ دلیپ کمار جیسے ٹریجڈی کنگ کے آگے وہ ٹریجڈی کوئین بن کر فلمی دنیا پر چھائی رہیں۔ کنول صاحب اس بار بھی اُن کے بارے میں وہ خاص بات بتانا بھول گئے جس کے سبب اُن کے مکالموں میں شاعری کا لطف آتا تھا کہ وہ شاعری بھی تھیں وہ مینا ناز کے نام سے مشہور تھیں اور اُن کا مجموعہ کلام شاید ''ادھورا چاند'' کے نام سے شمع کے ادارے نے چھاپا تھا۔

غالب عرفان (کراچی)

گلزار صاحب، السلام وعلیکم۔

منور رانا نمبر دیکھ کر از حد مسرت ہوئی۔ ہارڈ کاپی ملنے پر لکھنا چاہا لیکن کچھ مصروفیات آڑے آگئیں اور تاخیر ہوگئی۔ سب سے پہلے تو پس ورق ذہن و دل کو دیر تک تھامے رہا۔ سیاہی کے درمیاں فکر انگیز جگمگاتے ہوئے اشعار کا چراغ........

یہ ازل ہے کیا، یہ ابد ہے کیا، یہ زمیں ہے کیا، یہ زماں ہے کیا
اسی مخمصے کا شکار ہوں، یہ جہاں ہے کیا، وہ جہاں ہے کیا

اس ایک چراغ سے سوچ کے بے شمار چراغ روشن ہو گئے۔ سوالات کے ریشم الجھے رہتے رہیں۔ گرہیں کھلتیں ہی نہیں۔ ذہن و دل بھی اسی پس ورق کی طرح تاریک رہتا ہے اگر فکر کے دیے روشن نہ ہوں۔ کچھ تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جو خوابیدہ سوچ کے ساز کو چھیڑ دیا کرتی ہیں اور زندگی کو زندگی مل جاتی ہے۔ ورنہ دنیا کے جھمیلوں میں افکار منجمد ہو جاتے ہیں اور انسان ایک روبوٹ کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ بے حد خوبصورت اور معنی خیز پس ورق ہے۔ مبارک باد۔ منور رانا صاحب سے بھرپور ملاقات ہوگئی اس کے لیے بھی مبارک باد اور شکریہ۔ ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کے سارے پہلوؤں کو بہت خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے جس میں 'بہ راہ راست' کا کارنامہ ہے اور مضامین بھی معلوماتی ہیں۔ 'مسافر اُتر گیا' (منور رانا) نے دل چھو لیا۔ 'ماں جایا' (رینو بہل) نے آنکھیں نم کر دیں۔ 'تنقید کے حوالے سے کچھ حقائق' (حمیدہ معین رضوی) عمدہ تحریر ہے۔ میرے لئے جناب محترم یوگیندر بہل تشنہ صاحب کی شاہ کار نظم غم کدے سے نکل کر' سچائی سے بھرپور اور بے حد پراثر ہے۔ حقیقت سے قریب اس بہترین تخلیق کے لیے انھیں بہت مبارک باد، احترام، شکریہ اور ڈھیروں دعائیں کہ انہوں نے مجھے اتنے خلوص اور اعزاز سے نوازا۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے' کی پسندیدگی کے لیے میں محترم یوگیندر بہل تشنہ، نوید سروش، اور ایم انوار انجم صاحبان کی بہت ممنون ہوں۔ ڈاکٹر ریاض احمد کی بھی مشکور ہوں کہ میری نظم انھیں پسند آئی۔ ان لوگوں کے لیے میرا سلام اور دلی شکریہ۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں کہ اسی طرح ادب کی بے لوث خدمت کرتے رہیں۔

پروین شیر (نیویارک)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، سلام مسنون۔

شمارہ مئی جون ۲۰۱۶ء میں محترمہ طاہرہ اقبال کے بارے میں بہت سی تحریریں یکجا ملیں تو ان کے فنِ افسانہ نگاری کے بارے میں ایک واضح تصویر سامنے آئی۔ اس مرتبہ آپ کا ان سے ''براہِ راست'' انٹرویو بھی زیادہ دلچسپ تھا کہ یہ ایک مدیر کا افسانہ نگار سے انٹرویو نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کا دوسرے افسانہ نگار سے انٹرویو تھا۔ آپ نے بہت سے چبھتے ہوئے سوالوں کے ذریعے انہیں گھیرا تو سہی، مگر ان کے جوابات بھی اسی قدر قائل کرنے والے تھے، مثال کے طور پر انہیں منٹو کا نسوانی پیکر کہنا، افسانے یا تخلیق میں سیکس کا تناسب پوچھنا، ان کے افسانوں کی زبان کا مشکل اور پیچیدہ ہونا، وغیرہ۔ ویسے ذاتی طور پر مَیں نے بھی ان کی زبان کو مشکل اور پیچیدہ تو محسوس کیا ہے مگر اس کے ذریعے نہ صرف بہت سے پنجابی الفاظ کو اردو زبان کا حصہ بنا دیا گیا ہے بلکہ پڑھنے والے کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوتا ہے، پھر افسانے کے انجام تک پہنچنے سے قبل ہی قاری ان کے افسانے کی لذّتِ بیان کا لطف بھی اٹھا لیتا ہے اس لئے اگر کسی افسانے کا روایتی انجام نہ بھی ہو تو قاری کو مایوسی نہیں ہوتی۔

جناب تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کی دوسری قسط بھی پڑھی، اگرچہ واقعاتی تسلسل اور اندازِ بیان پہلی قسط ہی کی طرح دلچسپ ہے، مگر پہلی قسط نے جو ''تھرتھلی'' پیدا کر دی تھی اس مرتبہ نہیں ہوئی۔ شاید دوسری مرتبہ سانپ کو دیکھ کر اتنا ڈر نہیں لگا!

نسیم سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، السلام وعلیکم

چہارسو کی ہارڈ کاپی موصول ہوئی۔ شکریہ۔ اس مرتبہ 'قرطاسِ اعزاز' طاہرہ اقبال کے نام ہے۔ براہِ راست میں ان کی زندگی کی جھلکیوں کو دیکھا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وسائل نہ ہونے کے باوجود بھی انسان، سچی لگن، کوشش اور جنون سے وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے جو وہ چاہے۔ ان کی زندگی اس کی مثال ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس نے کبھی کالج کی شکل نہ دیکھی ہو اور پھر ایک دن وہ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے اور پھر کلاس میں ڈھیر سارے اسٹوڈنٹس کا سامنا کرتی ہے۔ ''روشن تو چراغ''۔

طاہرہ اقبال اچھا لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں پنجاب کی دیہی

زندگی کی عکاسی ہے، طبقاتی کشمکش ہے۔ وہ کرداروں کے اندروں سے نہ تو خود بے خبر ہوتی ہیں، نہ ہی قاری کو بے خبر رہنے دیتی ہیں۔ یوں بھی قاری کو اپنے افسانے کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتیں افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی تحریر میں ایک تا ثر ہے جو قاری کے دل کو چھو لیتا ہے۔

جوگندر پال جی کی رحلت، ان کی بیگم کرشنا جی اور میرے درمیان ہو نے والے مکالمے کو جگہ دے کر ان کی یاد کو آپ نے 'چہارسو' کر دیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

پرچے کے مشمولات پر بات کرنے سے احتراز کر رہی ہوں۔ پورا پرچہ ہی کامیاب اور قابلِ تحسین۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

میرے گلزار خوش رہو۔

تمہارے کمالات روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس بار تم نے پنجاب کی شیر جوان لڑکی کا تعارف جس طریقے سے کرایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ لڑکی صرف قلمکار ہی نہیں بلکہ ایسی دلیر جنگجو ہے جو نہ صرف دشمن کو للکارنا جانتی ہے بلکہ موقعہ ملنے پر اُس سے دو دو ہاتھ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ اسے کہتے ہیں تخلیق کار جو اپنے گردوپیش کو ہر قسم کی مصلحت، خوف اور ڈر کے بغیر من وعن پیش کر دے۔ جیتی رہو طاہرہ اقبال اور اسی طرح قلم کو تلوار بنا کر مردوں کے معاشرے میں مجاہدہ کا کردار نبھاتی رہو۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے انگریزی کہانی "اوور کوٹ" کا ترجمہ کچھ اس خوش روی سے کیا ہے کہ اب یہ کہانی اردو ادب کا حصہ بن گئی ہے۔ پروین شیر جنہیں پروین شیرنی کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے دنیا کے اُن علاقوں کی سیر کرا رہی ہیں جہاں پہنچنا صرف جان جوکھوں کا کام نہیں زندگی کو خطرے میں ڈالنے والی بات ہے۔ تابش خانزادہ نہ معلوم کس دنیا کی سیر کرا رہے ہیں کہ اُن کے ناول میں قاری کو سب کچھ ہوتا نظر آتا ہے جو نیا ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ انل ٹھکر صاحب کا افسانہ سادگی اور سچائی کے ساتھ دلچسپ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ آغا گل صاحب کو اُن کے افسانے پر ڈھیروں دعائیں اور مبارک باد۔ دیپک کنول نے مینا کماری کی کہانی کسی قدر اختصار سے لکھی ہے جس میں اُن کی کچھ مجبوریاں بھی ہوں گی مگر جس قدر بھی لکھی ہے اُسے اپنے دور کی عظیم ادا کارہ مینا کماری کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

شاعری میں اختر شاہجہاں پوری، قمر بھوپالی، آصف ثاقب، کرامت بخاری، عبداللہ جاوید، مہندر پرتاپ چاند، اشرف جاوید اور ڈاکٹر ریاض احمد خوب رنگ جمائے ہوئے ہیں میری طرف سے مبارک باد۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

مئی جون کا چہارسو موصول ہوا، ممنون ہوں۔ مندرجات میں قرطاسِ اعزاز طاہرہ اقبال کے نام کر کے آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے، طاہرہ Deserve بھی کرتی ہیں، میں ان کو ایک عرصہ سے مختلف ادبی رسائل میں پڑھ رہا ہوں، میں تو یہی یہی سمجھتا رہا کہ طاہرہ افسانے لکھتی ہیں لیکن "رنگ باتیں کریں" میں محمود الحسن نے میرے سمجھنے کو غلط ثابت کیا اور مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ طاہرہ ایک خاتون ہیں یا لکھنے کی مشین ! میری طرف سے طاہرہ کے لیے تحسین۔ مقالہ نگاروں نے طاہرہ اقبال کے فن پر مختلف جہات سے بھرپور مضامین لکھے۔ "براہِ راست" میں آپ کے تراشیدہ سوالات اور صاحبِ قرطاس کے جوابات انتہائی دلچسپ ہوتے ہیں۔ افسانوں میں آغا گل کا افسانہ "آخری حور" اچھا لگا۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے سیلی بینسن کی کہانی "اوور کوٹ" کا اُردو ترجمہ اسی انداز واسلوب میں کیا جو مغربی قلمکاروں کی شناخت ہے، یہ طرزِ تحریر بھی کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔

احسان بن مجید (اٹک)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

مئی، جون ۲۰۱۶ء کا شمارہ محترمہ طاہرہ اقبال کے قرطاسِ اعزاز کے ساتھ موصول ہوا۔ دراصل قرطاسِ اعزاز کی کامیابی ومقبولیت میں آپ کا براہِ راست کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بعدازاں بلاشبہ مختلف جہات کا جائزہ اور نقد ونظر پہ مشتمل مضامین، آرا، مکتوب وتاثرات اسے مزید مستحکم ومعتبر بناتے ہیں اور اس مشترکہ مساعی سے ظہور پذیر ہونے والا شمارہ چہارسو کی ادبی وتہذیبی تاریخ کا موقر حوالہ واضافہ بنتا ہے جو ترویج ادب اور ترسیل علم کے لیے لائق ستائش ہے۔

سرحد کے اس پار کی لڑکی ہو یا اُس پار کی میں سے قطع نظر یگانگت، اپنائیت اور مفاہمت کے آفاقی اساسات ونظریات، مثبت طرزِ عمل اور پیشرفت کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ ناشکری رئیل اسٹیٹ ایجنسی چلانے والوں کے لیے نایاب نسخوں اور تیر بہدف گروں سے مالا مال ہے۔ موضوع کا گہرا مطالعہ و کرداروں پہ مضبوط گرفت ومخصوص کاروباری ذہنیت اس پہ مستزاد ہیں۔ مجھے جواب دو کی کہانی معصوم مگر اپاہج بچی کے بے کسی وبیچارگی میں لپٹے سوالوں کے گرد گھومتی ہے جو بڑوں کو بھی لاجواب کر دیتے ہیں۔

اوور کوٹ کے حوالے سے اگر ٹرین کے مسافر کے اوور کوٹ اور گھر کھونٹی پہ لٹکے ہوئے کوٹ کو شخصِ واحد سے منسوب اس تناظر میں کر دیا جائے تو قاری کے لیے دونوں ہی کا چہرہ شناسا نہیں ہے تو تجسس وتحیر کے ساتھ کہانی کی معنی خیزیت دو چند ہو جاتی ہے۔ یوں اس عنوان سے غلام عباس صاحب کے شہرہ آفاق "اوور کوٹ" کا بھی خیال آتا رہا جو لکھا ہی اردو میں گیا تھا۔

ڈاکٹر خیال آفاقی کا کلام کبھی بھی کسی تعریف وتوصیف کا محتاج نہیں رہا۔ جناب محمود شام کی غزل کا مطلع اور بالخصوص آخری تین اشعار مختلف توجیہات سے مرکزِ توجہ رہے۔ غالب عرفان صاحب نے مختلف موضوعات کے ساتھ طویل ردیف خوب نبھائی۔ نسیم سحر صاحب کو اعزاز ملنے پہ مبارکباد۔ تعزیتی مکالمے سے

جوگندر پال جی کی رحلت کاعلم ہوا وہ نہایت مہان قلمکار وعظیم انسان تھے۔دنیائے ادب میں ایسی شخصیات کا خلاپُر ہونا نہایت مشکل ہوا کرتا ہے۔شہناز عابدی صاحبہ کے توسط سے اُن کی اہلیہ محترمہ تک اظہارِتعزیت پہنچے۔حسرتِ دل سے احمد فراز صاحب کا کلام سلسلے توڑ گیا یاد آ تا ہے۔''میری ماں'' ممتا بھرے خوبصورت جذبوں سے معمور ہے۔حنیف باوا صاحب نے ''ٹُٹ پینا منٹو'' میں اندازِ خاص سے خراج تحسین پیش کیا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی،السلام علیکم۔

آپ نے ڈاکٹر یونس جاوید اور منور رانا کے بعد ڈاکٹر طاہرہ اقبال کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے ایک اور ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔آپ ادبی صحافت میں ایسا گلزار بنا رہے ہیں جو ہمیشہ جاوداں رہے گا (انشاءاللہ)۔طاہرہ اقبال اس اعزاز کی حق بجانب تھیں اور ہیں۔طاہرہ اقبال کے افسانوں پر سینئر اور ہم عصر اہلِ علم وفن نے ادبی دیانت داری سے لکھا ہے افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناولٹ،سفرنامے،تحقیقی کام اور کالموں کو بھی ہر سطح پر سراہا گیا ہے ان پر لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی،منشایاد،ڈاکٹر سلیم اختر،ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر انیس ناگی،انوار احمد زئی،ڈاکٹر یونس جاوید،الطاف فاطمہ،پروین ملک،شاہد حمید، عطاء الحق قاسمی،محمد علی صدیقی،اسد محمد خان،تاج سعید،رشید امجد اور بہت سے اہل فن نے طاہرہ کے فکر وفن پر قلم اٹھایا ہے یقیناً آپ کو انتخاب کرنے میں بھی مشکل پیش آئی ہوگی۔''براہِ راست'' میں آپ کے اہم سوالات اور طاہرہ اقبال کے غیر جانب داری،ادبی بے باکی،اپنی ثقافت اور خاندانی پس منظر کے ساتھ جوابات نے بہت لطف دیا۔میں طاہرہ کے اس نظریے سے متفق ہوں:

''فکشن نگار کسی تاثر یا خیال کو کچھ واقعات میں ڈھالتا اور کچھ کرداروں پر اُسے وارد ہوتے ہوئے دکھاتا ہے یعنی افسانہ کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص انسانوں کے عمل اور ردِعمل میں وقوع پذیر ہوتا ہے یعنی وہ خاص عہد معاشرت،حالات و واقعات اور کرداروں پر کہانی کی تعمیر کرتا ہے اگر کہانی کی فضا پس منظر یا کردار اجنبی ہوں تو وہ اُن کے اندر اُترنے کی بجائے فاصلے پر کھڑا تماشائی رہ جائے گا۔''(ص۔۱۵)

طوالت کے سبب میں اس کی وضاحت میں نہیں جاؤں گا۔میں ۲۰۰۳ء میں فیصل آباد طاہرہ اقبال کی کتاب ''ریخت'' کی تقریب میں گیا تھا۔ تقریب کی صدارت منشایاد مرحوم نے کی تھی۔تقریب میں ڈاکٹر یونس جاوید نے طاہرہ اقبال پر بڑا زبردست تفصیلی مضمون پیش کیا تھا اُس تقریب کی تصویریں میرے پاس محفوظ ہیں ہر اعتبار سے یادگار تقریب تھی۔چہارسو کا سرورق آپ نے بڑا بامعنی تخلیق کیا ہے اینٹوں کی دیوار کے روزن سے طاہرہ اقبال کی جھانکتی روشن آنکھیں اور کھلتا ہوا چہرہ اُن کے خاندانی پس منظر (جہاں لڑکیوں کے لیے تعلیم ممنوع تھی) میں مستقل محنت اور جرأت مندی سے اپنے آپ کو منوانا اور وہ بھی فن کی دنیا میں ظاہر کر رہا ہے۔افسانوی ادب کے بعد ''پاکستانی اردو افسانہ (سیاسی و تاریخی تناظر میں) موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کر کے تحقیق کے میدان میں بھی اپنے آپ کو منوا لیا ہے۔اردو افسانے پر گہری نظر رکھنے والی نقادانِ ادب نے اس مقالے کو بہت سراہا ہے۔پچھلے سال اُن کی کتاب ''زمین رنگ'' کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نیشنل ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔میرا خیال ہے کہ ''چہارسُو'' میں یہ گوشہ مرتب ہونا اُن کے لیے سب سے بڑا اعزاز اور انعام ہے۔ڈاکٹر یونس جاوید نے دل کی بات کہی ہے۔

''اگر اکیسویں صدی کو کہانی کی تازگی منتقل کرنا مقصود ہے تو طاہرہ کے بغیر بات بنے گی نہیں۔''(ص۔۸۔ریخت)

پرچے میں موجود افسانہ ''زندہ انسانوں کا عجائب گھر'' وادیِ کیلاش کے رہنے والوں کا کرب ہے یہاں کے باشندوں کو جدید سائنسی سہولتوں سے صرف اس لیے محروم رکھا جا رہا ہے کہ وادی کا حسن ماند نہ پڑ جائے جب کہ وہاں کا با اثر طبقہ اور اہل اختیار جدید سائنسی سہولتوں سے زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ افسانے کو بین الاقوامی حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

سیلی بینسن کے افسانے ''اوورکوٹ'' کے ترجمے اور انتخاب کی ڈاکٹر فیروز عالم کو داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔یہ انسانی نازک احساسات اور رشتوں کے نبھانے کی خوب صورت کہانی ہے خصوصاً میاں بیوی کے انمول رشتہ۔ایک جگہ کتابت کی غلطی سے مسز بشپ کے بجائے مسز ملر درج ہو گیا ہے۔انل ٹھکّر کا افسانہ ''پسِ اشک'' ترقی کرتے خاندانوں کی کہانی ہے انہوں نے افسانے کے آخر میں تجزیاتی کیفیت بیان کر کے کہانی کو کمزور کر دیا انہیں قاری پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔شاہد رضوان کا افسانہ ''کم سن کلی'' ایک گھٹن زدہ اور کم ظرف امیروں کے گھر کی کہانی ہے۔جہاں دولت واختیارات کی آڑ میں مردوں کو سب کچھ جائز ہے جب کہ عورتوں کو ضروریات زندگی کی اشیاء بھی میسر نہیں۔ایسے گھروں کی لڑکیاں اور شادی شدہ خواتین بے راہ روی کا شکار ہو کر اپنے مردوں سے بدلہ لیتی ہیں۔اچھا افسانہ ہے۔آغا گل کا افسانہ ''آخری حور'' مضبوط کہانی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔محمود الحسن کی نعت (گو کہ وہ غزل کے حصے میں شامل ہے) میں فکری تہہ داری ہے۔نقشبند بھوپالی کی غزل میں گیت کی لفظیات ہے۔مظفر حنفی نے نازک احساسات کو نظم کیا ہے آصف ثاقب کی غزل سادگی و سلاست کی مثال ہے ڈاکٹر جواز جعفری کی غزل میں ایک عجیب سی سائنسی اور روحانی کیفیت ہے۔غالب عرفان کی غزل کی ردیف نے بہت مزا دیا۔محمود شام، کرامت بخاری،عارف شفیق،ظہیر اقبال زیدی،پرتپال سنگھ بیتاب اور ابراہیم عدیل کی غزلوں کے اشعار میں خیال کی تازگی ہے۔

نوید سروش (میرپورخاص)

گلزار جاوید بھائی،السلام علیکم۔

چہارسو مارچ اپریل ۲۰۱۶ء محترم انل ٹھکّر صاحب کی مہربانی سے ملا۔

چہارسو ہر بار کسی نہ کسی کا نمبر نکال کر اس سے مکمل تعارف کی راہ

ہموار کرتا ہے۔ براہِ راست آپ نے منور رانا سے اتنا کچھ کہلوا لیا ہے کہ باقی مضامین بھرتی کے لگتے ہیں۔اس بار منور رانا نثر و نظم کے ساتھ اس قدر چھائے ہوئے ہیں کہ کسی اور شاعر کا چہارسو گزر بھی نہ ہوسکا۔ بہت کم شاعروں کو شعر کہنا آتا ہے پھر بھی مشاعرے پڑھتے پھرتے ہیں مگر منور رانا قافیہ و ردیف کو اپنی فکر کی زنجیر ہونے نہیں دیتے بلکہ تسبیح بنا لیتے ہیں۔۔۔ میں نے منور رانا پر ایک دل چسپ مضمون لکھا تھا جو غالباً ''مژ گاں'' کے منور رانا نمبر کے لیے رکھ لیا گیا۔ظاہر ہے منور رانا کا معاملہ یوں ہے:

ہم ہوئے تم ہوئے میر ہوئے سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

چہارسو کا یہ بھرپور نمبر ان کی اکیس کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر رؤف خیر (حیدر آباد، دکن)

قابل احترام گلزار اجاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ چند دنوں میں ہی پڑھ لیا۔اس مرتبہ آپ نے قرطاسِ اعزاز محترمہ طاہرہ اقبال کے نام کیا ہے جو کہ اردو افسانے کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ان کی تخلیقات پسند آئیں۔''نیلی بار''، ''زندہ انسانوں کا عجائب گھر'' اچھی لگیں۔ان کی صاف گوئی قابل تعریف ہے۔''تاج محل۔۔۔ محبت کا کنول'' ان کی تخلیق پڑھ کر عش عش کر اُٹھا ان کا باریک بینی سے اتنا مشاہدہ۔۔۔!!ایک ایک بات پر توجہ دی ہے انہوں نے یہاں تک کہ تاج محل پر کندہ قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا ہے بلکہ اُس کا ترجمہ تک بتایا ہے۔ میں خود بھی تاج دیکھ چکا ہوں مگر اتنی جانکاری تو ہمیں بھی نہیں ملی تھی جتنی طاہرہ اقبال صاحبہ کے اس مضمون کے ذریعہ مل گئی ہے۔اس کے لیے انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ان کی افسانوی تخلیقات میں بھی گہرے مشاہدے پائے جاتے ہیں ہاں کہیں کہیں ان کی زبان کافی ثقیل ہے جو قاری کو گراں گزرتی ہے۔اس شمارے کے افسانے انل ٹھکّر کا ''پسِ اشک'' آغا گل کا ''آخری حور'' اقبال انصاری کا ''سرحد پار کی وہ لڑکی'' شاہد رضوان کا ''کم سن کلی'' اور محمد الیاس کا ''ناشکری'' پسند آئے۔آپ نے اس شمارے میں میرا افسانہ ''مجھے جواب دو'' بھی شامل کیا ہے اس کے لیے ممنون ہوں لیکن آپ نے میرا نام ایم انوار انجم کی بجائے صرف انوار انجم لکھ دیا ہے برائے مہربانی پورا نام لکھا کریں۔

شعری حصے میں مظفر حنفی، شگفتہ نازلی، محمود شام، مہندر پرتاپ چاند، نسیم سحر، پروفیسر خیال آفاقی، عرش صہبائی، پرتپال سنگھ بیتاب، پرویز مظفر، ابراہیم عدیل، یوگیندر بہل تشنہ اور ڈاکٹر افشاں شیخ کا کلام اچھا لگا۔ حنیف باوا کی تخلیق ''ٹُٹ پینا منٹو'' اور شہناز خانم عابدی کا تعزیتی مکالمہ پسند آئے۔ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا ترجمہ ''اوورکوٹ'' بہت خوب ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جناب تابش خانزادہ کا ''زہریلا انسان'' بہت پسند آیا نہایت باریک بینی سے لکھا ہوا ناول ہے۔ پروین شیر صاحبہ کا سفرنامہ ساؤتھ امریکہ بہت خوب رہا۔ دیپک کنول کا مینا کماری سے متعلق مضمون مکمل جانکاری کا خزانہ ہے۔ مجھے طالب علمی کے زمانہ سے ہی فلمی مضامین پڑھنے کا اشتیاق رہا ہے۔ مجھے دیپک صاحب کے مضامین بہت اچھے لگتے ہیں۔

اس سے پچھلے شمارے کا قرطاسِ اعزاز مشہور و معروف شاعر جناب منور رانا کے نام تھا۔منور رانا صاحب میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ماں کے حوالے سے ان کی شاعری بین الاقوامی شہرت یافتہ ہے۔منور رانا کے تعلق سے یہ نمبر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔اس شمارے کے افسانوں میں شموئل احمد کا افسانہ ''گھر واپسی''، سیمیں کرن کا ''کتے بلیوں کے پیچھے آتے ہیں'' حسن منظر کا ''ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ'' اچھے لگے۔ آپ کا افسانہ ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' کا بیانیہ اور افسانہ دونوں میں بہت خوب ہیں۔ فیروز عالم صاحب کا ''خوش باش شہزادہ'' پسند آیا۔ تابش خانزادہ کا ''زہریلا انسان'' بہت ہی دلچسپ ناول ہے خاص طور پر سانپوں کے تعلق سے لاجواب ہے۔ دیپک کنول کا مضمون ''سادھنا'' بہت خوبصورت ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل کا خاکہ ''ماں جایا'' بہت خوب ہے۔افسانوں سے ہٹ کر اُنہوں نے نئی چیز لکھی ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل سے میری واقفیت ۲۰۰۳ء میں ہوئی تھی۔ انہیں اور مجھے جالندھر کی ایک ادبی تقریب میں ''لالہ جگت نارائن ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔ میری پہلی ادبی تخلیق ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی تھی جبکہ انہوں نے ۱۹۹۶ء میں لکھنا شروع کیا۔لیکن وہ متواتر لکھتی رہیں جبکہ ۱۹۸۸ء سے میرا لکھنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور پھر سے ۲۰۰۳ء میں لکھنا شروع کیا۔ تبھی سے ڈاکٹر رینو بہل سے بذریعہ خط و کتابت و ٹیلیفون کے وسیلہ سے وابطہ بنا ہوا ہے۔ اس سال انہیں پنجاب سرکار کی جانب سے شرومنی ساہتکار اردو کے اعزاز سے نوازا گیا اور پانچ لاکھ کا انعام ملا۔ میں نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے ان کا انٹرویو لیا۔جس روز اُنہیں ایوارڈ عطا کیا گیا اس کے اگلے ہی روز پنجاب اردو اکادمی نے ان کے اعزاز میں ''ایک افسانوی نشست ڈاکٹر رینو بہل کے نام'' کا انعقاد ۱۳/مارچ ۲۰۱۶ء کو مالیر کوٹلہ میں کیا۔اس میں ڈاکٹر رینو بہل کے علاوہ مالیر کوٹلہ کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پڑھے۔اس موقع پر پنجاب اردو اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر رینو بہل کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ مجھے اس تقریب کی نظامت کا شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر رینو بہل کے تعلق سے اتنا ہی کہوں گا کہ وہ پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش کی واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنہیں شرفِ مقبولیت حاصل ہے اور مجھے نہایت خوشی ہے کہ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتی ہیں۔

ایم انوار انجم (مالیر کوٹلہ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا طاہرہ اقبال نمبر دیکھ کر خوشی ہوئی۔اُن کی ادبی خدمات جہاں جرأت محنت اور زبردست مشاہدہ کا مظہر ہیں وہاں وہ اُن خواتین کے لیے مشعلِ راہ بھی ہیں جو مشکل حالات کی وجہ سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دیتی ہیں۔ اُنہوں نے مڈل تک سکول میں تعلیم حاصل کر کے جب مجبوراً سکول کی روایتی تعلیم

ادھوری چھوڑی تو ہمت نہیں ہاری اور گھر میں رہتے ہوئے نہ صرف جاری رکھی بلکہ سینکڑوں افسانے اور دیگر مضامین بھی لکھتی رہیں اور پھر کالج کی شکل اُس دن دیکھی جب وہ ۱۹۸۷ء میں بطور لیکچرر کالج میں تعینات ہوئیں۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹریٹ کی اردو میں ڈگری حاصل کی۔ اسی شمارہ میں ''تاج محل۔۔۔محبت کا کنول'' اور ''زندہ انسانوں کا عجائب گھر'' ان کی باریک بینی اور دلچسپ مشاہدات کی مثالیں ہیں اور نامور ادبی شخصیتوں نے اُنہیں ادبی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اردگرد کے دیہی اور شہری ماحول میں غربت اور افلاس اور عورت کی محکومی پر اُنہوں نے بہت موثر انداز میں آواز اٹھائی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔ ''براہِ راست'' میں مشہور ادبی شخصیات کے ساتھ آپ کا مکالمہ بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔

میں اسی شمارے کے دلچسپ حصہ ''رس رابطے'' میں اپنے بارے میں ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، محترمہ رینو بہل اور آصف ثاقب صاحب کی طرف سے لکھے گئے اچھے اظہارِ خیال کے لیے ممنون ہوں۔ وہ خود بھی قابلِ قدر ادبی شخصیات ہیں اس لیے میرے کسی مضمون یا نظم پر اُن کی ستائش میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

شمارے میں آپ نے بہت اچھے افسانے شامل کیے ہیں۔ انل ٹھکّر کے افسانے ''پسِ اشک'' ہمارے معاشرے کا ایک افسوس ناک رخ ہے جہاں اقدار کی جگہ مادہ پرستی اور بے راہ روی نے لے لی ہے۔ افسانہ میں ''وقت'' کو ایک کردار کے طور پر بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''ناشکری'' (محمد الیاس) آغا گل صاحب کا ''آخری حور'' اور اقبال انصاری صاحب کا ''سرحد پار کی وہ لڑکی'' دلچسپ افسانے ہیں۔ شاہد رضوان صاحب کا افسانہ ''کم سن کلی'' ایک افسوسناک حقیقت ہے جو بعض اوقات گھریلو امور سے لاتعلق اونچے طبقے کے بدنصیب لوگوں کا مقدر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا ''اوورکوٹ'' خوبصورت اور حقیقی جذبات پر مبنی ایک کہانی ہے جس کا اختتام بڑے معصومانہ اور پیارے انداز میں ہوتا ہے۔ دوسرے ممالک سے دلچسپ کہانیوں کی تلاش، ترجمہ اور کامیاب پیشکش محنت طلب اور قابلِ تعریف ادبی خدمت ہے۔ نورین طلعت عروبہ کی حمد باری تعالیٰ اور سیفی سرونجی کی نعت کے علاوہ نسیم سحر، مہندر پرتاپ چاند، اشرف جاوید، آصف ثاقب، محمود شام، عبداللہ جاوید، شگفتہ نازلی (راستوں کو جگمگاتا ہے) فرخندہ شمیم (میری ماں) اور یوگیندر بہل تشنہ کا کلام (سُنیے) بہت خوب نظمیں ہیں۔ اس محنت طلب اور کامیاب ادبی خدمت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب

طاہرہ اقبال نمبر پڑھ کر بہت لطف آیا۔ انٹرویو سے لے کر ان کے بارے میں ادبا کی رائے اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی تحریریں خاصے کی چیز ہیں بالخصوص ''زندہ انسانوں کا عجائب گھر'' تکلیف دہ حد تک خوبصورت اور ہمہ جہت افسانہ ہے، ان کا آنے والا ناول یقیناً اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ اس شمارے میں ایک شعر کا ذکر ضرور کروں گا، زاہدہ عابد حنا کا شعر

ابھی تو گھر مہکتا ہے مری سانسوں کی خوشبو سے
ابھی آجاؤ ورنہ پھر مری تصویر دیکھو گے

نثر کا حصّہ جاندار ہے، نظمیں بھی اچھی لگیں خصوصاً عبداللہ جاوید، ڈاکٹر رضی محمد اور شہزاد نیّر صاحبان کی نظمیں۔ مگر ایک بات ہے، براہِ راست میں آپ کے سوالوں کا جواب نہیں ہوتا۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

مکرمی گلزار صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' ملا اور میں نے اس کا مطالعہ بھی کر لیا، تقریباً پچیس تیس سال پہلے لاہور میں ایک صاحب ہوتے تھے، جن کا تخلص تھا ''بلّے'' میں ایک بار لاہور آیا تو روزنامہ پاکستان کے سرفراز سید کے گھر ان سے ملاقات ہوئی تھی، شیر کہتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے، نجانے آپ انہیں جانتے ہیں یا نہیں۔ وہ مجھے اس لیے یاد آئے کہ آپ کے رسالے کی خوبی کے ضمن میں بلّے بلّے کہنا چاہتا تھا۔ میرا علم پنجابی زبان کا نہایت نامکمل ہے میں نہیں جانتا کہ رسالے کی توصیف کے ضمن میں یہ لفظ استعمال کرنا مفید ہوسکتا ہے کہ نہیں، لیکن میں نے نیک نیتی کے ساتھ لکھا ہے اس لیے مفید ہی ہوگا انشاءاللہ۔

آپ کے دو مضامین میرے کمپیوٹر پر اللہ تعالیٰ کی حفظ و اماں میں ہیں، ابھی میں نے ان کا مطالعہ شروع نہیں کیا ہے، لیکن عزم بالجزم ضرور ہے عنقریب نہایت مفصل مطالعہ کروں گا۔ اگر آپ یہ لکھ دیتے کہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے کیا کرنا ہے تو میں وہ بھی جلد یا بہ دیر کر گزرتا۔۔۔ سلمیٰ آغا ایک زمانے میں یکبارگی ہی مشہور ہوئی، اچھا گاتی تھی اس نے ایک غزل گائی تھی۔۔۔

جو ہم پہ گذرنی ہے اک بار گذر جائے
وہ کتنے ستمگر ہیں کھل جائیں تو اچھا ہے

اس وقت اس نے گیارھویں شادی کی تھی میرے پاس اس کے اس گانے کی کیسٹ ہے، لیکن امریکہ میں اب کیسٹ پلیئر ہی نہیں ملتے۔ میں ایسے ایک ریڈیو کی فکر میں ہوں جو ریڈیو بھی ہو اور کیسٹ پلیئر بھی۔ سنا ہے یورپ میں مل سکتا ہے میرا کچھ دن میں لندن یا پیرس جانا ہوگا انشاءاللہ لے لوں گا۔

''چہارسُو'' کے علاوہ پاکستان کے کسی اور رسالے سے میرا رابطہ نہیں ہے۔ یہ ضرور کہنا چاہیے آپ رسالے کے اوصاف کی طرف بہت توجہ دیتے ہیں۔ کوئی مضمون متبذل نہیں ہوتا، آپ کا انتخاب اچھا ہوتا ہے اور شاید لکھنے والے بھی اللہ لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے آپ کی شکل یاد نہیں۔ راولپنڈی میں جب میں رہتا تھا تو شاید آپ کو دیکھا ہو، اس وقت تو سب ہی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے۔ اب تو دیکھنا مشکل اور محبت کم یاب!

آپ کے مضامین پڑھنے میں تاخیر کی ایک اور وجہ بھی ہے۔رمضان۔۔۔رمضان المبارک۔۔۔یہ بتایئے عبادت کا مقصد کیا ہوتا ہے؟
اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل تو ایک مقصد ہے بے شک ہے لیکن اس تعمیل کے پس پشت جو مقاصد ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً۔۔۔اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، حشر کے دن کی رسوائی سے نجات، جنت کے حصول کی خواہش، میں آپ کو راز دارانہ بتادوں، میں صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے اور اس میں بے شمار حوریں میرے نام کر دے۔حوروں کا تو تصور ہی بڑا دلکش ہے۔

میں تو امریکہ میں رہ کر حور وغلماں کے ماحول میں ہی رہتا ہوں۔ انوار کی بارش ہوتی ہے، شادمانی کی ہوائیں چلتی ہیں، محبت کی خوشبو فضا کو معطر کیے رہتی ہے۔۔۔اور رمضان میں تو ساری دیدنی اور شنیدنی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس وقت تو میرے بھائی اپنی آخرت کی پڑی ہے۔توبہ تلّا کا سلسلہ دن رات جاری ہے۔یہی خیال ہے کہ جو کچھ اب تک کیا ہے وہ کسی قابل نہیں اور اب جو کیا جائے گا وہ نجانے کس قابل ہوگا!

آپ یقیناً کسی ایسے شخص کو جانتے ہونگے جو خود تو دینی مراتب پر فائز ہوگا لیکن دوسروں کو اس مرتبے پر پہنچانے میں مدد کر سکتا ہو۔مجھے کسی پیر فقیر، مرشد کامل کا نام بھی نہ بتایئے گا میں ان سب سے نہایت الرجک ہوں۔لفظ ''پیر'' سن کر ہی میری نظروں میں اس ''پیر'' کی تصویر آجاتی ہے جس کی ایک ویڈیو میں نے فیس بک پر کچھ دن قبل دیکھی جس میں اس کے معتقدین سامنے صف آراء ہیں اور فرداً فرداً اس کے پاس آ کر زمیں بوس ہوتے اور اس کو سجدہ کر کے اس کے پیروں کو چومتے تھے۔واقعی اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس ''پیر'' کی کھال کھنچوا دیتا جو خدا بن کے بیٹھا تھا۔

یہ میں کس جھنجھٹ میں پڑ گیا۔بات تو آپ کے مضمون کی تھی! دیکھیے۔۔۔خط لکھنا بھی اب بہت کم ہو گیا، پہلے تو خط ایک بہترین ذریعہ تعلقات اور وسیلہ تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا، تبھی تو غالب کے خطوط، یگانہ چنگیزی کے خطوط، صفیہ کے خطوط اختر کے نام وغیرہ کی ادبی وعلمی حیثیت ہوا کرتی تھی۔اب نہ وہ خط لکھنے والے رہے نہ خطوط کا رواج ہی رہ گیا۔کمپیوٹر اور ٹیلیفون کی سہولت نے علم وادب کا ایک دروازہ بند ہی کر دیا۔پہلے تو خط کیسے کیسے دلکش انداز، الفاظ، عبارات اور القاب وآداب سے مزین ہوتے تھے جیسے ایک خط میں لکھا تھا۔۔۔

مشفق لکھوں، شفیق لکھوں، مہرباں لکھوں
حیراں ہوں کہ آپ کو القاب کیا لکھوں

بیشک قافیہ تنگ ہو لیکن بات تو مکمل ہو جاتی تھی، پھر یہ کہ القاب وآداب کا بھی ایک انداز ہوا کرتا تھا۔لکھنے والے خط شروع ہی ایسے کرتے تھے کہ محبت اور خلوص کا لفظ اول سے ہی اندازہ ہو جائے جیسے معظم ومحترم، واجب الاحترام فلاں صاحب زاد لطفکم۔۔۔میرے والد صاحب قبلہ نے بھوپال کے وزیر اعظم سید منصب علی جن سے ہمارے خاندانی قریبی مراسم تھے ان کو ایک خط میں جو القاب لکھے وہ یوں تھے۔۔۔''میر دبیر، والا تدبیر، معلّٰی القاب، زعیم المملکت، جلالت الملک عمو محترم جناب سید منصب علی صاحب بہادر قبلہ، زاد اجلال وعظمت وکمال، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ''۔اس خط کے جواب میں منصب علی صاحب نے جو خط لکھا اس میں القاب یوں تھے۔۔۔''عزیز مکرم و محترم، بحر العلوم، مشعل ہدایت ونور، طبیب جسمانی وروحانی، عزیزی حکیم سید عبد العلی نقوی نقشبندی سلمہ اللہ تعالیٰ، دعائے فراواں۔۔۔''

بظاہر تو القاب وآداب محض لفاظی معلوم ہوتی تھی لیکن واقعہ یہ ہے ان سے محبت اور خلوص کے بکھراں جذبات کا اظہار ہوتا تھا اور یگانگت میں اضافہ۔ یہ سب القاب وآداب ایک تمدن کی عکاسی کرتے تھے جو تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی زوال پذیر ہوا اور چند سال میں ہی مغربیت کی نذر ہو گیا۔ غالب کے خطوط کا ایک مدت تک شہرہ رہا لیکن وہ ان کا اپنا طریقہ تھا جس کا تعلق کسی خاص تہذیب سے نہیں تھا۔وہ طریقہ کبھی رائج بھی نہیں ہوا۔کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔خط لکھنے کا طریقہ وہی روایتی رہا جو مقبول عام تھا اور میرے جیسے کچھ لوگ اب تک اس سے چمٹے ہوئے ہیں۔

میں نے کئی بار سوچا اگر مجنوں اپنی لیلیٰ کو خط لکھتا تو اس میں کیا القاب لکھتا۔۔۔کیا آپ نے کبھی ایسی کوئی بات سوچی؟ میرا خیال ہے اس کا آغاز کچھ یوں ہوتا:

''جان جہاں، آرام دل، عزیز از جاں، ماہتاب حسن وجمال، میری پیاری لیلیٰ، اپنے مجنوں کا سلام محبت قبول کرو۔۔۔''

یا ممکن ہے یوں ہوتا:

''اے آرام دل، اے تسکین جاں، اے بہار زندگی، اس دیوانے کا سلام لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں۔''

لیلیٰ کو خط لکھنے کی کیا ضرورت، لیکن فرض کیا جائے اس کو بھی لکھنا ہوتا تو وہ یوں لکھتی:

''میرے دلبر جانی، تسبیح محبت کے ہیرے، پیار'' یا لکھتی ''دل کا سکون، آنکھوں کا سرور، میرے سر کا تاج، میرے دل کا راج میرے مجنوں۔۔۔میرے ناقہ کو کسی شتر بے مہار نے اغوا کر لیا، اب میں تم سے ملنے کیسے آؤں۔۔۔!''

لیلیٰ مجنوں کی بات چلی تو خیال ہوا اس دور میں بھی مجنونیت کا مکتب موجود ہے۔ پاکستان میں تو اس مکتب میں تعطیل ہوتی ہی نہیں۔نجانے کتنی سوہنیاں اور ہیریں اپنے اپنے مہینوالوں اور رانجھاؤں کے چکر میں ہوں گی۔فرق اتنا ہے کہ اب نہ کسی کو دریا میں ڈوبنے کا شوق ہے نہ کچے گھڑے ہی دریا کے کنارے ہیر کے انتظار میں رکھے رہتے ہیں۔

حیرت تو یہ امریکہ جیسے ملک میں جہاں عشق حقیقی اور مجازی یعنی عقلی اور نقلی دونوں پر کوئی قید عائد نہیں یہاں بھی عجیب عجیب واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں جو افسانہ لکھ رہا ہوں وہ مکمل ہو جائے تو آپ کو ہی بھیجوں گا، سچا قصہ ہے جس کو میں نے جھوٹ جیسا بنا دیا ہے یعنی میٹھا بھی کھٹا بھی۔

افسانے جو لوگ بھی لکھتے ہیں وہ کوئی جھوٹ تھوڑی ہوتے ہیں سارے لفظ بہ لفظ سچے اور اصلی ہوتے ہیں۔ یہ تو لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ اس کو جھوٹ کے تکیہ غلاف میں رکھ دیتا ہے۔ آپ کے رسالے میں اس بار قرطاسِ اعزاز والی خاتون سے قطع نظر، شاہد رضوان کا ''کم سن کلی'' دلچسپ اور اچھا قصہ ہے۔

قلم کاروں کی تعریف و توصیف کا معاملہ تو آج کل یوں ہے جیسے ہوا ایک رخ کو چلے اور اس یک رخی ہوا کے ساتھ کچھ لوگ توازن کھو بیٹھیں اور اس ہوا کی تعریف کے پُل باندھنا شروع کر دیں نجانے ان تعریفوں سے موصوف کی تعریف مقصود ہوتی ہے یا اپنی ذاتی شہرت یا امتیاز مطلوب ہوتا ہے، اس بہانے کچھ چاپلوس بھی روشنی میں آ جاتے ہونگے۔

رسائل میں شائع ہونے والے وہ خطوط جو مدیر کے نام آتے ہیں میں ان کے بارے میں بھی ایک مبسوط مضمون لکھنے والا ہوں۔ مثلاً آپ کے جریدے میں چند خطوط کے تخاطبی جملے بہت اچھے لگے۔ یہ نمونے مشتے از خروارے والی بات ہے مفصل مضمون علیحدہ ہے۔ ایک خط میں نولیس صاحب نے آپ کو لکھا ''باغ تے فصل بہاراں پیارے گلزار جاوید'' میں پہلے جملے کا ربط دوسرے جملے سے دریافت نہیں کر سکا کیا آپ ''باغ تے فصل بہاراں پیارے'' ہیں؟ واہ واہ یہ ایک نئی ترکیب نظر آئی۔ ایک اور بزرگ نے لکھا ''برادرم گلزار جاوید صاحب مزاج گرامی قدر'' آپ کے ایک عزیز دوست نے تو فصاحت کا دریا بہا دیا ''محترم گلزار جاوید بھائی، رب کائنات کی تمام رحمتیں اور سلام!'' بولیے آپ کو اب اور کیا چاہیے انہوں نے رحمتوں کے بادل آپ پر برسا دیے۔۔۔ میں کئی سال ایک رسالہ ''روشنی'' علسا سے شائع کر کے ''نقصان مایہ'' کرتا رہا۔ مجھے تو کسی نے ''دور خزاں'' بھی نہیں لکھا ''بہار تو بہت دور'' اور ہر ماہ ڈھائی تین سو ڈالر بے سبب ضائع کرتے رہنے کے بعد میں نے امریکہ سے رسالہ شائع کرنے سے توبہ کر لی۔ میں اس موضوع پر مضمون مکمل کر لوں تو دیکھئے گا۔

بات خط کی ہو رہی تھی یہ سب خطوط ہی تو ہیں! کمپیوٹر کی روز افزوں ہر دلعزیزی نے خط و کتابت کے اکثر دروازے بند کر دیے۔ بہت تھوڑے ہی کھلے رہ گئے ہیں۔ اسی ایک ادھ کھلے دروازے سے میں تاک جھانک کرتا رہتا ہوں۔

اب پاکستان کا محکمہ ڈاک بھی تاریخ کا حصہ ہی بن جائے گا، ویسے بھی وہ کون سا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ میں نے ایک کتاب اپنے ایک معترف کو امریکہ سے ملتان بھیجی ڈیڑھ ماہ تک نہیں ملی۔ مکتوب الیہ نے پوسٹ مین کو پکڑا اور شاید دھمکایا ہوگا وہاں تو دھمکی سے ہی کام چلتا ہے۔ صاحب ایمان، مسلمان اور راست گو پوسٹ مین نے کتاب کا آنا کسی خوف کے تحت قبول کیا۔ دھمکی کے بغیر تو یہ ممکن ہی نہیں تھا اور مزید ڈیڑھ دن بعد مکتوب الیہ کو نیم صحیح اور پوری سالم پہنچا دی۔ یعنی کتاب ان کو مل ہی گئی۔ اب آپ ملاحظہ کیجیے گا یہ خط میں آپ کو بذریعہ ڈاک ہی ارسال کروں گا چونکہ اس میں کوئی رقم نقد نہیں اس لیے پوسٹ مین جو مسلمان اور ایماندار ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں عجلت کا قائل نہیں، اس کو آپ تک پہنچا دے گا۔ انشاءاللہ جلد یا بہ دیر۔ ایک دو بار میں نے یہ غلطی کی ہے خط میں دس بیس ڈالر کا نوٹ رکھ دیا۔ پوسٹ مین ہی کیا جو جاسوسی اہلیت سے عاری ہو۔ اس نے نجانے کیسے نوٹ کی جھلک دیکھ لی اور نہایت ہنرمندی کے ساتھ لفافہ کھول کر رقم نکال لی اور لفافہ بند کر کے منزل مقصود تک پہنچا دیا۔۔۔ کمال ہے کہ پہنچا دیا! اب تو خط کمپیوٹر پر ای میل کیا جا سکتا ہے پہلے تو کبوتر کے وسیلے سے خط بھیجے جاتے تھے تبھی تو کسی نے یہ شعر کہا:

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر

پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

یقیناً محبوبہ کا کوئی سپروائزر ہوگا جس نے قینچیاں لگوا دیں۔

افسوس یہ ہے میری بارہا کوشش کے باوجود نہ تو مجھے کوئی قابل ذکر عشق ہو سکا نہ کسی حسینہ قتالہ نے مجھ کو اس قابل سمجھا کہ محبت کی تحریک ہو سکتی۔ میرے ہاتھوں میں رائفلیں، بندوقیں، کمر میں لگے چھرے اور پستول دیکھنے کے بعد کسی کی عقل ماری گئی تھی جو مجھ سے عشق و محبت کا کھیل کرتا۔ کسی کو اپنی جان دینا تھی؟ امریکہ میں بھی میں نے ریوالور چھپا کر رکھنے کا لائسنس لے رکھا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے میں غیر مسلح ہوں لیکن ظاہر کے مت فریب میں آ جائیو ندیم۔۔۔ میرے پاس پوشیدہ پستول ضرور ہوتا ہے۔۔۔ ہوشیار! اس لیے مجھے محبت نامے لکھنے کا عملی تجربہ بھی نہیں ہو سکا، اگر ایسا کوئی تجربہ ہوتا تو میں بھی غالب کی طرح روز صبح کان پر قلم رکھ کر نکلتا کہ کوئی اپنے محبوب یا محبوبہ کو خط لکھوائے تو کم از کم دل کی بھڑاس تو نکل ہی جائے۔ میری جوانی کے دور میں لوگ لکھنے پڑھنے کے اہل ہو گئے اور خط نویسی کا پیشہ ہی ختم ہو گیا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میری جوانی کا دور گذر گیا واللہ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ دشمن کے کان بہرے۔۔۔

لاہور میں مال روڈ کے اختتام پر ایک زمانے میں کچہری ہوا کرتی تھی۔ نجانے اب بھی ہے یا نہیں۔ میں دو اسباب کی بنا پر کچہری کبھی کبھی جاتا تھا۔ اول تو بندوقوں کے لائسنسوں کے معاملے میں، دوم جس زمانے میں مصطفیٰ زیدی ڈپٹی کمشنر تھے، مصطفیٰ زیدی کے خاندان سے ہمارے مراسم رہ چکے تھے ایک دن میں کچہری گیا تو ایک طرف سے گزرتے ہوئے دیکھا زمین پر ایک پھٹی پرانی دری بچھائے ایک خستہ حال عمر رواں کے دواں مرحلے والے شخص بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے دری پر کاغذات اور مختلف قسم کے فارمز کے کئی ڈھیر تھے۔ ان کی داڑھی غیر ضروری حد تک بڑھی ہوئی، چہرے کی جھریاں بھی سکڑی ہوئی، جسم تو بہ ظاہر

انسانی ڈھانچہ ہی نظر آتا تھا۔ میں نے سلام کیا اور خیریت دریافت کی، انہوں نے جواب تو نہیں دیا میری طرف دیکھا اور بولے کوئی عرضی لکھوانا ہو، خط لکھوانا ہو یا فارم چاہیے ہو تو بتائیں۔۔۔

میں یہ قصہ مزید لکھنا نہیں چاہتا لیکن معلوم یہ ہوا ان کی روزانہ آمدنی دو تین روپیہ تھی۔ اسی سے ان کی ایک بیوی اور تین بچوں کی زندگی گزر رہی تھی۔ ایک لڑکا کسی موٹر مکینک کی دکان پر ''چھوٹے'' کا کام کرتا تھا جس سے کچھ آمدنی تھی۔ مجھے کسی عرضی کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں جب جاتا ان سے ایک عرضی ضرور لکھوالیتا اور ان کے آٹھ آنے کے مطالبے کو فوری پورا کرتا۔ ایک روپیہ ان کو دیتا اور قبل اس کے کہ وہ بقایا واپس کریں میں چل دیتا۔ وہ دو ایک آوازیں ضرور دیتے تھے۔ میں نے ان کا قصہ لکھا اور عنقریب کسی رسالے کو بھیجنے کا ارادہ کیے ہوں کیا معلوم آپ کو ہی ارسال کردوں۔

ایک زمانے میں راولپنڈی کے ایک دانشور مقبول الٰہی، سی ایس پی جو بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو کر ریٹائر ہوئے مجھ سے خط و کتابت کرتے تھے اور نہایت عالمانہ اور مشفقانہ قسم کے آٹھ دس صفحوں پر مشتمل خطوط لکھتے تھے جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں ایک کتاب ایسے خطوط کی شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس میں میرے نام آئے بعض احباب کے خطوط شامل ہوں گے۔ مقبول الٰہی کے خطوط میں سے بعض اس میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔

میری کتابیں دہلی سے شائع ہوتی ہیں آپ راولپنڈی یا لاہور میں میرے لیے کوئی ایسا پبلشر پیدا نہیں کرسکے جو میری کتابیں شائع کرے۔ ایک وہ کامیاب ناشر جن کا نام اور فون نمبر آپ نے ایک بار مجھے دیا، میں نے ان کو فون کیا بات ہوئی اور انہوں نے مجھ سے واقفیت اور کتاب شائع کرنے کے شرف کا اظہار کیا۔ اس کے بعد سے تا امروز ان کا پتہ نہیں۔ میرے دو ای میل کا جواب بھی نہیں دیا۔ آپ کو میرے پبلشر نے میری کئی تازہ شائع شدہ کتب ارسال کیں، جن کی آپ نے رسید مجھے لکھی تھی۔ نجانے ''جب موت ذبح کردی گئی'' بھی ملی کہ نہیں؟

میرا سارا خاندان پاکستان میں ہے لیکن کوئی خط نہیں لکھتا۔ سب فون پر ہی علیک سلیک کرلیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان لوگوں کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا ضرور آتا ہے سب پڑھے لکھے لوگ ہیں لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا فون جو موجود ہے۔ آپ ہی کے رسالے ''چہارسُو'' میں کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک مکتوب میں پڑھا تھا۔۔۔ مکتوب لکھنے والے نے آپ کو لکھا تھا'' آپ نے میرا افسانہ شائع کر دیا، بہت شکریہ، میرے پاس اس کی پسندیدگی کے ڈیڑھ سو خط آئے۔''

اللہ اللہ۔۔۔ وہ کون سے فرشتہ صفت، آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے خط لکھنے والے ہیں جو اتنے بہت سے خطوط لکھ دیتے ہیں۔ مجھے تو لکھتے ہوئے سالہا سال ہو گئے کسی کا ایک چند سطری خط بھی کبھی نہیں آیا۔ یہ جدا بات ہے میں کوئی خاص اچھا لکھنے والا بھی نہیں ہوں، لیکن میں کسی کو بتاتا تھوڑی ہوں اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میں کیسا لکھتا ہوں تو میں اپنے کو افلاطون ثابت کرنے کی پوری کوشش کرسکتا ہوں خواہ میں مچھلی مچھلی کتنا پانی آگے نہیں بڑھا۔

قتیل شفائی نہ صرف اچھے شاعر ہی تھے بلکہ بہت خوش اخلاق اور مہذب بھی۔ ایک بار غالباً ۱۹۸۸ء میں دبئی کے ایک عالمی مشاعرے میں اسٹیج پر میں ان سے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ قتیل نے مجھے دیکھا اور اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھے اور بہت محبت سے باتیں کرتے رہے۔ پھر واپس جا کر مجھے لاہور سے دو بار خط لکھے جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ خطوط کی کتاب میں شامل ہونگے انشاء اللہ۔ خط لکھنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور آج کل ہم سب اتنے مصروف ہیں کہ جنس وقت ہی ہمارے پاس نہیں بلکہ صبر کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ ہم سب بے صبرے ہیں نہ وقت ہے نہ صبر! کیا آپ نے صبر کا میٹھا پھل کبھی کھایا؟

ڈلس کے تین سال پہلے کے ایک مشاعرے میں مجھے بھی غلطی سے مدعو کرلیا گیا۔ میں جو گیا تو اتفاقاً کسی موقع پر میری شیروانی کا دامن ہٹ گیا اور اس کے نیچے لگا ہوا پستول نظر آ گیا۔ منتظم نے بھی دیکھا، اس کے بعد سے انہوں نے مجھے مشاعروں میں نہیں بلایا۔

اب یہ کہ اتنا لکھنے کے بعد اگر میں رسالے کے بعض مشمولات کا تذکرہ نہ کروں تو زیادتی ہوگی لہٰذا عرض یہ ہے ''طاہرہ اقبال کے ناول کا ایک باب، ناول کا ایک باب تو کم ہی معلوم ہوا البتہ ایک نہایت روٹھی ہوئی دل شکستہ خاتون کے منتشر خیالات کا مجموعہ ہے جس میں بیشتر باتیں غیر متعلق قسم کے تبصرے یا شکایتوں کی موجیں معلوم ہوتی ہیں۔''

اللہ اللہ۔۔۔ اس کی تعریف میں ہی بعض قلم والوں نے قصیدے لکھے ہیں۔۔۔ غزلیں؟ غزلیں تو اچھی ہی ہوتی ہیں صرف یہ کہ غالب کی غزل کی ردیف ''مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے'' یہ ردیف ہے؟ یا فصل خریف؟ آصف ثاقب کی غزل قابل ذکر اچھی ہے، واقعی اچھی ہے۔

میں نے اتنا طویل خط اس لیے لکھ دیا کہ آئندہ سال مزید خط نہ لکھنا پڑے۔ میں جانتا ہوں اب جو وقت آرہا ہے اس میں خط لکھنا متروک ہو جائے گا۔ لوگ اس کو تضیع اوقات سمجھنے لگیں گے۔ قصے کہانیوں میں تذکرہ ہوگا کہ ایک زمانے میں لوگ ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میری وفات حسرت آیات کے بعد خط لکھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ یہ فن میرے ساتھ ختم ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ نئی فصل کے جوان خط لکھنے کا خیال بھی نہیں کرسکتے۔ شاید علامہ اقبال نے کہا تھا:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول و ادم داستانے را

کیا آپ کو فارسی آتی ہے۔۔۔ ہائے۔۔۔ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ وقت آجائے جب ہم ایک دوسرے سے پوچھیں ''تمہیں اردو آتی ہے؟''

نقشبند قمر نقوی بخاری (امریکہ)

بحرِ ادب کے دوشناور

ڈاکٹر سکندر حیات سرگودھا کی مردم خیز دھرتی کے فرزند ہیں۔اس دھرتی نے وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، خورشید رضوی اور رفیع الدین ہاشمی جیسے مشاہیرِ ادب کو جنم دیا، جن کی شہرت پوری اُردو دنیا میں ہے۔انہوں نے نہ صرف ان مشاہیر کے تصنیفی کارناموں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کی قائم کردہ تحقیق و تنقید کی روایت کو جذب بھی کیا ہے اور اسے آگے بڑھانے کا عزم رکھتے ہیں۔اُردو میں ادبی تحقیق کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا عمدہ مقالہ تحریر کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہے بلکہ مسلسل تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھ رہے ہیں۔زیرِ نظر کتاب وزیر آغا اور انور سدید کی ادبی خدمات کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ان دونوں مشاہیر کی خدمات متنوع ہیں۔ڈاکٹر سکندر حیات نے ابتدا میں دونوں ادبا کے ادبی کوائف کا تعارف پیش کیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے انہوں نے شعر و نثر کی کس قدر متنوع اصناف کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔نیز نئے پڑھنے والوں کو ان مشاہیر کی خدمات کا مکمل تعارف ہو سکے۔آگے ان کی تنقید اور شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وزیر آغا نے پنجابی میں بھی شاعری کی۔ڈاکٹر سکندر نے اس پر بھی تفصیلی مضمون لکھا ہے۔اُمید ہے اہلِ نظر اس کتاب کو پذیرائی بخشیں گے اور ڈاکٹر سکندر حیات کی محنت، خلوص اور علم کی داد دیں گے۔ ......ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ

اشاعت:۲۰۱۶ء، قیمت:۵۰۰ روپے، دستیابی: مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔

...... زوالِ لازوال ......

پروفیسر علی نقی خان نے ''زوالِ لازوال'' میں مابعد جدید عہد کے انسان کے مسائل وجود کی انتہاؤں یعنی انفس و آفاق، اوّل و آخر، ظاہر و باطن، طریقت و شریعت، خوشی و غم، خالق و مخلوق، عروج و زوال، ازل و ابد، شعور لاشعور، نامکمل اکمل، ممکن و ناممکن، ردّ و قبول، بصارت و بصیرت، کم و بیش، طبیعات و مابعد الطبیعات، ہست و نیست، نفی و اثبات، ادنیٰ و اعلیٰ، تفہیم و تعبیر، تجرید و تجسیم، سوال و جواب، واجب و ناواجب، داخل و خارج، خودی و بے خودی، سود و زیاں، تحقیق و تشکیک، مروّج و منسوخ، پست و بلند، لفظ و معنی، حق و باطل، منطق و فلسفہ، خوب و زشت، خاصی و عاصی، حکمت و جہالت، مادی و غیر مادی، غلامی و آزادی، تضاد و تناقض، امن و فساد، فتح و شکست، حق و باطل، محبت و نفرت، لذت و اذیت کے مابین اٹکے انسان کی رودادِ قابلِ بیان کیا ہے۔زندگی جو ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، اُسی پر انسان کے ترددات کو زیرِ بحث لا کر گلوبل ولیج کے پیدا کردہ سماج میں اس کی اصل حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نفسِ موضوع کی طرح ہیئتِ تحریر بھی غیر مروجہ ہے۔کہانی کا سفر، دراصل سفرِ سراب ہے جو دل کشید اور پُر اثر پیرائے میں تحریر کیا گیا ہے۔ ......غلام شبیر اسد

قیمت:۲۰۰، دستیابی: مثال پبلشر، فیصل آباد۔

...... ہاتھ میں جلتا دیپ ......

جناب تصوّر اقبال کو میں نے زیادہ نہیں پڑھا اس کا سبب پیرانہ سالی اور نظر کی کمیابی کے سوا اور کچھ نہیں۔ویسے بھی آج کل جس رفتار، مقدار اور مزاج کی اردو شاعری ہو رہی ہے اُس میں آپ کا محتاط یا پسند کو ترجیح دینا لازمی ہو جاتا ہے۔سو میں جب تصوّر اقبال صاحب کی آمدہ کتاب ''ہاتھ میں جلتا دیپ'' کے حوالے سے یہ سطور لکھنے بیٹھا تو جناب تصوّر اقبال کی چیدہ چیدہ غزلیں غور سے پڑھنا اس لیے ضروری جانا کہ رائے دینے سے پہلے آپ کی رائے کا قائم ہونا ضروری ہے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ تصوّر اقبال کے کلام کے مطالعے کے بعد میں یہ بات اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نوجوان سخن ساز کے ہاں جستجو اور لگن کا جذبہ نہایت شد و مد سے کارفرما نظر آتا ہے۔جس کے بطن سے نئی تراکیب اور لفظیات کی کوشش بھی جا بجا کامگار ہوتی نظر آ رہی ہے۔میں اس دیہاتی نوجوان کو آنے والے دنوں میں بڑے شہروں کا بڑا نام بنتا دیکھ رہا ہوں۔ ......ڈاکٹر منیب الرحمٰن

اشاعت:۲۰۱۶ء، قیمت:۱۸۰ روپے، دستیابی: نوتھیں ملکاں، تحصیل پنڈی گھیب، اٹک۔